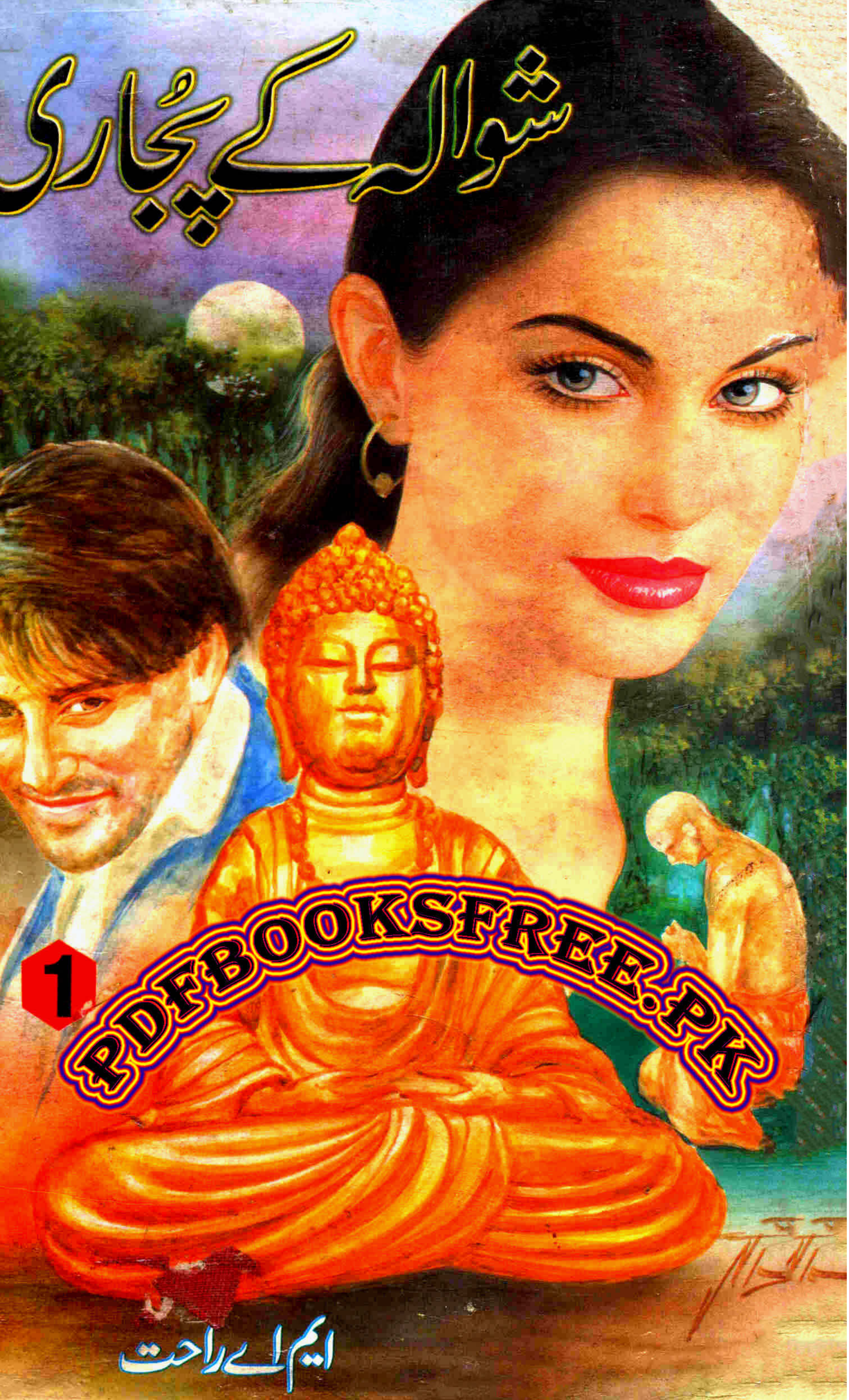


شوالہ کے پجاری
1
PDFBOOKSFREE.PK
ایم اے راحت

ہمدان جمشیدی کا تعلق ساگر سی۔پی کی ریاست سیتا گڑھی سے تھا۔ لیکن ان کی آبائی زمینیں ہماچل پردیش سے لے کر راس پورنی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ راجہ کرناشکی نے جب دیوالیہ ہو کر اپنے سارے اثاثے فروخت کرنے کا اعلان کیا تو ہمدان جمشیدی کے والد جمشید درانی نے خاموشی سے راجہ صاحب سے ملاقات کی اور کہا کہ وہ اپنی رسوائی کیوں کر رہے ہیں۔

"اس لئے کہ میں اب ہندوستان میں نہیں رہنا چاہتا۔ میں افریقہ جا رہا ہوں۔"

"آپ چاہیں تو اپنی ساکھ بحال کر سکتے ہیں۔ میں آپ کی مالی مدد کرنے کو تیار ہوں۔"

"دھن واد مہاراج! یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔"

"ٹھیک ہے، آپ جو کچھ فروخت کر رہے ہیں اس کا تخمینہ لگا لیں اور خاموشی سے سب کچھ ہمارے نام منتقل کر کے مجھ سے رقم لے لیں۔ ہم پرانے پڑوسی ہیں، میں آپ کے بارے میں افواہیں گشت کرتے نہیں دیکھنا چاہتا۔"

راجہ صاحب کی طلب کی ہوئی رقم ہاتھوں ہاتھ ادا کر دی گئی اور راجہ صاحب سب کچھ جمشیدی خاندان کو سونپ کر افریقہ چلے گئے۔ اس تفصیل سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جمشیدی خاندان کی دولت آسمان کو پہنچی ہوئی تھی۔ لیکن اتنا ہی بلند ان لوگوں کا ظرف تھا۔ بلند ظرفی اپنا مقام الگ رکھتی تھی لیکن راجوں، نوابوں اور رئیسوں کے شوق اپنی جگہ۔ چنانچہ میرے دادا جمشید درانی کی جوانی تو صیغہ راز میں ہی رہی لیکن میرے والد صاحب قبلہ المعروف ہمدان جمشیدی شوقین مزاج تھے۔ حسن ان کی کمزوری تھا۔ اور یہ بگڑی ہوئی شخصیت کی دین نہیں تھی بلکہ ان کی فطرت تھی۔ البتہ حسین خواتین سے متاثر ہونا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ عیاش طبع کہہ کر خاندان کو بدنام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کو زینت حرم بناتے رہے۔ پانچ بیویاں اکٹھی ہو گئیں۔ چھٹی شادی دادی حضور کی پسند تھی۔ دادی

حضور کے ماموں زاد بھائی لبنان میں مقیم تھے جہاں ان کی دوستی ابراہیم سلقی سے ہوگئی۔ دادی حضور ماموں حضور سے ملنے گئیں تو ابراہیم سلقی کی بیٹی ضوبیہ انہیں بھا گئیں۔ لے دے کر ہمدان جمشیدی ہی تھے جن سے اس شوق کی تکمیل کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ مرد میدان کو میدان میں لایا گیا اور خاتون ضوبیہ کا نکاح ہمدان جمشیدی سے کر دیا گیا۔ چھٹی بیگم نے ہمدان جمشیدی کو چت کر دیا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ خاتون ضوبیہ یعنی میری والدہ محترمہ ایک زبردست اور نامور شکاری یعنی ابراہیم سلقی کی بیٹی تھیں اور خود بھی شکار کی دیوانی تھیں۔ باپ نے بیٹی کو بہترین شکاری بنا دیا تھا۔ خود ہمدان جمشیدی کی زندگی کا ایک ہی شوق تھا یعنی شکار۔ آبادی میں ہوتے تو حسین بیویاں شکار کرتے، جنگل میں ہوتے تو خطرناک جانور۔ نئی بیگم کے بارے میں یہ تو معلوم تھا کہ ایک نامور شکاری کی صاحبزادی ہیں لیکن ایک بار مدھیہ پردیش کے جنگل کرتالیہ میں تیندوے کے شکار میں بیگم کی مہارت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ خاتون ضوبیہ نے اس مہارت سے تیندوے کو شکار کیا کہ تندوے کو بھی یقین نہ آئے کہ میں مر گیا ہوں۔

بس اس دن سے خاتون ضوبیہ، بیوی کی بجائے دوست بن گئیں اور یوں لگا جیسے ہمدان جمشیدی صاحب دوستی کے خول میں بند ہو گئے ہوں اور باہر نکلنے کا کوئی دروازہ نہ رہا ہو۔ ہندوستان بہت بڑی شکار گاہ ہے، طرح طرح کے جنگلوں میں شکار کھیلے جاتے تھے۔ ہمدان جمشیدی ان تمام علاقوں میں والدہ صاحبہ کو شکار کھلا چکے تھے۔ دونوں میاں بیوی کو اولاد سے کوئی رغبت نہیں تھی لیکن خدا کی دین کو کون ٹال سکتا ہے۔ والدہ صاحبہ امید سے ہو گئیں۔ دادی حضور کو علم ہوا تو خوشی سے دیوانی ہو گئیں۔ اصولوں اور نصیحتوں کا رجسٹر بنا دیا گیا۔ والد صاحب نے تنہائی میں والدہ صاحبہ کی خبر لی۔

"یہ کیا سن رہا ہوں میں ضوبیہ؟"

"تو میں کیا کروں؟" والدہ صاحبہ شرما کر بولیں۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟"

"پتہ نہیں......" والدہ صاحبہ ہنس کر بولیں۔

والد صاحب خوب بگڑے۔ کئی شکار تنہا کھیلے۔ مگر اب بیوی کے بغیر شکار کھیلنے کا مزا نہیں آتا تھا۔ انہیں جنگلوں سے عشق تھا۔ والدہ صاحبہ خود شدید بور ہو رہی تھیں۔ ابتدائی کچھ ماہ تو دادی حضور کے زیر ہدایت گزارنے ہی پڑے۔ پھر انہوں نے دبی زبان میں

کہا۔

"اماں، اب ضوبیہ کو شکار پر لے جا سکتا ہوں؟"

"تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہمدان؟"

"ہونے والا ہوں۔ آپ جانتی ہیں ضوبیہ کے بغیر اب شکار بیکار ہو گیا ہے۔"

"بچے ہوش کے ناخن لے۔ اس کا ساتواں مہینہ چل رہا ہے۔"

"چلنے دو اماں...... میں اسے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"نقصان اٹھائے گا بیٹا۔"

"نفع نقصان زندگی کے ساتھ ہے۔"

"دیکھ، میری بات مان لے، دو ڈھائی مہینے کی ہی تو بات ہے۔"

"جس طرح وہ یہاں رہے گی، اسی طرح میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اسے کسی مشقت میں نہیں ڈالوں گا۔"

"تیری مرضی ہے بیٹا، واپس کب تک آ جائے گا؟" ان کی والدہ اور میری دادی حضور نے مجبور ہو کر کہا۔

"آپ کے حساب سے ایک ماہ پہلے۔"

"جا، اللہ کے سپرد......!"

اور شکاری جوڑا چل پڑا۔ لبنانی نژاد اور شکاری باپ کی بیٹی خاتون ضوبیہ جنگلوں میں داخل ہوئیں تو بے لگام ہو گئیں۔ پہلے ہی ہلے میں ایک آدم خور شیر مار گرایا۔ اس شیر کی کہانی بھی عجیب تھی۔ مدھیہ پردیش کے بہت سے دیہاتوں کا راستہ گھنے جنگلوں سے گزرتا ہے۔ یہاں ڈاک کی ترسیل کا کوئی خصوصی نظام آج تک نہیں ہے۔ سرکاری ڈاکیے بے چارے کئی کئی ہفتوں کی ڈاک اکٹھی کر کے سائیکل پر انہی جنگلوں سے گزر کر دیہاتوں میں جاتے اور ڈاک تقسیم کرتے ہیں۔ انکے پاس صرف ایک لاٹھی ہوتی ہے جس کے سرے پر گھنٹی بندھی ہوتی ہے۔ وہ جنگل سے گزرتے وقت اسے بجاتے ہوئے گزرتے ہیں۔ ایک مرتبہ کوئی شکاری کسی جانور کو مارنے کی فکر میں جنگل کے اندر ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ گھنے درختوں کی وجہ سے اس جگہ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ جب ایک چوپایہ وہاں پانی پینے آیا تو اس نے اپنی بندوق سے گولی چلا دی۔ لیکن جب زخمی ہو کر جانور دہاڑا تو شکاری کی جان نکل گئی۔ یہ ایک ہیبت

ناک شیر تھا۔

شکاری تو بچ گیا کیونکہ وہ تالاب کے دوسرے کنارے پر تھا۔ لیکن زخمی شیر بھاگ کر پگڈنڈی پر پہنچ گیا جہاں سے ایک بدقسمت ڈاکیا گھنٹی بجاتا گزر رہا تھا۔ شیر نے اسے چیتھڑے چیتھڑے کر دیا۔ اس کے بعد شیر کو اس گھنٹی کی آواز سے ایسی چڑ ہوئی کہ گھنٹی کی آواز سنتے ہی وہ باہر نکل آتا اور ڈاکیے کو ہلاک کر دیتا۔ یہ داستان ہمدان جمشیدی نے بھی سنی اور دونوں میاں بیوی مچل گئے۔ یہ تجویز ضوبیہ ہمدان کی ہی تھی کہ ہمدان جمشیدی ڈاکیہ بن جائے اور گھنٹی بجاتا ہوا سائیکل پر گزرے اور جیسے ہی شیر حملہ آور ہو، ضوبیہ اسے نشانہ بنا لے۔ ان کے قدیم ملازم اور شکار کے خصوصی ساتھی جناب خان نے ان کی تجویز سنی تو بولا۔

"صاحب! زندگی کھیلنے کے لئے نہیں، گزارنے کے لئے ہوتی ہیں۔ درندوں سے کھیلنا عقلمندی نہیں ہوتی۔ میں آپ کو یہ کھیل نہیں کھیلنے دوں گا۔"

"یار جناب خان! تمہیں لکھنا پڑھنا آتا ہے؟" ہمدان نے پوچھا۔

"آتا ہے صاحب!"

"تو مجھے لکھ کر دے دو کہ میں کب تک زندہ رہوں گا۔ اس میں کمی بیشی ہوئی تو تمہیں مار دوں گا۔"

"ہم نہیں سمجھے صاحب؟"

"زندگی ایک بار ملتی ہے، دوسری بار جاتی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔"

"بیگم صاحب! آپ سمجھدار ہو، آپ سوچو، شیر کو اپنا زخم ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ دوسری جانب یہ کہ انسان کا گوشت کھانے کے بعد وہ انسان ہی کی طرح چالاک اور خونخوار ہو جاتا ہے۔ آپ ایسے خطرناک جانور سے مت کھیلو بیگم صاحب!"

"ضوبیہ، یہ جناب خان تمہیں خونخوار کہہ رہا ہے۔" ہمدان جمشیدی نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔ جناب خان کی بات کا کوئی برا نہیں مانتا تھا کیونکہ وہ ایک بہادر اور جانثار انسان تھا اور ہر شکار میں ان کا ساتھی ہوتا تھا۔ اکثر وہ ان کی شاندار جیپ ڈرائیو کرتا تھا۔

"تم فکر نہ کرو جناب خان! ہم ہوشیار رہیں گے۔" ضوبیہ بیگم کسی بھی طرح والد صاحب سے کم سرپھری نہیں تھیں۔

"آپ ایسا کرو بیگم صاحب! ہم سائیکل پر گھنٹی بجاتے نکلیں گے، آپ دونوں لوگ

بندوق چلاؤ گے۔" جناب خان کی یہ بات بھی نہیں مانی گئی تھی اور دونوں نے وہی کیا جو نہیں کرنا تھا۔ ہمدان جمشیدی سائیکل پر گھنٹی بجاتے ہوئے نکلے اور شیر نے فوراً ان پر حملہ کیا۔ ضوبیہ خاتون نے کامیابی سے اس پر گولی چلائی لیکن شیر حد سے زیادہ طاقتور تھا۔ دو گولیاں کھا کر وہ بھاگا تو اس کا رخ خاتون ضوبیہ کی طرف ہو گیا جو زمین پر ہی تھیں اور جھاڑیوں میں چھپی بیٹھی تھیں۔ جان بچانے کے لئے ضوبیہ کو بہت بھاگ دوڑ کرنی پڑی تب کہیں ہمدان نے شیر پر اور گولیاں چلا کر اسے مار گرایا۔

لیکن اس شدید بھاگ دوڑ نے خاتون ضوبیہ کو نقصان پہنچایا اور وہ تکلیف میں مبتلا ہو گئیں۔ کیفیت خراب سے خراب تر ہو گئی اور ہمدان جمشیدی بمشکل تمام انہیں ان کھنڈرات تک لے جانے میں کامیاب ہو سکے جو سات سو سال پرانے تھے اور جن کی تاریخ یشودھاونسی سے ملتی تھی۔ اس حساب سے یہ کھنڈرات بھی یشودھاونسی کہلاتے تھے۔ بہترین طرزِ تعمیر کا نمونہ تھے۔ باہر سے بہت بوسیدہ اور خستہ لیکن اندر سے بہت سے کمرے ایسے تھے جو بالکل مضبوط اور پختہ تھے۔ یشودھاونسی کے ان کھنڈرات میں میری ولادت ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ شدید زلزلے کی ایک لہر نے یشودھاونسی کی کچھ اور دیواریں گرائیں اور دھماکے اور گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہی میری آواز میرے ماں باپ نے سنی۔

ہمدان جمشیدی ہر مشکل دور سے گزرے تھے لیکن یہ افتاد اجنبی تھی۔ ضوبیہ خاتون غیر معمولی خاتون تھیں اس لئے یہ مشکل سہہ گئیں۔ لیکن حالات قدرے بہتر ہوتے ہی ہمدان صاحب نے جناب خان سے کہا۔

"جناب خان! یار تم گاڑی لے کر شہر چلے جاؤ اور ڈاکٹر للت رائے کو میرا یہ خط پہنچا دو۔ وہ سارے انتظامات کر دیں گے۔"

"بڑی بیگم جان کے پاس نہ جاؤں صاحب؟"

"ابھی نہیں یار، شامت آ جائے گی۔ بعد میں دیکھیں گے۔" والد صاحب نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے صاحب!" جناب خان جانے کے لئے تیار ہوا تو والد صاحب نے کہا۔

"اور سنو۔"

"جی صاحب......" جناب خان بولا۔

"جو کچھ کہا ہے، وہی کرنا ہے۔ اپنی وفاداریوں کا اظہار کرنے کے لئے یا ان حالات

میں برا بھلا سننے سے بچنے کے لئے اگر تم بیگم صاحب تک جا پہنچے تو میری تمہاری دوستی خ
ہو جائے گی۔"

جناب خان نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولا۔

"اس سے بڑی دھمکی اور کوئی نہیں ہوتی جناب! وعدہ کرتے ہیں، آپ نے جو کچھ ک
ہے وہی کریں گے۔"

جناب خان گاڑی لے کر چلا گیا۔ والد صاحب اپنی معلومات کے مطابق جو کچھ ک سکتے تھے انہوں نے کیا۔ جناب خان بھی بڑی برق رفتاری سے گیا تھا۔ حالانکہ فاصلے بہت زیادہ تھے لیکن جس قدر جلد ممکن ہو سکا وہ ایک لیڈی ڈاکٹر اور نرس کو لے کر آ گیا۔ والد صاحب کے دوست نے ان دونوں خواتین کا بندوبست کیا تھا۔ بہرحال لیڈی ڈاکٹ کے آنے کے بعد والد صاحب مطمئن ہو گئے۔

کھنڈر کے ایک صاف ستھرے گوشے میں جو غالباً کوئی بارہ دری تھا، صاف ستھری زمین پر آرام سے لیٹے اور سو گئے۔ اب انہیں کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔ بہرحال ڈاکٹ صاحب نے یہ اطلاع بڑی حویلی پہنچائی اور ہمدان صاحب کی والدہ یہ سن کر آگ بگولا ہو گئیں۔ پھر انہوں نے فوراً سفر شروع کر دیا اور آخر کار لیشو دھاونسی پہنچ گئیں۔ کئی ملازموں کو ساتھ لائی تھیں اور دوسرا سامان بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہاں انہوں نے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کو اتنی سنائیں کہ دونوں کی طبیعت صاف ہو گئی۔ والد صاحب نے عاجزی سے کہا۔

"لیکن اماں جی! مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سسرا وقت سے اتنا پہلے اس دنیا میں نازل ہو جائے گا۔ آپ یقین کریں، زلزلہ ہے پورا زلزلہ۔ میں تو اسے زلزلے کی اولاد ہی کہتا ہوں۔"

"تو اسے جو بھی کہے یہ تیری مرضی ہے۔ لیکن تو نے مجھ سے میری خوشیاں چھین لیں۔ منع کیا تھا میں نے کہ بہو کو اس عالم میں شکار پر مت لے جانا۔"

"چھوڑیں اماں جی! بلاوجہ دو ڈھائی مہینے انتظار اور کرنا پڑتا۔ اچھا بچہ ہے، ہمیں انتظار کی زحمت سے بچا لیا۔"

"مگر کتنا کمزور ہے، یہ تو دیکھ۔"

"اماں! ابھی لیڈی ڈاکٹر نے ضوبیہ کو سفر کی اجازت نہیں دی۔ یہ جگہ بے شک ویران

ہے لیکن ڈاکٹر للت نے جو انتظام کر دیا ہے وہ کافی ہے اگر آپ اجازت دیں تو۔"

"ہاں ہاں، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تیرا جب دل چاہے حویلی آ جانا۔ میں جا رہی ہوں۔" بیگم صاحبہ بہت ناراض تھیں۔ ہمدان جمشیدی کے کہنے پر بھی وہ نہ رکیں اور واپس چلی گئیں۔ بہرحال اس وقت والد صاحب کو ذرا بھی صورتحال کی پرواہ نہیں تھی۔ لیشو دھاونسی کے اطراف اس قدر حسین تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ موسم بھی اپنے جوبن پر تھا۔ ان کھنڈرات میں میٹرنٹی ہوم کا سماں کئی دن تک رہا۔ اس دوران لیڈی ڈاکٹر پورے اطمینان کا اظہار کرتی رہی۔ پکنک کا سا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ اور یہ کام خود لیڈی ڈاکٹر اور خوبصورت نرس کو بڑا پسند آیا تھا، دونوں یہاں خوش تھیں۔ کام کے ساتھ ساتھ سیر و سیاحت بھی ہو رہی تھی۔

میری پیدائش کے غالباً ساتویں دن کی بات ہے، ڈاکٹر نے اماں کو چلنے پھرنے کی اجازت دے دی تھی۔ چنانچہ ضوبیہ بیگم ٹہلتی ہوئی اس علاقے میں پہنچیں جہاں والد صاحب نے اپنی قیام گاہ بنائی ہوئی تھی تو انہوں نے دیکھا کہ والد صاحب نرس کے ساتھ اس ماحول کی تنہائی دور کرنے میں مصروف ہیں۔ نرس اور والد صاحب نے ضوبیہ بیگم کو دیکھ لیا تھا۔ والد صاحب پر تو خیر کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا اور والدہ صاحبہ بھی اس صورتحال سے اچھی طرح واقف تھیں لیکن نرس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ والدہ صاحبہ کچھ لمحے وہاں کھڑی رہیں اور پھر اس کے بعد وہاں سے چلی گئیں۔ نرس کی حالت بے پناہ خراب ہو گئی تھی۔ لیکن والد صاحب خاصے مطمئن تھے۔ والدہ صاحبہ نے بھی طے کر لیا تھا کہ اس حادثے کو اسکینڈل نہیں بننے دیں گی۔ لیکن انہوں نے اسی دن وہاں سے واپسی کا فیصلہ کر لیا اور حویلی واپس آ گئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ والدہ صاحبہ نے لیشو دھاونسی والے معاملے میں کبھی زبان تک نہیں ہلائی لیکن ہمدان جمشیدی کی وضع داری دیکھئے کہ اس واقعے کے کچھ ماہ بعد انہوں نے نرس سے باقاعدہ نکاح کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ میری ساتویں ماں تھیں۔ لیکن ان ساری ماؤں میں سے کوئی بھی ماں حویلی تک پہنچنے کا درجہ نہیں حاصل کر سکی تھی۔

یہ الگ بات ہے کہ والد صاحب نیک دل اور نیک فطرت انسان تھے اور انہوں نے میری ساری ماؤں کو مکانات بنا کر دیئے تھے اور اتنا کچھ دے دیا تھا کہ انہیں کسی چیز کی کمی نہیں رہی تھی۔ ضوبیہ بیگم کی شکایت پر وہ ان سے یہی کہا کرتے تھے کہ دیکھو خاتون

ضوبیہ، بیوی تو تم بس میری بن گئی ہو۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تم میری دوست ہو اور دو کا درجہ ان چھوٹی موٹی باتوں سے بہت زیادہ بلند ہوتا ہے۔ یہ مسخرے پن کی محبت بھ والدہ صاحبہ کو پسند تھی۔

میری جتنی دوسری مائیں تھیں، میری والدہ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھیں۔ لہٰذا خواتین حسن و جمال میں دنیا بھر میں بے مثال کہی جاتی ہیں۔ خاتون ضوبیہ کا بلند و با قد، نیلی آنکھیں، بھورے بال اور سرخ و سفید رنگت انہیں لاکھوں میں ممتاز کرتی تھی ویسے میرے ننھیال والوں سے تقریباً آدھا شہر آباد تھا۔ مگر ہماری یہ حویلی شہر سے چار پا میل دور ایک عالی شان حویلی کہلاتی تھی۔ اور اس کا نام ثمرستانِ جمشید تھا۔ ہم اسی حو میں رہتے تھے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میری آبائی زمینیں دور دور تک کی ریاستو اور تحصیلوں میں پھیلی ہوئی تھیں، ہمارے ہاں ان زمینوں پر اجناس میں گیہوں کے علاو گنے اور کپاس کی کاشت بھی ہوتی تھی۔

کوئی گیارہ برس کی عمر تک مجھے دو چار مہینے سے زیادہ کہیں ایک جگہ رہنے کا موقع نہ نہیں ملا۔ والد صاحب مجھے بھی ایک ماہر شکاری اور سیاح بنانا چاہتے تھے۔ گرمیوں ک زمانہ ہم شملہ، نینی تال یا میسوری میں گزارتے تھے۔ اس کے بعد سال کا باقی حص ریاست کے مختلف حصوں میں گھومتے ہوئے گزرتا تھا۔ میں ذرا بڑا ہوا تو میری تعلیم ک ذمہ داری اماں نے سنبھال لی۔ اماں اس زمانے کے لحاظ سے بہت پڑھی لکھی خاتو تھیں۔ انہیں کئی زبانیں آتی تھیں اور انگریزی میں تو وہ ماہر تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی مجھے مذہبی تعلیم بھی اماں نے دی تھی۔ اُردو، انگریزی، حساب وغیرہ سب کچھ پڑھ ر تھا۔ لیکن ہمدان جمشیدی کو ان تمام چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اگر مجھے کوئی تعلیم دینا چاہتے تھے تو بس اتنی کہ مجھے ایک اعلیٰ شکاری بنا دیں۔ یوں بھی میں ہر شخص کے حصے میں آجاتا تھا لیکن زیادہ تر والد صاحب کے حصے میں رہتا تھا۔ وہ مجھے شکار پر لے جاتے اور سرچ لائٹ میں چمکتی ہوئی جنگلی جانوروں کی آنکھوں سے ایک ایک جانور کی پہچان کراتے۔ اگر میں صحیح بتا دیتا تو ایئر گن کے پانچ چھرے انعام دیتے۔ غلط بتاتا تو ضمانت کے طور پر دو چھرے ضبط کر لیتے۔ ہلتی ہوئی جھاڑی کا اشارہ سمجھ لینا، کیچڑ، ریت اور مٹی وغیرہ پر جانوروں کے پیروں کے نشان، ان کی قسم، تعداد اور عمر کا تعین کرنا، ہوا اور بادلوں سے موسم کا اندازہ لگانا۔ غرض میرا یہی نصابِ تعلیم تھا جو والد صاحب کی طرف سے مجھے

منتقل ہو رہا تھا۔ انہیں اس بات سے غرض نہیں تھی کہ میں بڑا ہو کر کیا بنوں گا۔

دادی اماں اور تقریباً وہ تمام بزرگ جو مجھ سے دلچسپی رکھتے تھے، ان کے متفقہ فیصلے سے میرا نام خاقان جمشیدی رکھا گیا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق اس نام میں ایک وقار چھپا ہوا تھا۔ بہرحال گیارہ سال کی عمر تک میں کھیتوں کھلیانوں میں، ہریلوں میں، فاختاؤں اور کبوتروں پر ایئر گن چلاتا رہا یا پھر والد صاحب کے شکار کیے ہوئے جانوروں کی پیمائش کرتا رہا۔ گھوڑے کی سواری میں، میں نے اس عمر میں ہی اتنی مہارت حاصل کر لی تھی کہ خود والد صاحب بھی حیران رہ گئے تھے۔ اسی طرح دریا کے بہاؤ کے مخالف سمت تیرنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ پھر اس وقت میری عمر تقریباً ساڑھے گیارہ برس تھی کہ ایک دن والد صاحب نے کسی آدم خور گلدار کے چکر میں ایک خاص علاقے دھرم شوالہ کے نیچے وادی میں کیمپ لگوایا۔ دھرم شوالہ کا علاقہ شِو جی کے ایک غیر آباد مندر کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اب تو ان اطراف میں کوئی موجود نہیں تھا، لیکن سنا جاتا ہے کہ دھرم شوالہ کے علاقے میں ایک بدھ خانقاہ بھی تھی اور اس کے اطراف میں آبادی بھی تھی۔ لیکن اب وہاں پر جنگلی جانوروں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ویسے دھرم شوالہ کا علاقہ اس قدر پُر ہیبت اور پُرشکوہ تھا کہ میں اس کے بارے میں صحیح الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہاں اس پُرشکوہ مندر اور خانقاہ کے کھنڈرات اب بھی موجود تھے اور ان کی عظمت اور ہیبت اس قدر بے مثال تھی کہ اس کا تذکرہ صحیح الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان کے درمیانی حصے کے گھنے جنگلوں میں بندھیاچل پہاڑ کی ایک سرسبز و شاداب پہاڑی ہے جس کی دُشوار گزار چوٹی پر تقریباً آدھا میل چوڑا بالکل مسطح میدان ہے۔ اس میدان کے درمیان میں دھرم شوالہ کی پہاڑی کے دامن میں ایک انتہائی تیز رفتار ندی بہتی ہے جو ایک قدرتی کھائی کا کام بھی دیتی ہے۔ گویا دھرم شوالہ تک پہنچنے کے لئے آدمی کا بہت سے معاملات میں ماہر ہونا ضروری ہے۔ یعنی یہ کہ وہ کوہ پیما بھی ہو، تیراک بھی ہو اور عقیدہ پرست بھی۔ یہاں کی تاریخ تھی کہ یہ مندر دھرم شوالہ کے راجہ شِو نے بنوایا تھا۔ مقامی روایت یہ بھی ہے کہ اس مندر کو پراسرار قوتوں نے تعمیر کیا تھا۔ یہ قوتیں ان دیکھی تھیں۔ آس پاس کے باسیوں سے روایت تھی کہ مندر راتوں رات بن گیا تھا۔ مندر کے ایک نامکمل حصے کے بارے میں خوش عقیدہ لوگ اس وقت یہ کہتے تھے کہ مندر کی تعمیر ابھی جاری تھی کہ رات ختم ہو گئی اور صبح کا تارہ نکل آیا اور جیسے ہی مرغ

کی آواز فضا میں ابھری وہ پراسرار قوتیں مندر کو ادھورا چھوڑ کر اِندردوار واپس چلی گئیں اور مندر کا تھوڑا سا حصہ ادھورا رہ گیا۔ اس کے بعد سے آج تک کسی کی اتنی ہمت نہیں ہو سکی کہ ان دُشوار گزار پہاڑی راستوں سے گزر کر وہ پتھر اوپر لے کر جائے جو وہاں کے ایک ایک چپے میں نصب کئے گئے تھے اور مندر کا یہ حصہ مکمل کر دے۔

یہ روایتیں دھرم شوالہ کے قرب و جوار کی نچلی آبادیوں میں یا پھر پہاڑیوں کے دامن میں رہنے والے ان محنت کش اور عقیدت مند لوگوں میں پھیلی ہوئی تھیں جو نجانے کس کس طرح ہمت کر کے بلندیوں تک جاتے اور ان مندروں میں پوجا پاٹ کر کے واپس آتے تھے۔ یہ مندر جو کہ شِو جی کا مندر کہلاتا تھا، اس قدر عجیب و غریب طرزِ تعمیر کا مجموعہ تھا کہ انسان اس میں کھو کر رہ جائے۔ پتھروں کو اس انداز میں نصب کیا گیا تھا کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ پتھر آپس میں کسی چیز سے جڑے ہوئے ہیں بلکہ یہ سارے کے سارے فضا میں معلق ہوتے تھے۔ اور بھلا ہندوستان میں رہ کر ایک ایسی جگہ جہاں کبھی کبھی باقاعدہ سرکاری طور پر غیر ملکی وفد آتے تھے اور وہاں تک پہنچنے کی ناکام کوشش کر کے واپس چلے جاتے تھے، ہمدان جمشیدی نہ پہنچیں، یہ کیسے ہو سکتا تھا۔

اپنے دلیر بیٹے خاقان جمشیدی کو ساتھ لے کر وہ جب بلندیوں پر اوپر پہنچے اور دھرم شوالہ کی بدھ خانقاہ اور شِو مندر کی زیارتیں کرائیں تو اس کی ویرانی اور وحشت ناکی نے مجھے اس درجے متاثر کیا کہ کچھ دیر کے لئے میری قوتِ گویائی ہی صلب ہو گئی۔ میری آواز حلق میں رُک گئی اور میری آنکھیں مکمل طور پر ہر چیز کو نہ سمجھنے کے باوجود کچھ ایسے عالم میں کھو گئیں کہ خود مجھے بھی اس کا اندازہ نہیں ہو سکا۔

یہ شام کا وقت تھا اور پرندوں کی مسلسل بولنے کی آوازیں اور ہوا کی نغمہ بار سرسراہٹ سن کر یہ محسوس ہوتا تھا جیسے کسی جلتی ہوئی چتا کے گرد مرنے والے کے عزیز مدھم آوازوں میں رو رہے ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ والد صاحب نے چھوٹی سی عمر میں مجھے اتنا کچھ دکھا دیا تھا کہ میرا دل اپنے سائز سے بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ میں دلیری کے بہت سے مظاہرے کر چکا تھا اور سب یہ بات مانتے تھے کہ میں اپنی عمر سے کہیں زیادہ دلیر ہوں۔ مگر اس وقت یہی دل چاہ رہا تھا کہ یہاں سے واپس چلا جاؤں۔ یہ بات بھی میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے والد مجھے دنیا کا بہادر ترین آدمی دیکھنا چاہتے ہیں اور انہوں نے اس بات کا اظہار بھی کتنی ہی بار مجھ سے کر بھی دیا تھا۔ اس لئے بس شرما

حضوری میں ان سے یہ جملے نہ کہہ سکا کہ بابا جان واپس چلئے۔ بلکہ میں اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے اس میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ میری تربیت جنگلوں میں ہوئی تھی اس کے علاوہ میری رگوں میں جنگجو نسلوں کا خون دوڑ رہا تھا اور پھر میرے پاس میری اپنی بائیس بور کی رائفل بھی تھی جو مجھے اسی سال تحفے کے طور پر دی گئی تھی۔ میں نے ان تمام چیزوں کو اپنے ذہن میں محفوظ کیا اور میرا خوف کسی حد تک کم ہو گیا۔ بہر حال ہم دونوں چڑھائی کی وجہ سے دھرم شالہ تک پہنچتے پہنچتے پسینے میں شرابور ہو گئے تھے۔ میں تو خیر جو کچھ بھی تھا لیکن والد صاحب جو بڑے سے بڑے پُرخطر راستے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، ہانپنے لگے تھے۔ وہ مجھ سے آگے اپنی بندوق کے کندھے سے جھاڑیاں ہٹاتے ہوئے چل رہے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سرخ رنگ کی پہاڑی چوٹیوں پر سورج کی آخری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ مندر کے بلند و بالا کلس پر جہاں بھی ذرا سی سائے دار جگہ ملی تھی وہاں شہد کی مکھیوں نے چھتے بنا رکھے تھے جن سے نجانے کب سے شہد اور موم گرتا رہا تھا اور گہرے سرخ رنگ کے پتھروں پر ڈراؤنی شکلیں بن گئی تھیں۔

مندر کے صدر دروازے تک پہنچنے کے لئے سرخ پتھر ہی کی تقریباً پچاس سیڑھیاں طے کرنا پڑتی تھیں جن پر صدیوں کی بارش اور دھوپ نے ہلکی ہلکی دراڑیں ڈال دی تھیں۔ یہ تھا اس مندر کا حدود اربعہ جسے دیکھ کر دل پر شدید وحشت طاری ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر پتھر میں کوئی چہرہ پوشیدہ ہو اور نہ معلوم اور نظر نہ آنے والی نظریں آنے والوں کا جائزہ لے رہی ہوں۔ میں مہم جوئی کے جوش میں بھاگ کر چار چھ سیڑھیاں چڑھ گیا تو بابا جان نے چیخ کر مجھے آواز دی۔

''خاقان! رُکو...... رُک جاؤ۔ رُکو......'' اُن کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ میرے قدم رُک گئے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، انہوں نے رائفل کا سیفٹی کیچ اتار لیا تھا اور فائر کرنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ البتہ باپ کی اس آواز کو میں نے غیر معمولی سمجھا اور آہستہ سے الٹے پیروں چلتا ہوا ان کے برابر جا پہنچا۔ میں ابھی ان سے کوئی سوال ہی کرنے والا تھا کہ انہوں نے ایک انگلی اٹھائی اور پھر آہستہ سے بولے۔

''پیچھے...... پیچھے......'' میں نے پلٹ کر دیکھا، ہماری پشت پر پیپل کا ایک پرانا تناور درخت تھا۔

''ہری اپ۔'' بابا جان نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ مطلب یہ تھا کہ میں درخت پر چڑھ جاؤں۔ میں نے رائفل کندھے پر لٹکائی اور پھرتی سے درخت پر چڑھنے لگا۔ ان تمام چیزوں پر مجھے عبور حاصل تھا اور میں کہیں بھی مار نہیں کھاتا تھا۔ بابا جان کی محنت نے اور میرے شوق نے مجھے آتش بنا دیا تھا۔ بہرحال میں درخت پر چڑھ گیا اور پھر درخت کی ایک شاخ پر چڑھ کر میں نے دیکھا کہ بابا جان سیڑھیاں چڑھ کر مندر کے صدر دروازے میں داخل ہو چکے ہیں۔ میں شدید حیرت کا شکار تھا۔ میں نے مندر کے پتھریلے فرش پر ان کے قدموں کی آواز دور ہوتے ہوئے سنی اور اس کے بعد چڑیوں کی گونج اور ہوا کی سائیں سائیں کے علاوہ مجھے کوئی دوسری بات نہ سنائی دی۔ میرے لئے یہ انتہائی حیرت کی بات تھی کہ بابا جان نے مجھے خود تو درخت پر چڑھا دیا تھا اور اپنے آپ کو نجانے کہاں لے گئے تھے۔

مجھے درخت پر بیٹھے بیٹھے تقریباً بیس منٹ گزر گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ بابا جان کی خبر گیری ضروری تھی۔ اچانک ہی مندر کے اندر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور اس آواز کے ساتھ ہی بے شمار ابابیلیں اور چمگادڑیں شور مچاتی ہوئی اڑیں اور غولِ بیابان کی شکل میں صدر دروازے سے باہر نکلنے لگیں۔ ایک خوفناک شور برپا ہو گیا تھا۔ پرندوں کے چیخنے کی آوازیں اور پھر مندر کی ویرانی۔ ایک لمحے کے لئے ایک بار پھر میرا دل لرزنے لگا۔ اس وقت سورج ڈوب چکا تھا اور ہر طرف اندھیرا تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔ میں نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن مجھے والد صاحب نظر نہیں آئے۔ اب میرے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ تو بڑا غلط ہوا۔ بہت ہی غلط ہوا۔ پتہ نہیں کیا قصہ ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ والد صاحب کی اس قدر طویل گمشدگی نے مجھے ششدر کر دیا تھا۔ یہ کیا ہوا، آخر کیا ہوا؟ میں شدید پریشانی کے عالم میں سوچ رہا تھا اور فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ بہرحال اس کے بعد مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے درخت سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ہوشیاری کے ساتھ اپنی رائفل سنبھال لی تھی تاکہ اگر کوئی خطرناک صورتحال پیش آئے تو میں اسے سنبھال لوں۔

اسی وقت مجھے ایک تیز روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی مجھ پر پڑی تھی۔ میں نے فوراً رائفل سیدھی کی لیکن پھر مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ والد صاحب ہیں جنہوں نے اپنے ہاتھ

میں موجود برقی ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ڈالی تھی۔ انہوں نے میرے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھ لی تھیں اور پھر ہنستے ہوئے میرے پاس آ گئے تھے۔ اندر آ کر انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بھئی واہ خاقان جمشیدی، کیا ڈر گئے؟''

''نہیں، میں ڈرا نہیں تھا۔ لیکن آپ کا اتنی دیر غائب رہنا میرے لئے ذرا سنگین تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ خدا جانے آپ کو کیا صورتحال پیش آئی اور اندر سے فائر کی آواز بھی سنائی دی تھی۔''

''فائر میں نے ہی کیا تھا۔''

''لیکن کیوں بابا جان؟''

''بس مجھے کچھ شبہ ہوا تھا۔''

''کیسا شبہ ہوا تھا؟''

''مجھے یہ احساس ہوا تھا جیسے اندر کوئی درندہ ہے۔ بس ہلکی ہلکی غراہٹیں سنائی دے رہی تھیں اور اس طرح کی کھرکھراہٹ جو درندے کے نتھنوں سے خارج ہوتی ہے۔ اس لئے میں نے تمہیں درخت پر چڑھا دیا تھا اور خود درندے کی تلاش میں اندر گیا تھا۔''

''تو پھر؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس آہٹ اور غرغر کی آواز کیسی تھی۔''

''اب کیا کریں گے؟''

''آؤ یار، ہم کیا بزدل ہیں جو ڈریں گے۔'' ہمدان جمشیدی نے کہا اور میں ان کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں مندر کے سنگیں برآمدوں سے گزرتے ہوئے ہم دیو استھان کی جانب چل پڑے۔ ویران مندر کے فرش پر جابجا لنگوروں کا فضلہ اور چمگادڑوں کی بیٹ پڑی ہوئی تھی۔ ایک تصور یہ بھی ذہن میں تھا کہ ہو سکتا ہے اندر کوئی لنگور ہو جو بابا جان کو دیکھ کر کسی رخنے سے بھاگ نکلا ہو۔ لیکن بہرحال ہم بڑے غور سے دیکھتے چلے جا رہے تھے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہاں کسی خوفناک جانور کے پیروں کے نشان تو نہیں ہیں۔ ایک برآمدے میں پیتل کے بہت بڑے بڑے نقارے نظر آئے۔ ایک نقارے پر کھال منڈھی ہوئی تھی [illegible]

ہوا تھا۔ ان کے قریب پہنچ کر ایک لمحے کے لئے میں رُکا اور میں نے چلتے چلتے ا بندوق کے کنارے سے نقارے پر چوٹ لگائی جس سے ایک ایسی عجیب اور ہولناک آو پیدا ہوئی کہ ناقابل بیان ہے۔ یوں محسوس ہوا جیسے آواز نقارے سے ہی نہیں بلکہ من کے در و دیوار سے ابھر رہی ہو۔ ایک بار پھر سردی کی ایک لہر میرے پورے بدن میں د گئی اور میں نے محسوس کیا کہ میری اس حرکت کو والد صاحب نے پسندیدگی کی نگاہو سے نہیں دیکھا۔ انہوں نے مجھے سرزنش بھی کر دی۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ یہ جگہ ہمارے لئے بالکل اجنبی ہے یہاں کون ہے، کیا ہے، ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تم سمجھ رہے ہو۔ کہیں سے بھی کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ آؤ۔"

میں نے معذرت آمیز نگاہوں سے بابا جان کو دیکھا تھا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ہم برآمدے سے صحن میں آ گئے اور پھر ٹارچ کی روشنی میں اپنے آپ سے بیس قدم کے فاصلے پر دیو استھان دیکھا۔ تقریباً گیارہ فٹ اونچے اور تیس فٹ چوڑے سنگ مرمر کے چبوترے پر شِو کی مورتی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ دیو استھان پر جگہ جگہ کاہی جمی ہوئی تھی اور وقت نے پتھروں میں دراڑیں ڈال رکھی تھیں۔ میں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں آپ سے کہ اس وقت اس ماحول اور اس مندر کے اندر کی ہیبت ناکی کو دیکھتے ہوئے عام دلوں کی حرکتیں بند ہو جانا معمولی سی بات تھی۔ وہ بلند و بالا سنگیں مجسمہ جس کی لمبائی چوڑائی کی تفصیل میں ابھی آپ کو بتاتا ہوں، ناقابل یقین ہیبت کا مالک تھا۔ میں نے بعد میں بہت سے مندر دیکھے لیکن اس مندر کو آج تک نہیں بھول سکتا۔ شِو کی مورتی کو اس آسن میں کسی نے کہیں بھی نہیں دیکھا ہو گا۔ سیاہ پتھر کی اس مورتی کی اونچائی دیو استھان سے شِو کے مکھ تک تقریباً پچاس فٹ تھی۔ ہم دونوں اس دیو ہیکل مجسمے کو دیکھتے رہے۔ عام طور پر دیویوں اور دیوتاؤں پر بت تراش ایک طرح کا ازلی اور ابدی سکون پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ شانت نظر آئیں۔ لیکن شِو کی اس مورتی کے چہرے پر ایک عجیب سی خوفناک کیفیت پھیلی ہوئی تھی۔ میں ان نقوش کے اس عالم کو صحیح الفاظ بھی نہیں دے سکتا۔ بہرحال ہم لوگ پُر ہیبت نگاہوں سے اس مورتی کو دیکھتے رہے۔ اسی وقت والد صاحب کی آواز ابھری۔

"چلو جاؤ...... یہ سیڑھیاں چڑھو اور مورتی کے بائیں جانب جا بیٹھو۔ ہمیں یہ رات

یہیں گزارنی ہے۔ کیونکہ باہر کے ماحول میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ کیا کیفیت ہو گی۔ اور پھر ہم نے کوئی مناسب جگہ اپنے رات کے قیام کے لئے منتخب بھی نہیں کی۔"

میں نے والد صاحب کی ہدایت کے مطابق سیڑھیاں چڑھیں اور مورتی کے زانو کے قریب پہنچ گیا۔ بہرحال رفتہ رفتہ ہر چیز کی حیثیت ختم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کئی نگاہیں اس مورتی پر ڈالنے کے بعد میرے دل میں خوف کسی قدر کم ہو گیا تھا چنانچہ میں مورتی کے زانو سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور دوسری سمت بابا جان بیٹھ گئے۔ گویا ہم اِدھر اور اُدھر بیٹھے ہوئے تھے اور ہمارے درمیان میں مورتی تھی۔ ہمارے سامنے صحن تھا اور اس میں گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ چاروں طرف دالانوں سے چمگادڑیں چیختی ہوئی صحن میں آتیں اور چکر لگا کر پھر سے دالانوں میں چلی جاتیں۔ اب کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ چنانچہ بابا جان نے کہا۔

"کیا خیال ہے، کچھ کھاؤ گے؟"

"ہاں، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

بابا جان نے اپنا شکاری تھیلا کھول کر کچھ کھانا اپنے لئے نکالا اور کچھ میری طرف بڑھایا۔ کھانے کے بعد بابا جان نے کہا کہ جب ہم نیچے کیمپ لگا رہے تھے تو ایک شکاری کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ جس آدم خور گلدار کی ہمیں تلاش ہے وہ اسی مندر کے آس پاس گھومتا ہوا دیکھا گیا ہے۔ اصل میں بات وہی تھی۔ مجھے یہ شبہ ہوا تھا کہ کہیں یہ گلدار مندر میں تو نہیں گھسا ہوا۔ اس وقت میں نے تمہیں درخت پر چڑھا کر اسی گلدار کو تلاش کیا تھا۔ دیکھو ایک بات کہوں کہ ایک ماہر شکاری کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ میں گم نہ ہو جائے بلکہ مکمل طور سے شکار کی طرف سے ہوشیار رہے تاکہ خود شکار نہ بن جائے۔ کیا سمجھے؟ اس بات کو ذہن میں رکھنا۔"

"ٹھیک ہے بابا جان!"

"نیند آ رہی ہے؟"

"ہاں۔ کھانے کے بعد آنکھوں میں غنودگی سی ہوتی جا رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر چاہو تو سو جاؤ۔ میں جاگ رہا ہوں۔" میں نے شِو جی کے زانو سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ بابا جان صبح تک جاگتے رہے تھے۔ بہرحال باپ تھے، اولاد کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اس گلدار کا خیال بھی ذہن میں

تھا۔

بہرحال جس گلدار کے بارے میں ہمارا یہ خیال تھا اس سے تو ہمارا سامنا نہیں ہو بلکہ وہ تیسرے دن ندی کے گھاٹ پر مارا گیا تھا۔ البتہ اس ہیبت ناک مندر میں ایک رات گزارنے کے بعد میرا ڈر بالکل نکل گیا تھا اور دن کی روشنی میں جب میں نے مندر کو دیکھا تو مجھے یہاں کی فضا بڑی مانوس مانوس سی محسوس ہوئی۔ ہمدان جمشیدی نے نجانے کس مقصد کے تحت یہاں زیادہ وقت قیام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے بھی اس بات سے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مندر کی ویرانی، گمبھیر سناٹے اور شِو کی اس پراسرار مورتی نے نجانے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا۔

پہلے تو میں اس ہیبت ناک فضا سے بڑا خوفزدہ سا تھا لیکن اب مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے ذہن کے تار اس مندر کی ویرانی سے منسلک ہو گئے ہوں۔ چنانچہ میں اکثر اس طرف نکل جاتا اور گھنٹوں مندر میں گھومتا رہتا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی میں نے اس بدھ خانقاہ کو بھی اندر سے دیکھا تھا۔ مندر سے اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ یہ دونوں جگہیں مجھے ایک ہی محسوس ہوتی تھیں۔ میں اکثر وہاں بھی جا بیٹھتا تھا۔ وقت نے نجانے کیا کیا فیصلے کئے تھے میرے بارے میں۔ خود ہمدان جمشیدی نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ لیکن بہرحال کچھ نہ کچھ ہونا تھا اور جب کچھ ہونا ہوتا ہے تو اس کے لئے ایک فضا ضرور بنتی ہے۔ مجھے اسی جگہ خراب ہونا تھا اور وقت نے میری تقدیر میں یہی کچھ لکھ دیا تھا۔

وہ دن جب میری زندگی میں ایک نئے رُخ کا آغاز ہوا بظاہر ایک عام سا دن تھا۔ دوپہر کا وقت تھا، میں مندر میں پہنچا اور حسبِ معمول دیو استھان کی سیڑھیاں چڑھ کر شِو کی مورتی کی گود میں جا بیٹھا۔ حالانکہ میرا اس سے نہ کوئی رابطہ تھا نہ میرے عقیدے کے مطابق وہ کوئی حیثیت رکھتا تھا۔ ماں اور دادی اماں نے مذہب کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا اور سکھایا تھا وہی میرے لئے مذہب کی بنیاد تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ باپ کی طرف سے مذہب کی طرف زیادہ رغبت نہ ہونے کی وجہ سے میں کبھی اس بارے میں نہیں سوچتا تھا بلکہ ایک خالص دنیا دار انسان تھا بلکہ انسان تھا بھی کہاں۔ ابھی تو میری ذہنی نشوونما ہو رہی تھی۔ شِو کی اس مورتی کی گود میں بیٹھ کر نجانے کیوں مجھے ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا تھا۔ غالباً یہ وہاں کے ماحول کی ٹھنڈک اور دل سے اس پُرہیبت

جگہ کا خوف نکل جانے کی وجہ سے تھا۔ یہ سب کچھ مجھے بڑا اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میں سو گیا۔ چونکہ دوپہر کا وقت تھا اور باہر گرمی تھی لیکن یہاں اندر کا ماحول بالکل مختلف تھا۔ اسی نیم غنودگی کے عالم میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے قدموں کی کوئی چاپ کہیں دور سے ودیا استھان کی جانب بڑھ رہی ہے۔ لکڑی کے کھڑاؤں کی کھڑک کھڑک۔ یقینی طور پر کوئی شخص دیو استھان کی طرف آ رہا تھا۔ جب یہ آہٹ بالکل قریب پہنچ گئی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرے سامنے گیروے رنگ کا لبادہ پہنے ایک بلند و بالا قد و قامت کا آدمی حیرت سے منہ کھولے کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے اور چہرے پر ایسی وحشت، ایسا خوف یا پھر شاید میں اس کی اس کیفیت کو صحیح الفاظ نہیں دے پا رہا، بس ایک شدید حیرت اس کے چہرے پر تھی۔ میں نے یہی سمجھا تھا کہ کوئی یاتری ہے اور شِو جی کے درشن کو آیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے ایک نامعلوم سے خوف کا احساس ہوا۔ میں گھبرا کر اٹھنے کا ارادہ کرنے لگا تھا کہ آنے والے نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے میرے پیر چھوئے اور پھر اپنے ہاتھوں کو اپنے منڈھے ہوئے سر پر رکھ لیا۔ اس کے بعد وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور عجیب والہانہ انداز سے دونوں ہاتھ جوڑ کر زمین پر گر گیا۔ وہ جذبے کی شدت سے کانپتی آواز میں ایک ہی فقرہ بار بار بڑبڑا رہا تھا۔

''بودھی ستو...... بودھی ستو...... بودھی ستو......''

میں جو بہت نڈر تھا نجانے کیوں اس وقت خوفزدہ ہو گیا تھا۔ میرے بدن میں لرزشیں تھیں۔ ویسے بھی اتنی عمر نہیں تھی کہ ہر طرح کے خوف سے بے نیاز ہو جاتا۔ بے شک ایک شکاری باپ کا نڈر بیٹا تھا لیکن ماحول کا اثر تو ہر انسان پر ہوتا ہے۔ میں مندر میں بالکل تنہا تھا اور چالیس بیالیس سال کا یہ شخص گیارہ بارہ برس کے ایک لڑکے کو سجدے کر رہا تھا۔ دو ہی وجوہات ہو سکتی تھیں، یا تو یہ شخص بالکل پاگل ہے یا پتہ نہیں اسے کیا ہوا ہے۔ ویسے پاگلوں سے مجھے ہمیشہ خوف محسوس ہوتا تھا۔ میرا رنگ زرد پڑ گیا اور پھر میں پوری تیزی سے اٹھا تاکہ دیو استھان کے اونچے چبوترے سے کود کر باہر بھاگ جاؤں۔ لیکن وہ شخص مجھ سے کہیں زیادہ پھرتیلا تھا۔ وہ سجدے سے اٹھا اور اس نے بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر میرے دونوں پاؤں پکڑ لئے اور پھر اپنا سر ان پر رکھ دیا۔ سچ کہتا ہوں کہ میں زندگی میں خوف کی اس شدت سے پہلے کبھی دوچار نہیں ہوا تھا اور نہ اس کے

بعد۔ میں نے خدا سے ہمیشہ یہ دعا مانگی ہے کہ پھر سے اس خوف کا شکار نہ کرے۔

چند لمحوں کے بعد اس شخص نے میرے پیروں سے اپنا سر اٹھایا اور چند قدم پیچھے ہٹا۔ پھر ہاتھ باندھ کر کہنے لگا۔

''لوکھ ناتھ...... دھم راج، میں نے آپ کو پہچان لیا۔ کہہ دیجئے کہ آپ ہی بودھی ستو وسکو پالی ہیں۔ آپ ہی ہمیں نجات دلانے والے ہیں۔ ہمارے پانچویں اور آخری بدھ مہتر بدھ ہیں۔ کہہ دیجئے بودھی ستو...... مان لیجئے ہماری بات...... مان جائیے بودھی ستو۔''

وہ عجیب طرح کی والہانہ خوشیوں اور غمناک کیفیتوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور وہ میرے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔

''دیکھو...... تم نجانے کیا کہہ رہے ہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ میں تو خاقان جمشیدی ہوں۔ اپنے بابا جان کے ساتھ شکار کھیلنے آیا ہوں۔'' میں نے بمشکل کانپتی ہوئی آواز میں اسے مخاطب کیا۔ گیروے کپڑے پہننے والا اس طرح مسکرایا جیسے اسے مجھ سے اسی جواب کی توقع تھی۔ اس نے ہولے سے کہا۔

''بودھی ستو...... آپ شکاری ہیں اور اگلے پچھلے تمام جنموں کی آتمائیں آپ کا شکار ہیں۔ میں گاشر برم کے مہان بھکشوؤں کا سیوک سندھورتی ہوں۔ ساؤدھانی ہوں۔ آپ کے شرن میں آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اکڑوں بیٹھ گیا اور ہاتھ آگے باندھ کر جھکا اور آنکھیں بند کر کے نجانے کیا کیا بڑبڑانے لگا۔ ایک عجیب سی لے میں اس نے کہا۔ جو الفاظ میری سمجھ میں آئے وہ یہ تھے۔

''تواں...... شرنا...... گچھامی......'' مجھے بعد میں یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ بدھ مت کے مقدس کلمات میں سے ہیں اور اس کے معنی ہیں کہ میں بدھ کی پناہ میں آتا ہوں۔

گیروے کپڑے والے اس شخص کی حرکتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ یقیناً پاگل ہے۔ لیکن یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ یہ شخص عام پاگلوں سے مختلف ہے۔ مثال کے طور پر عام پاگل مارنے دوڑتے ہیں جبکہ وہ مجھے سجدے کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میرا خوف کم ہونے لگا۔ اس کی حرکتوں پر مجھے ہنسی سی آنے لگی۔ وہ اسی طرح سر جھکائے بدھاں...... شرنا...... گچھامی کا ورد کرتا رہا اور میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ میں نے جی کڑا کر کے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا۔

''تم کہاں سے آئے ہو؟'' میری آواز سن کر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ باہر خوب تیز

دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور اتنی دیر میں ہی وہ شخص پسینہ پسینہ ہو گیا تھا۔

''آؤ باہر چلتے ہیں۔ پیپل کے نیچے سیڑھیوں پر بیٹھتے ہیں۔'' میں نے اس سے کہا تو وہ اپنا جھولا اٹھا کر میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ سیڑھیوں پر پہنچ کر اس نے جھٹ سے اپنی گیروے رنگ کی چادر بچھا دی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر جھک گیا۔ وہ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ نجانے کیوں اب مجھے اس سارے کھیل میں مزہ آ رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں بادشاہ ہوں اور میرے سامنے میرا غلام ہو۔ میں بڑے رُعب کے ساتھ سیڑھیوں پر ٹیک لگا کر چادر پر بیٹھ گیا اور اپنے پیر پھیلا دیئے۔ سندھورتی میرے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے جوتے کے بند کھولے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ساتھ لائی ہوئی گٹھڑی سے لکڑی کی ایک پلیٹ اور پانی کا عجیب سا برتن نکالا اور پھر اس نے بڑے اہتمام سے میرے پاؤں دھونا شروع کر دیئے۔ پیر دھو کر اس نے لکڑی کی پلیٹ اٹھائی اور میری طرف پشت کئے بغیر سیڑھیوں سے اتر کر وہ پانی پیپل کی جڑ میں ڈال دیا جو میرے دھلے ہوئے پیروں سے پلیٹ میں بھرا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا جا رہا ہے۔ شاید وہ کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد وہ پہلے کی طرح میرے قدموں میں آ بیٹھا۔ ایک بار پھر اس نے گٹھڑی میں ہاتھ ڈالا اور پیپل کے پتوں کا ایک دونا نکالا جس میں دو بھنے ہوئے شکر قند تھے۔ اس نے انہیں احتیاط کے ساتھ چھیل کر بڑی تعظیم سے میری طرف بڑھایا۔ شکر قند مجھے ہمیشہ سے بہت پسند تھے۔ میں نے اس وقت تکلف نہ کیا۔ ہلکی ہلکی بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر شکر قند پلیٹ میں سے اٹھایا اور اس سے کہا۔

''تم بھی کھاؤ سندھورتی۔'' اس نے دوسرا شکر قند اٹھا کر اپنی پیشانی سے لگایا اور محبت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ شاید وہ اس بات کا منتظر تھا کہ میں کھانا شروع کروں تو وہ بھی کھائے۔ میں نے شکر قند کھایا۔ بڑا میٹھا اور بڑا لذیذ تھا۔ بہر حال یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس کھیل میں اب بادشاہ اور وزیر سے بھی کہیں زیادہ لطف آنے لگا تھا۔ پھر اس نے مجھے لکڑی کے ایک پیالے میں نہایت ادب سے پانی پیش کیا۔ پانی پینے کے بعد میں نے سوچا کہ کھیل بہت ہو چکا۔ اب مجھے اپنے کیمپ میں واپس چلنا چاہئے کیونکہ بہر حال والد صاحب بھی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہر چند کہ وہ مجھ پر بے حد اعتماد کرتے تھے اور انہوں نے مجھے ہر طرح کی آزادی بھی دی تھی۔ لیکن حد سے

زیادہ آزادی بھی خطرناک چیز ہوتی ہے اور انہوں نے پہلے بھی مجھ سے یہ بات کہی تھی ک
اس جنگل میں اور ان خانقاہوں میں جنگلی جانور آزادی سے چلے آتے ہیں۔ کیونکہ یہا
انہیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ کسی بھی وقت کوئی جنگلی درندہ اس ہولناک مندر می
آ سکتا ہے۔ چنانچہ احتیاط رکھی جائے۔ اس وقت بھی میں خالی ہاتھ ہی چلا آیا تھا ورنہ عا
طور سے میری رائفل میرے ساتھ ہوتی تھی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بولا۔

"کیا آپ جانا چاہتے ہیں مہاراج؟"

"ہاں، مجھے بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"تو اسے..... ساؤتھافی! اے پرمپر ماتما، اے بودھی ستو، جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہونا ہے وہ سب آپ جانتے ہیں۔ ہمیں یہ سب کچھ نیدھان کتھ مہاودھان ستھ میں لکھا ہوا ملا ہے اور گاشرگرن کے مہان بھکشوؤں نے بھی اسی طرح بتا ہے۔ میں تو بس ایک دوہرانے والا ہوں اور میں دوہراتا ہوں کہ مہامایا دیوی کے ہاں جب ولادت ہونے والی تھی تب انہوں نے اپنے میکے جانے کی خواہش ظاہر کی اور آپ کے مہان پتا نے ان کا کہا مان لیا اور اپنی راجدھانی سے سونے کی پالکی میں ان کے میکے تک بٹھا کر لے گئے۔ راستے میں لمبی کے جنگل میں شال کے ایک پیڑ کے نیچے مہا مایا نے آپ کو جنم دیا۔ جے مہا وستو..... جے مہاپردھانی..... اے مقدس راجکمار، مقدس کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہے۔ پھر گاشرگرن کے مہان بھکشوؤں نے بتیس جسمانی نشانیاں بتائیں۔ جو یا تو چکروتی راجاؤں میں ہوتی ہیں یا گیانیوں میں۔ اور وہ نشانیاں میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ میں نے آپ کے جنم کے بارے میں جو کچھ کہا، آپ بتا دیجئے کہ وہ ایسا ہی ہے۔ ایسا ہی ہے مہاراج۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سر جھکا کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے میرے جواب کا منتظر ہو۔ چند لمحات خاموشی رہی۔ مجھے اپنی پیدائش کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ سارا چکر کیا ہے۔ یہ شخص یا تو کوئی جوتشی ہے یا بابا جان کے جاننے والوں میں سے کوئی۔ اور یہ میری پیدائش کے بارے میں ساری باتیں معلوم کر کے آیا ہے۔ مگر یہ چاہتا کیا ہے؟ یا تو یہ کہ مجھ سے کچھ پیسے اینٹھنا چاہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میری پیدائش کے واقعات کچھ اس طرح عجیب تھے کہ آج گیارہ بارہ برس ہونے کے بعد بھی ہماری جاگیر کے ہر چھوٹے بڑے کو یہ

واقعات معلوم تھے۔ ویسے اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان واقعات کو سب سے زیادہ ہوا ہمارے اس ملازم نے دی تھی جو میری پیدائش کے وقت میرے والد صاحب کے ساتھ تھا اور آج بھی وہ ہمارے قریب ہی ہوتا تھا۔ اس نے ان واقعات کی زبردست پبلسٹی کی تھی اور لوگوں کو بتایا تھا کہ زلزلے کے پہلے جھٹکے کے ساتھ میری ولادت ہوئی تھی۔ اصل میں ان واقعات کو اتنا دوہرایا گیا تھا کہ میں اتنی چھوٹی سی عمر میں بھی ان واقعات کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ یہ سب سوچ کر مجھے ہنسی آ گئی لیکن میرے ہنسنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح سر جھکا کر کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا۔

"بودھی ستو..... مجھے آپ کے جواب کا انتظار ہے۔ کہہ دیجئے کہ میں نے آپ کے جنم کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہی درست ہے۔ میں گوتم بدھ کا ایک بے نام بھکشو اگرچہ کائنات کے وجود کی طرح فانی اور غیر حقیقی ہوں اور اسی سے ساؤدھانی ہوں۔ مگر مجھے زمانوں کی جھلک دکھائی گئی ہے۔ سو میں سچائی کے بوجھ سے کانپتے ہوئے کہتا ہوں کہ تم بودھی ستو ہو۔ کسوپانی کا زمینی روپ ہو۔ تم ہمارے آخری نجات دہندہ مہتر بدھ ہو۔"

میرا ذہن بھٹکنے لگا۔ اصل میں کچھ الفاظ بار بار کہے جائیں تو ذہن پر نقش سے ہونے لگتے ہیں۔ میں اب بھی آپ کو ایک بات بتاؤں کہ بابا جان نے کسی آدم خور گلدار کے چکر میں یہاں کیمپ لگوایا تھا اور شِو کا ایک غیر آباد مندر اور ایک بدھ خانقاہ یہاں جس پُرشکوہ حیثیت کی حامل تھی وہ شاید انسانی سوچ سے کہیں زیادہ آگے کی چیز ہوں گی۔ لیکن میں جس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں اس وقت وہاں جنگلی جانوروں کے سوا کچھ نہیں تھا اور یہ بات بھی میں آپ سے کہوں کہ اگر آپ نے گاشربرم نہیں دیکھا تو میں کتنا ہی اس پُرہیبت اور پُرشکوہ خانقاہ کا حال لکھوں آپ کے ذہن تک اس کی عظمت اور ہیبت منتقل نہیں کر سکوں گا۔ بڑی عجیب و غریب جگہ تھی اور یہاں کسی بھی ایسی بات پر ذہن خراب ہو سکتا تھا۔ بہرحال میں تھوڑی دیر تک خاموش رہا اور پھر میں نے کہا۔

"دیکھو، میری پیدائش کے بارے میں تم نے جو بات کہی ہے وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن واقعات ذرا بدلے ہوئے ہیں۔ میری پیدائش کے وقت میری ماں جنگل میں شکار کھیل رہی تھی اور میں ایک ایسے کھنڈر میں پیدا ہوا جہاں بس ویرانی کے سوا کچھ نہیں تھا اور میری پیدائش کے وقت زمین بہت زور سے ہلی تھی، تبھی میں اس دنیا میں آیا۔" میرے ان

الفاظ نے اس شخص پر ایک ہیجان طاری کر دیا۔ وہ خوشی سے ناچنے لگا۔ اس کے چہرے پر سکون کی لہریں دوڑ گئی تھیں۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور تعظیماً جھک کر بولا۔

''بودھی ستو...... آپ نے کہہ دیا کہ میں سچا ہوں۔ سو میرا کام پورا ہو گیا۔ پر کسی اور کو یہ باتیں معلوم نہیں ہونی چاہئیں۔ مہا ستو! اب میری یہ آنکھیں کلکتے میں اپنے راجکمار کے درشن کریں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا جھولا اٹھایا اور الٹے قدموں چلتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اترا اور پھر مندر کے آنگن میں اُگی ہوئی خود رو جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

بہر حال اس کے بعد میں کیمپ واپس پہنچ گیا۔ مجھ پر گزرے ہوئے واقعات کا کسی کو کوئی علم نہیں تھا۔ نجانے کیوں میں نے بھی اپنی زبان بند رکھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے ذہن پر خاصے وقت تک وہ عجیب و غریب شخص سوار رہا تھا۔

آخر کار دھرم شوالہ سے واپسی ہوئی اور ہم ثمرستان جمشید پہنچے تو وہ شخص بالکل میرے ذہن سے محو ہو چکا تھا جس نے اپنا نام سیوک سندھورتی بتایا تھا۔ سیوک سندھورتی بڑا پراسرار شخص تھا۔ یہ بات تقریباً ایک ہفتے بعد کی ہے جب مجھے یہ بتایا گیا کہ اب میری ماں میری باقاعدہ تعلیم کے لئے مجھے ماموں جان کے پاس کلکتے بھیج رہی ہیں۔ کلکتے کا نام جب آیا تو سندھورتی کا جملہ میرے ذہن میں تازہ ہو گیا جو اس نے چلتے ہوئے کہا تھا۔

''اب یہ آنکھیں کلکتے میں مہا ستو کے درشن کریں گی۔''

نجانے کیوں پہلی بار مجھے یہ خیال ہوا کہ گیروے کپڑوں والا وہ بھکشو کوئی عام آدمی نہیں تھا جس نے میری پیدائش کی داستان ذرا مختلف انداز میں بیان کی تھی لیکن جو حقیقت سے قریب تھی۔ وہ میری زندگی کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ اب اکثر وہ میرے ذہن میں آنے لگا اور میں اس کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہا۔ نجانے کیوں مجھے یقین سا ہو گیا کہ وہ کلکتے میں مجھ سے ملنے ضرور آئے گا۔

⁂☆⁂

حالانکہ میں زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتا تھا اور ہمدان جمشیدی، میرے والد صاحب مجھے اپنے ساتھ شکار میں مصروف رکھتے تھے۔ البتہ والدہ صاحبہ نجانے کیوں تھوڑی سی مضمحل ہو گئی تھیں۔ اب ان کے ذہن میں گھر کا تصور بیدار ہو گیا تھا اور وہ زیادہ تر گھر پر ہی وقت گزارتی تھیں حالانکہ والد صاحب نے بیشتر بار انہیں دعوت دی تھی کہ ہمیشہ کی طرح وہ ان کے ساتھ شکار پر چلیں لیکن انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''میں نے آپ کو اپنا بدل دے دیا ہے۔ اب مجھے گھر سنبھالنے دیجئے تاکہ میں یہ محسوس کروں کہ میں عورت ہوں۔ اور پھر اماں بھی یہی کہتی ہیں۔''

والد صاحب نے بہت زیادہ زور نہیں دیا تھا حالانکہ میری پیدائش سے پہلے وہ والدہ صاحبہ کے بغیر کہیں جانے کے لئے قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ لیکن اب صورتحال کافی تبدیل ہو گئی تھی۔ میری تعلیم کے سلسلے میں بھی میری دادی جان کی اور میرے والد صاحب کی ایک جھڑپ ہوئی تھی۔ والد صاحب نے کہا تھا۔ ''جی اماں! اللہ کا دیا ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے۔ دولت، زمین، جائیدادیں۔ کئی نسلیں بیٹھ کر آرام سے کھا سکیں گی۔ اور پھر آپ کا پوتا بالکل جاہل تو نہیں ہے، اچھی خاصی تعلیمی حیثیت ہے اس کی۔ آپ امتحان لے لیجئے۔ کیوں اسے بلاوجہ کلکتہ بھیج رہی ہیں؟''

اماں نے آنکھیں نکال کر کہا تھا۔ ''ہمدان، زندگی بھر تو مجھ سے انحراف کرتا رہا ہے، میری ہر بات کو کاٹا ہے تو نے۔ یہ اچھا نہیں ہے۔ ماں ہونے کا حق ہی چھین لیا۔ یہ غرور کی باتیں ہیں جو تو کر رہا ہے اور میں نے غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہوا دیکھا ہے۔ تیرے جیسے مغرور ہی دنیا میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں۔ ایسا نہ کر ہمدان۔ ان زمینوں، جائیدادوں کو سنبھالنے کے لئے بھی ایک تعلیمی ذہن کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر قانونی داؤ پیچ کو بھی سمجھ سکے۔ تیری مرضی ہے بھائی! کاش تو ہمیں بھی کسی قابل سمجھتا۔''

والد صاحب نے جلدی سے کان پکڑ لئے اور بولے۔ ''بس، بس، بس۔ اور کچھ نہ کہیں۔ میرا یہ مطلب بالکل نہیں تھا۔ چلئے آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

بہر حال کلکتہ جانا تقدیر میں لکھا گیا تھا۔ والد صاحب خود مجھے اس عظیم الشان شہر چھوڑنے کے لئے آئے تھے۔ یہاں مجھے ایک انتہائی اعلیٰ درجے کے اسکول میں پڑھایا گیا۔ ظاہر ہے ارب پتی باپ کا بیٹا تھا اور جس دور کی کہانی میں سنا رہا ہوں اس دور میں ارب پتی بس تقریباً راجے مہاراجے ہی ہوا کرتے تھے۔ ایک اہمیت تھی ارب کی۔ ہوسٹل کے ایک شاندار کمرے میں میرے لئے بندوبست کیا گیا تھا۔ والد صاحب نے جاتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''یار! تیری ماں تو اچانک ہی عورت بن گئی۔ حالانکہ میری اس سے دوستی صرف ایک شکاری عورت کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ بہو بال تو اللہ نے مجھے بہت دکھ [illegible] لیکن مجھ

پرواہ نہیں ہوئی کیونکہ تو میرا یار بن گیا۔ یار! بات بھی سچ ہی ہے، بے شک اللہ نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے لیکن پھر بھی تعلیم بڑی ضروری چیز ہے۔ اس بات کو میں بھی جانتا ہوں اور مانتا ہوں۔ اماں سچ کہتی ہیں۔ میں ان سے منحرف نہیں تھا بلکہ یہ سمجھ لے کہ تجھ سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ بہرحال بیٹا! میں آتا رہوں گا۔ تمہیں بھی چھٹیوں میں گھر آنا ہو گا۔ میں نے تمہارے لئے اور بھی بہت سے بندوبست کر دیئے ہیں۔"

یہ بندوبست میرے لئے ایک خوبصورت دو گھوڑوں والی بگھی اور اس کا کوچوان تھا جو میرے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اسکول کے پرنسپل سے بھی میرے بارے میں بات کر لی گئی تھی۔ بہرحال ایک محبت کرنے والے باپ نے جو کچھ آسانی مجھے فراہم کر سکتے تھے، انہوں نے کی تھی۔

میں اسکول کے ہوسٹل میں رہنے لگا۔ اس کے بعد میرا تعلیمی سلسلہ شروع ہوا۔ حالانکہ میری باقاعدہ تعلیم نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود میں اپنی ذہانت کے سبب اپنی کلاس میں سب سے تیز طالب علم تھا۔ وقت کس طرح پَر لگا کر اڑتا ہے آپ لوگ بھی جانتے ہیں۔ میرے مشاغل یہاں بہت سے ہو گئے تھے اور میں تیزی سے تعلیمی مراحل طے کر رہا تھا۔ شروع ہی سے جنگلوں میں گھومنے پھرنے اور بابا جان کے ساتھ شکاری مہمات سر کرنے کی وجہ سے میں نے بہت کچھ سیکھا تھا اور میں ایک توانا اور چست و چالاک لڑکا تھا۔ چنانچہ کھیل کے میدان میں بھی میرا سکہ بیٹھ گیا۔ فٹ بال میرا پسندیدہ کھیل تھا۔ جب میں میٹرک میں پہنچا تو نہ صرف یہ کہ میں اپنے اسکول کی ٹیم کا کپتان بن گیا بلکہ کلکتے کے مشہور فٹ بال کلب محمڈن سکیورٹی کلب کے کھلاڑیوں میں حصہ لینے لگا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں، میں نے امتیازی نمبروں کے ساتھ میٹرک پاس کیا تھا اور پھر مجھے یہاں کے سب سے اعلیٰ درجے کے کالج میں داخلہ دلوا دیا گیا۔

کالج ایک الگ زندگی کا حامل تھا۔ کلکتہ ویسے ہی انسانوں کا سمندر تھا، یہاں کی زندگی میں بڑی تیزی تھی۔ جبکہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں اس قدر تیز رفتاری نہیں تھی۔ کالج میں، میں نے اپنے جوہر اور دکھائے۔ میں نہ صرف تعلیمی میدان میں تیز ہو گیا تھا بلکہ دوسرے مشاغل بھی بہت عمدہ ہو گئے تھے۔ اور یہیں میری ملاقات کلاڈیا سے ہوئی۔ کلاڈیا بھی اسی کالج میں پڑتی تھی۔ یہ ایک انگریز لڑکی تھی لیکن شلوار قمیض میں ملبوس کالج آیا کرتی تھی۔ اس کے حسن بے مثال کے بڑے چرچے تھے۔ ادھر لوگوں کا

خیال تھا کہ میں کالج کا سب سے حسین نوجوان ہوں۔ چنانچہ کلاڈیا سے میرا موازنہ کیا جانے لگا۔ لیکن کلاڈیا ذرا مغرور قسم کی لڑکی تھی۔ میں نے اپنی زندگی کے حسین ماہ و سال پوری سنجیدگی سے گزارے تھے لیکن حسن و عشق کے چکروں میں نہیں پڑا تھا۔ کلاڈیا کے بارے میں لڑکے مجھ سے طرح طرح کی باتیں کرتے تھے لیکن میں ان پر توجہ نہیں دیا کرتا تھا۔ پھر ایک اور دلچسپ سلسلہ شروع ہوا۔ یہ چوپان کا کھیل تھا۔ میرے ایک دوست علی سفیان نے مجھے اس طرف راغب کیا تھا اور میں نے گھوڑے کی سواری شروع کر دی تھی۔ وہ بھی ایک بڑے آدمی کا بیٹا تھا اور چوپان کلب کا بہترین ممبر۔ چنانچہ مجھے بھی وہاں کی ممبر شپ ملنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب کلاڈیا کو بھی میں نے چوپان کلب میں دیکھا اور کلاڈیا نے مجھے حیران نگاہوں سے۔ وہ بہت اچھا پولو کھیلتی تھی۔ میں نے خود بھی اس سلسلے میں خاصی مہارت حاصل کر لی اور تھوڑے ہی دن کے بعد میں چوپان کا بہترین کھلاڑی بن گیا۔ ہماری ٹیم الگ تھی۔ کلاڈیا دوسری ٹیم میں کھیلتی تھی۔ اور بھی کچھ لڑکیاں اس کے ساتھ کھیلتی تھیں جن کا تعلق اس کالج سے نہیں تھا۔ پھر ایک بار کلاڈیا سے پولو میچ پڑ گیا۔ میں بھی اس کا مدمقابل تھا اور سفیان بھی۔ ہم نے وہ کھیل پیش کیا کہ دوسری ٹیم کو ہم نے بالکل بھنگی بنا دیا۔ بہرحال کلاڈیا نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا اور خود ہی آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتی ہوں مسٹر خاقان!"

"ارے آپ تو میرا نام بھی جانتی ہیں۔"

"کیوں..... ہم کالج کے ساتھی نہیں ہیں؟ اور کیا آپ میرا نام نہیں جانتے؟"

"ارے کیوں نہیں، جانتا ہوں۔"

"آیئے آپ کو اپنے پپا سے ملاؤں۔" کلاڈیا کے پپا اور ممی سے مل کر میں حیران رہ گیا۔ کلاڈیا کے والد کرنل صغیر کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ برٹش آرمی میں کرنل کا عہدہ رکھتے تھے اور آن ڈیوٹی تھے۔ والدہ کا تعلق انگلینڈ سے تھا اور اس نے اپنا مذہب نہیں تبدیل کیا تھا۔ بڑی تفصیلی بات چیت ہوئی تھی ان سے اور بڑا تفصیلی تعارف ہوا تھا اور یہ تعارف کلاڈیا کے گھر میں ہوا تھا جو ڈھلکا گلی کے علاقے میں رہتے تھے۔ ڈھلکا گلی کلکتے کے متمول لوگوں کا علاقہ تھا۔ کرنل صاحب بہت خوش اخلاق تھے۔ اسی طرح کلاڈیا کی والدہ ڈینین بھی خوش اخلاق تھیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ بہترین اردو بولتی

تھیں جبکہ کلاڈیا کی اردو بالکل ٹھیک نہیں تھی۔ وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ بولتی تھی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ کلاڈیا نے انگلینڈ میں اپنے نانا کے پاس پرورش پائی تھی۔ بچپن ہی سے اس کے نانا نے اسے اپنے پاس رکھا تھا۔ بعد میں نانا کا انتقال ہوا تو وہ ہندوستان واپس آ گئی۔ اس خاندان سے بڑی اچھی دوستی ہوئی اور اب کالج میں بھی کلاڈیا میرے ساتھ نظر آنے لگی۔ لڑکے دبی دبی آوازوں میں ہم پر تبصرے کرنے لگے۔ لیکن یہ سچ بات ہے کہ ایک سفید نسل کی باشندہ ہونے کے باوجود نہ کبھی کلاڈیا نے کسی ہلکے پن کا مظاہرہ کیا۔ اور میں بھی بہرحال اس طرح کا انسان نہیں تھا۔ ابھی میری عمر بھی بہت زیادہ نہیں تھی۔ مجھ سے عمر کے بڑے اور سینئر لڑکے کھیل کے میدان کے علاوہ بھی ہر شعبہ میں مجھے اپنا لیڈر تسلیم کرنے لگے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ جب میں شام کو اپنی سفید رنگ کی بگھی میں جس کا کوچوان وہی بنگالی تھا جو شروع سے میرے ساتھ تھا اور جس کے بارے میں ہم سب کہتے تھے کہ وقت اس پر ٹھہر گیا ہے۔ اتنا طویل عرصہ ہو گیا تھا لیکن کلام علی بالکل ویسے کا ویسا تھا جیسا میں نے اسے پہلے دن دیکھا تھا۔ شام کو جب میں اپنی بگھی میں بھرے بازار میں نکل جاتا تو بہت سے حسین چہرے اور نیم وا آنکھیں میری طرف اٹھ جاتیں۔ بنگال کا حسن بہت ہی کم پلٹ کر مردوں کا نظارہ کرتا ہے۔ لیکن میرے معاملے میں یہ روایت الٹ گئی تھی۔ میں بیس بائیس برس کی عمر میں ایسا گبھرو جوان بن گیا تھا کہ اچھے اچھے وجیہہ لڑکے میرے ساتھ چلتے ہوئے گھبراتے تھے۔ میرا قد چھ فٹ دو انچ، شیر جیسی چھاتی، پتلی کمر، لمبے ہاتھ، سرخ و سفید رنگ اور نیلی آنکھیں جن پر لمبی گھنیری پلکیں سایہ کرتی تھیں، نیلگوں مائل، سیاہ گھنگھریالے بال، اونچی اور روشن پیشانی، چیتے جیسی چست چال اور گفتگو کی شیرینی۔ یہ سب چیزیں مردوں تک کو میرا دیوانہ بنا دیتی تھیں۔ پھر عورتیں اور لڑکیاں اگر میرے لئے سرگرداں نہ ہو جاتیں تو اس میں ان کا کیا قصور۔ ویسے آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں، انسان بڑی عجیب و غریب شے ہے۔ اگر اسے کچھ مل جاتا ہے تو اس پر بہت زیادہ اترانے لگ جاتا ہے۔ میں اتراتا تو نہیں تھا لیکن جب میں نگاہوں میں اپنے لئے عجیب و غریب جذبات پاتا تھا تو مجھے بڑا اچھا لگتا تھا۔ لیکن ان ساری چیزوں کے برعکس میں حسن و عشق کے جھگڑوں میں اور جنس کے ہنگاموں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ میری ان چیزوں پر کوئی ریسرچ ہی نہیں تھی سادہ سادہ زندگی کا مالک تھا۔ حالانکہ میرے دوست مجھے ہر طرح کی

باتیں سمجھاتے تھے۔ کالج کی صرف ایک ہی لڑکی نہیں بلکہ بیشتر لڑکیاں میری طرف قدم بڑھاتی تھیں، میں ان سے بڑی خوش اخلاقی سے ملتا تھا لیکن قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ میرا ذہن ان کی طرف مائل نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ میری تعلیم بی اے فائنل تک پہنچ گئی۔ یہ بی اے کا آخری سال تھا اور امتحان کا آخری دن۔ میں کتابیں بند کر کے سونے کی نیت سے بتی بجھانے اٹھا ہی تھا کہ میں نے برآمدے میں ایک نامانوس سی آواز سنی۔ یہ آواز قریب آئی تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی لکڑی کے جوتے پہنے ہوئے میرے کمرے کی طرف چلا آ رہا ہو۔ اس شاندار کالج میں لکڑی کے کھڑاؤں پہننا ایسا ہی تھا جیسے ملکہ وکٹوریہ کے محل میں تہمد باندھ کر گھومنا۔ کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ میرے کمرے کے سامنے آ کر رک گئی اور پھر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں بڑا حیران ہوا تھا۔ ویسے خوف و دہشت سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور پھر میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ میری یادداشت بے مثال تھی۔ بچپن تک کی وہ باتیں جو کہ بالکل ہی نوخیز عمر میں ہوئی تھیں، مجھے مستقل طور سے یاد تھیں۔ اور پھر خاص طور سے وہ باتیں جن کا تعلق ہوش کی زندگی سے تھا میں بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ بے شک ایک طویل عرصہ ہو گیا لیکن اس کے باوجود میں نے سیوک سندھورتی کو صاف پہچان لیا۔ وہ اپنے مخصوص گیروے رنگ کا لباس پہنے میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”ارے سیوک تم......“

اُس کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر گردن خم کرتے ہوئے کہا۔ ”جے ہو مہاراج، آپ نے ہمیں پہچان لیا۔“

میری آنکھوں میں دس سال پہلے کا وہ واقعہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ آ گیا جو گاشر برم میں پیش آیا تھا۔ کسی سحر زدہ انسان کی طرح میں نے سندھورتی کو دیکھا اور پھر ایک دم ہوش میں آ گیا۔

”آؤ...... اندر آ جاؤ۔“ سندھورتی نے بڑے ادب سے گردن خم کی اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ نجانے کس خیال کے تحت میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت میرا سر گھوم کر رہ گیا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد جب میرے اوسان بحا ہوئے تو میں نے اس سے کہا۔ ”بیٹھو سندھورتی! تم یہاں اس طرح آ جاؤ گے میں نے کبھی خواب میں

بھی نہیں سوچا تھا۔"

سندھورتی نے معمول کے مطابق دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور گردن خم کر کے مسکرایا۔ پھر بولا۔ "دھرم راج! میں نے کہا تھا نا کہ یہ آنکھیں اپنے راجکمار کو کلکتے میں دیکھیں گی۔"

"ہاں، تم نے کہا تھا۔ بیٹھو بھئی، تم بیٹھتے کیوں نہیں ہو؟"

"میری یہ مجال نہیں مہاراج کہ آپ کے سامنے بیٹھوں۔ آپ جب تک نہیں بیٹھیں گے، میں نہیں بیٹھوں گا۔" اس نے کہا اور میں آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکنے لگا۔ پھر میں نے اس سے کہا۔

"چلو آؤ بیٹھو۔" یہ کہہ کر میں اپنے بستر پر بیٹھ گیا اور اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

بہرحال اب بہت ساری باتیں تبدیل ہو گئی تھیں۔ اب میں گیارہ بارہ برس کا لڑکا نہیں تھا، بائیس برس کا ہوش مند اور ذہین نوجوان تھا اور اب سندھورتی اور اس کی باتیں میرے لئے مذاق نہیں رہی تھیں۔ اس رات مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ ان پراسرار اور اُلجھی ہوئی باتوں میں یقیناً کوئی مفہوم پوشیدہ ہے۔ ورنہ یہ شخص اس طرح کی بات کو پتھر کی لکیر نہ بنا لیتا۔ لیکن یہ مفہوم کیا ہے، میں ایک مسلمان لڑکا، ایک اچھے گھرانے کا فرد اور یہ شخص ایک بدھ ودھیارتی۔ یہ مجھے اتنا مقام کیوں دے رہا ہے؟ کیا ہے اس کہانی میں؟ اس وقت تو میں نے اس کی کہانی پر زیادہ غور نہیں کیا تھا حالانکہ اس وقت مجھے گاشر برم اور اس علاقے کی یعنی دھرم شوالہ کی باتیں یاد آتی رہی تھیں۔ شِو جی کے مندر میں جو لمحات پیش آئے تھے، اور دیو استھان کے پہلو میں جس طرح اس شخص نے مجھے دیکھ کر نجانے مجھے کیا کیا نام دیئے اور ان ناموں سے وہ مجھے پکار رہا تھا، ان سب کا مفہوم کیا ہے؟ میں اس گتھی کو سلجھانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے زیادہ موثر اور جامع لہجے میں کہا۔

"بات اصل میں یہ ہے سیوک سندھورتی! کہ اس وقت جب میری اور تمہاری ملاقات ہوئی تھی، تمہیں یاد ہے کتنا عرصہ ہو گیا؟"

"دس سال آٹھ مہینے اور سات دن مہاراج۔" اس نے جواب دیا۔

"ارے، تم نے اتنی تفصیل سے یہ وقت یاد رکھا؟"

"میں نے تو کم بتایا ہے مہاراج! آپ مجھ سے یہ بھی پوچھ سکتے ہیں کہ ایک ایک لمحہ، ایک ایک سیکنڈ میں نے آپ کو کیسے یاد رکھا ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ یہ سب کچھ ہے کیا؟ دیکھو، اُس وقت میں بچہ تھا، جو واقعہ پیش آیا تھا میں نے اس پر اتنا غور نہیں کیا تھا۔ بے شک مجھے یہ الفاظ یاد ہیں کہ تم نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ اب تم مجھے کلکتے میں ملو گے۔ حالانکہ اس وقت میرا کلکتے آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا، میری والدہ نے بعد ہی میں اس کا فیصلہ کیا۔ میں دہلی بھی جا سکتا تھا بلکہ یہ بات گھر میں ہوئی بھی تھی کہ مجھے دہلی بھیجا جائے یا کلکتہ۔ لیکن پھر بزرگوں نے یہی طے کیا کہ مجھے کلکتہ بھیجا جائے کیونکہ ہمارا علاقہ اس سے زیادہ قریب ہے۔ تم نے اس فیصلے سے پہلے ہی مجھ سے کلکتے میں ملنے کی بات کر لی تھی۔ اب مجھے تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

سیوک سندھورتی نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا اور ہاتھ باندھے ہوئے بولا۔

"بودھی ستو...... میں کیا جان سکتا ہوں۔ آپ جو کچھ ہیں اور کیا بننے والے ہیں وہ سب آپ کو معلوم ہے۔ میں تو کہی ہوئی باتیں دوہرانے والا ایک معمولی سا بھکشو ہوں۔"

"پھر بھی، کم از کم تم مجھے اتنا تو بتاؤ گے کہ کیا بننے والا ہوں میں؟ اور تمہیں یقیناً یہ بات بھی معلوم ہے کہ میرا مذہب ایک مسلمان کا مذہب ہے اور ہم مسلمان لوگ اپنا مذہب کبھی اور کسی شکل میں تبدیل نہیں کر سکتے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے سیوک سندھورتی کے چہرے کو دیکھا لیکن اس کے چہرے پر کوئی تغیر رونما نہیں ہوا تھا بلکہ وہی ابدی سکون اس کی آنکھوں اور اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا جو مجھے بڑا عجیب لگتا تھا۔ بالکل یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک سنگی مجسمہ ہو جس کا جو تاثر تراش دیا گیا، بس اسی تاثر میں اس کی زندگی گزر سکتی ہے۔ بہرحال میں نے اس سے یہ بات کہی تو وہ اسی پُرسکون لہجے میں بولا۔

"سمے سب فیصلے کرتا ہے مہاراج! سمے سب فیصلے کرتا ہے۔ میں آپ کو کچھ باتیں بتاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے مجھے ایک انوکھی کہانی سنانا شروع کر دی جس کی تفصیل میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے جو کچھ بھی مجھ سے کہا وہ میرے لئے ایک انکشاف سے کم نہیں تھا۔ اگر میں ان سب باتوں کی تفصیل بتاؤں تو ایک طویل تحریر درکار ہو گی۔ بہرحال ان باتوں کا خلاصہ بتائے دیتا ہوں وہ یہ کہ میں یعنی خاقان جمشیدی، مہاتما گوتم بدھ کے بعد آنے والا وہ پانچواں اور آخری بدھ ہوں جس کا بدھ قوم

کو صدیوں سے انتظار تھا اور ان مذہبی کتابوں میں میرا نام مہتر بدھ بتایا گیا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ مہاراج! سمے آنے دیں، وہ کتابیں آپ کے سامنے پیش کر دی جائیں گی اور یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ یہ تصور آپ سے وابستہ کیوں کیا گیا ہے۔ میں حیران پریشان اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اگرچہ میری تربیت مذہبی ماحول میں نہیں ہوئی تھی اس کے باوجود میں اپنے مذہب کی بنیادی باتیں ضرور جانتا تھا۔ میرے لئے یہ بات انتہائی پریشان کن تھی کہ میں اپنے مذہب کا عام سا انسان نہیں بلکہ درحقیقت کسی دوسرے مذہب کا اوتار ہوں۔ گو عقل میں آنے والی بات نہیں تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کے ذہن میں کوئی بات بیٹھ گئی ہو اور وہ اسے اپنا معیار بنا چکا ہو۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ بھکشو خود بھی فریب کھا رہا ہے اور مجھے بھی فریب دے رہا ہے تو پھر میرے مستقبل کے بارے میں صحیح پیش گوئیاں کس طرح کر سکتا ہے؟ شِو مندر کی سیڑھیوں پر اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے کلکتے میں ملے گا۔ اور اب کئی برس بعد اس کی پیشگوئی صحیح ثابت ہوئی تھی اور وہ میرے سامنے موجود تھا۔ جبکہ میرے ذہن میں ایسا کوئی تصور نہیں تھا کہ خدانخواستہ میں اپنے مذہب سے دور ہو جاؤں۔ میں جانتا تھا کہ میرا خاندان ایسا کبھی نہیں ہونے دے گا۔ اور میں بھی اپنے دل میں اس طرح کی کوئی بات نہیں رکھتا تھا۔ یہ بے چینی میرے چہرے پر تھی۔ اور میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یقیناً یہ شخص کسی بڑی غلط فہمی کا شکار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے اس لئے غلط فہمی ہوئی ہو کہ اس وقت میں دیو استھان میں شِو جی کے مجسمے کی آغوش میں لیٹا ہوا تھا۔ کہیں اس بیوقوف آدمی نے یہ تو نہیں سمجھا کہ مجھے پتھر کی اس مورتی نے جنم دیا ہے۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ سندھورتی نے کہا۔

"لوکھ ناتھ، آج سے دیبانت کے راستے پر آپ کی یاترا شروع ہوتی ہے۔ آپ کچھ دن بعد پھولا کھانچن کی پہاڑی چوٹیوں پر جائیں گے جہاں رانگا پوری کی پہاڑیوں میں مہان بھکشوؤں میں پرانے دھار کے بھکشو، ویدوان، سارھانی آپ کا راستہ دیکھ رہے ہیں۔ دھم راج، اب یہ آنکھیں اپنے بودھی ستو کو مہان بھکشوؤں کے دھار میں دیکھیں گی۔ اسے میری پیشگوئی نہ سمجھیں، یہ سمے کا دھارن ہے۔"

"پھولا کھانچن! یہ تو ہمالیہ کی چوٹی ہے۔"

"ہاں مہاراج! لیکن سری لنکا سے مشرقی حصے میں سفر کرتے ہوئے آپ کو اس علاقے میں جانا ہو گا اور وہاں سے آپ پھولا کھانچن کا سفر اختیار کریں گے۔"

"بھائی! یہ تو تم نے مجھے ایک ایسی بات بتا دی جو میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا، حیرت کی بات ہے۔"

"مہاراج! سارا سنسار ہی حیرت ہے۔ کون سی چیز ایسی ہے جو منش کے لئے حیرت نہ ہو۔"

بہرحال میں سناٹے میں آ گیا تھا اور اس طرح خیالات میں کھویا تھا کہ مجھے یہ بھی اندازہ نہ ہوا کہ وہ کب اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ یا پھر حقیقت یہ ہے کہ اس کا پراسرار وجود اس طرح میری نگاہوں سے گم ہو گیا جیسے کوئی تصویر سامنے سے ہٹ جاتی ہے۔ البتہ جب میں نے چونک کر اسے دیکھا تو اسے موجود نہ پا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور پھر دروازے کی طرف دیکھا تو دروازہ مجھے کھلا ہوا ہی نظر آیا تھا۔ میں تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ باہر آ کر میں نے راہداری میں دیکھا، کہیں کسی انسان کا وجود نہیں تھا۔ ہر طرف گہری اور مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ میرے پاس آیا تھا تو لکڑی کی کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ کھٹ بہت دور سے سنائی دی تھی۔ لیکن اس کی واپسی میں یہ کھٹ کھٹ بھی مجھے نہ سنائی دی۔ اور ایک بات اور بھی تھی، برابر برابر دوسرے کمروں کے دروازے بھی تھے۔ یہ ناخوشگوار کھٹ کھٹ سن کر کوئی بھی باہر آ سکتا تھا۔ لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے میرے علاوہ کسی نے یہ آواز سنی ہی نہ ہو یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آواز کسی کے کانوں تک ہی نہ پہنچی ہو اور وہ سب گہری نیند سو رہے ہوں۔

بہرحال نجانے کیوں مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے اندر ایک دوہری شخصیت پل رہی ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے اپنی ہوش کی زندگی سے پہلے دن کی کہانی مجھے اچھی طرح یاد تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کاشربرم کی پہاڑیوں میں شِو مندر میں مجھے یہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا تھا جو بہرحال اب میرے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ لیکن میری یادداشت میں اس کے نقوش موجود تھے اور سیوک سندھورتی کے بھی۔ چنانچہ یہ بڑا عجیب مسئلہ تھا۔ میں سری لنکا جانے والی پیشگوئی پر غور کر رہا تھا۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ تمام باتیں اس قدر ہیجان انگیز تھیں کہ میں رات بھر جاگتا رہا۔ حالانکہ دوسری صبح میرا آخری پرچہ تھا جسے بڑی توجہ کے ساتھ مجھے دینا تھا اور اپنا تعلیمی ریکارڈ برقرار رکھنا تھا۔ صبح کو میں بہت دیر تک ٹھنڈے پانی کے نیچے بیٹھ کر اپنے دماغ کو سکون دیتا رہا۔ رات بھر کی جگار آنکھوں میں سرخی کی شکل میں اتر آئی تھی۔ میرے دوستوں نے مجھ سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آج کے پرچے پر تم نے بہت زیادہ توجہ دی ہے۔ ورنہ تمہاری آنکھوں میں یہ سرخ رنگ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔"

میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ اب ان لوگوں کو میں کیا بتاتا کہ اس سرخ رنگ کی کہانی کیا ہے۔ بہرحال دوسرے دن میں امتحان سے فارغ ہو گیا۔ بمشکل تمام میں نے پرچہ دینے کے دوران اپنی انتہائی قوتِ ارادی سے کام لے کر ان باتوں کو ذہن سے دور کیا تھا جنہوں نے میرے سکون کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ وہ بدھ بھکشو ایسی عجیب و غریب باتیں کر کے گیا تھا کہ میرے دن کا سکون اور رات کی نیندیں غائب ہو گئی تھیں اور اس طرح حقیقت یہ ہے کہ میری زندہ دلی اور کھلنڈرے پن میں بھی فرق آیا تھا۔ حالانکہ میں نے سوچا تو یہ تھا کہ امتحان سے فارغ ہو کر اپنے دوستوں کے ساتھ خوب سیر و سیاحت کروں گا تاکہ میرے دل میں ان کے لئے کوئی تشنگی باقی نہ رہے۔ اس کے بعد گھر جا کر ماں باپ کی محبت کا لطف اٹھاؤں گا۔ غرض یہ کہ اب اچانک ہی دل و دماغ پر ایک عجیب سی کھولت سوار ہو گئی تھی جسے دوسرے لوگوں نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اس دن بھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب مجھے اپنے گھر روانہ ہو جانا چاہئے، یہاں طبیعت لگ نہیں رہی تھی۔ سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے کہ کرنل صغیر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھے تلاش کرتے ہوئے میرے ہوسٹل پہنچ گئے تھے۔ یہ اچھے آدمی تھے اور میں ان سے دلچسپی رکھتا تھا۔ البتہ کلاڈیا کے لئے میرے دل میں کوئی جگہ نہیں پیدا ہو پائی تھی جبکہ میں بہت سی بار دیکھ چکا تھا کہ کلاڈیا میری طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ابھی میں حسن و عشق کے ہنگاموں میں نہیں پھنسنا چاہتا تھا۔ کرنل صاحب نے کہا۔

"بھئی! اس وقت تو ایک غرض سے آیا ہوں میں تمہارے پاس۔ ویسے یقین کرو مجھے تمہارے پاس آنے میں کوئی عار نہیں تھا۔ اصل میں پولو کا ایک میچ پڑ گیا ہے اور ہمارے درمیان خوب ٹھن گئی ہے۔ یہاں ایک صاحب جو فوجی ہیں، رانا کرتار سنگھ۔ انہوں نے اپنی ٹیم بنائی ہوئی ہے اور بڑے دعوے کرتے پھر رہے ہیں۔ ان دنوں ہمارے اور ان کے درمیان میچ پڑ گیا ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم ہماری ٹیم میں شامل ہو جاؤ۔ دیکھو انکار مت کرنا۔ میں بڑے اعتماد کے ساتھ تمہارے پاس آیا ہوں۔"

کرنل صغیر صاحب کی شخصیت کچھ اس طرح کی تھی کہ میں نے حامی بھر لی۔ ویسے بھی

ذہن سے یہ گرد جھٹکنا چاہتا تھا جو اس طرح مجھ پر طاری ہوتی جا رہی تھی کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ بہرحال کرنل صاحب نے میرا شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد اسی شام مجھے اپنے گھر دعوت دے ڈالی۔ وہاں کلاڈیا سے ملاقات ہونا فطری بات تھی۔ کلاڈیا نے خوش دلی سے کہا۔

"میں جانتی تھی مسٹر خاقان! کہ آپ اپنے نام کی طرح بڑے آدمی ہیں اور یقیناً ہماری دوستی کو نہیں ٹھکرائیں گے۔"

"آپ کی کوٹھی بڑی خوبصورت ہے کلاڈیا۔"

"آیئے، میں آپ کو دکھاؤں۔" کلاڈیا نے کہا اور پھر اس نے مجھے اپنی کوٹھی دکھائی۔ لیکن میں اس وقت اس سے بہت زیادہ متاثر ہو گیا جب اس نے مجھے اپنی لائبریری دکھائی۔ چھوٹی سی لائبریری تھی لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس لائبریری میں خاص طور سے بدھا کا مجسمہ اور بدھ مذہب سے متعلق بے شمار کتابیں نظر آئیں۔ میں حیرت زدہ نگاہوں سے ان کتابوں کو دیکھتا رہا تو کلاڈیا میرے قریب آ کر بولی۔

"آپ کو بدھ تعلیمات سے دلچسپی ہے؟" میں نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے کلاڈیا کو دیکھا اور کہا۔

"یہ کس کا شوق ہے؟"

"میرا۔"

"کیا مطلب؟"

"بتاؤں گی تو حیران رہ جاؤ گے۔"

"نہیں کلاڈیا! میں واقعی بدھ مت سے کافی دلچسپی رکھتا ہوں۔ تم مجھے اس بارے میں بتاؤ۔"

"سچ کہوں، کوئی دس سال پہلے کی بات ہے، تم سمجھ لو میری عمر کیا ہو گی۔ ایک رات میں اپنے کمرے میں سو رہی تھی کہ نیم خوابی کے عالم میں جاگ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو اور پھر مجھے عجیب و غریب الفاظ سنائی دیئے۔"

"کیسے......؟" میں نے سحر زدہ لہجے میں پوچھا۔

"دھاں...... استو...... کرم کردھانی...... اپنی جگہ سے اٹھو، ہمارے ساتھ آؤ۔ نجانے ان الفاظ میں کیا قوت تھی، میں اپنی جگہ سے اٹھی۔ یہ بہت بڑا سچ ہے خاقان! نہ تو مجھے

پاگل سمجھنا نہ جھوٹا۔ میں عالم ہوش میں تھی لیکن اس طرح کہ مجھ پر نیم غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کچھ نادیدہ ہاتھوں نے میرے دونوں بازو پکڑ رکھے ہوں اور مجھے کشاں کشاں کہیں لئے جا رہے ہوں۔ میں اپنے بیڈ روم میں ہی تھی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ یہ میری ہمیشہ کی عادت ہے۔ لیکن وہ بند دروازہ میرے لئے خود بخود کھل گیا۔ میں باہر آئی اور راہداری طے کر کے پائیں باغ میں آ گئی۔ اور اس کے بعد کوئی مجھے، میرا مطلب ہے وہ نادیدہ ہاتھ جو میرے بازو پکڑے ہوئے تھے، مجھے ساتھ لئے ہوئے ایک طویل سفر طے کرانے لگے۔ پھر مجھے ایک گھر کے سامنے لے جایا گیا۔ یہ بھی خالی گھر تھا۔ مجھے اس کے دروازے کھلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ایک دیوار کے پاس جا کر مجھے ایک تہہ خانے میں اتارا گیا اور تہہ خانے میں ایک عظیم الشان کتاب رکھی ہوئی تھی۔ اس کتاب کی بلندی کوئی پندرہ فٹ کے قریب تھی اور اس کے کنارے کنارے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس طرح سے اس کتاب کی لمبائی بھی کوئی پچیس فٹ کے قریب ہو گی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے اوپری سرے پر بدھا کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ مجھے ان سیڑھیوں سے گزار کر اوپر لے جایا گیا تھا۔ پھر کچھ نادیدہ ہاتھوں نے اس کتاب کی جلد کھولی اور مجھے سیڑھیوں سے اتار کر اس کے ورق پر اتار دیا۔ کتاب کے ورق میں ایک دروازہ تھا، اس دروازے سے مجھے اندر لے جایا گیا اور اس کے بعد میں نے ایک عجیب و غریب دنیا آباد دیکھی۔ ایک انوکھا مندر جہاں بدھ مت کے پیروکار پوجا پاٹ میں مصروف تھے۔ بدھ کی سونے کی مورتیاں چاروں طرف ایستادہ تھیں۔ ان مورتیوں سے پیلی روشنی پھوٹ رہی تھی اور عجیب و غریب سازوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ان سازوں کی آوازوں میں ایسا سحر تھا کہ آج بھی میں اسے اپنے وجود میں محسوس کرتی ہوں۔ مجھے اس عظیم الشان مندر کی مکمل سیر کرائی گئی اور اس کے بعد مجھے وہاں سے واپس لے آیا گیا اور میں اپنے بستر پر سو گئی۔ لیکن دوسری صبح میرا سارا وجود تھکا ہوا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ رات کو میرے ساتھ کچھ ہوا ہے۔ بہرحال میں اسی کرید میں لگ گئی۔ میں نے کسی کو بھی یہ بات نہیں بتائی کہ میرا دوسرا انتہائی شوق بدھ تعلیمات کے بارے میں تعلیم حاصل کرنا ہے۔ بدھ کا یہ مجسمہ میں نے جان بوجھ کر اچھی طرح ہوش و حواس کے عالم میں خریدا ہے اور اکثر کبھی کبھی تنہائی میں بیٹھ کر میں اس مجسمے کا جائزہ لیتی ہوں اور یہ جاننا چاہتی ہوں کہ میرا تو اس مذہب اور دین سے کوئی تعلق نہیں ہے پھر میری

طرف یہ کوشش اور کارروائی کیوں ہوئی ہے؟ اس سلسلے میں یہ ساری کتابیں بھی خریدی ہیں۔ یہ ہے ان کتابوں کی یہاں موجودگی اور بدھ کے اس مجسمے کی موجودگی کی کہانی۔“

میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ نجانے کیوں پہلی بار مجھے کلاڈیا سے ہلکا سا تعلق محسوس ہوا۔ بس اتنا سا تعلق کہ میری اور اس کی مشکل ایک ہی تھی۔ پتہ نہیں کلاڈیا کا ان معاملات سے کیا تعلق تھا مگر میں نے عقل سے کام لے کر اپنی کیفیت کا اس پر اظہار نہیں کیا۔ البتہ میں نے اس سے کہا۔

”کلاڈیا! میں خود بھی بدھ مت سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ اگر تم اجازت دو تو میں تمہاری ان کتابوں کا کبھی کبھی مطالعہ کر لیا کروں؟“

”ہاں ضرور، کیوں نہیں؟ مجھے تو خوشی ہو گی۔“

”میں ان میں سے کچھ کتابیں لے جاؤں گا۔“

”کیوں نہیں۔ میں تمہیں بہترین کتابیں دیتی ہوں جن میں ان کے عقائد لکھے ہوئے ہیں۔“

بہرحال یہ ایک عجیب و غریب بات تھی کہ مجھے میری من پسند چیزیں مل گئی تھیں۔ کلاڈیا سے میں نے دو کتابیں لیں اور ساری رات اور سارا دن ان کا جائزہ لیتا رہا۔ میں نے ان کتابوں کو پڑھ ڈالا لیکن ان کتابوں نے مجھے مزید الجھن کا شکار بنا دیا۔ مجھے احساس ہوا کہ سیوک سندھورتی نے مجھے جو تفصیلات بتائی تھیں ان کا بدھ مت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے جن عقائد کا اظہار کیا تھا وہ بدھ مت کے بنیادی فرقوں کے عقائد سے نہ صرف یہ کہ مختلف تھے بلکہ بدھ مذہب کے کافی خلاف تھے اور بہت سی جگہ ایسی تفصیلات بتائی گئی تھیں جن میں ان عقائد کی شدید مخالفت کی جاتی تھی اور اسے بدھ مت کے خلاف ایک بدترین سازش قرار دیا جاتا تھا۔ یہ ایک اور نئی کہانی تھی جو میرے چھوٹے سے ذہن تک پہنچی۔ حالانکہ میں ان تمام چیزوں سے بالکل الگ انسان تھا۔ پتہ نہیں یہ سب کچھ کیوں میری زندگی سے منسلک ہوتا جا رہا تھا۔

بہرحال یہ پراسرار عمل جاری رہا۔ کلاڈیا کے ساتھ چوپان کی مشق ہوئی تھی۔ اور پھر ہمارا میچ ہوا۔ رانا کرتار سنگھ کی ٹیم ہمارے مقابلے میں بہت کمزور ثابت ہوئی۔ اس کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے اور ہم نے انہیں نیچا مارا۔ کلاڈیا کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ رانا صغیر بھی خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ بڑی شاندار قسم کی ضیافتیں

ہوئیں۔ بڑی پذیرائی ہوئی۔ میرے کھیل کو بہت پسند کیا گیا تھا۔ یہ سارے کام اپنی تھے لیکن جو کچھ میرے ذہن میں پل رہا تھا وہ بڑا سنسنی خیز تھا۔

بہرحال میں نے ابھی تک ان باتوں کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا تھا۔ اصل میں ا مجھے ان پراسرار واقعات سے کافی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ سیوک سندھورتی نے بہت عر پہلے کہا تھا، اس وقت جب میں شِو مندر میں موجود تھا، اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ا ہماری کلکتے میں ملاقات ہو گی۔ اور کلکتے میں ہماری ملاقات ہو گئی تھی۔ اب دوسری با اس نے یہ کہی تھی کہ میری اس سے ملاقات پھولا کھانچن میں ہو گی تو میں دیکھنا چاہتا کہ اس کی یہ پیشگوئی کیسے پوری ہوتی ہے۔

پھولا کھانچن کے بارے میں مجھے مکمل تفصیلات تو نہیں معلوم تھیں لیکن ان دنو معلومات حاصل کرتے ہوئے مجھے اس بات کا پتہ چل گیا تھا کہ سری لنکا سے کچھ ای راستے اختیار کرنا ہوں گے جن سے پھولا کھانچن تک کا سفر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کس طرح، یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ مجھے سری لنکا کے راستے پھو کھانچن آنا ہے۔ بظاہر تو اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا لیکن پھر بھی دل نجانے کیوا ایک عجیب سے احساس کا شکار ہونے لگتا تھا۔ مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے میں کچھ پراسر قوتوں کا کھلونا بن گیا ہوں اور وہ مجھے اپنی مرضی اور اپنے اشارے پر چلا رہی ہیں۔

گھر سے دو تین بار خبر آ چکی تھی کہ مجھے گھر واپس آنا ہے۔ ان لوگوں کو یہ بات معلو تھی کہ میں اپنا آخری پیپر دے چکا ہوں اور اب مجھے آ جانا چاہئے۔ لیکن بہرحال میں نے کچھ عرصے کے لئے معذرت کر لی تھی۔ اس دوران ان تحقیقات میں اور میچ کے میں کافی دن گزر گئے۔

آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اب گھر جانے کی تیاری کرنی چاہئے۔ چنانچہ میں نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ میرے دماغ پر اب پہلے جیسا بوجھ نہیں رہا تھا او میں سوچ رہا تھا کہ بابا جان کے ساتھ مہینے ڈیڑھ مہینے تک جنگلوں میں گھوموں گا تو ب پریشان خیالی بھی دور ہو جائے گی۔ پھر میری روانگی میں کچھ ہی وقت رہ گیا تھا کہ اچانک ہی مجھے محمڈن اسپورٹنگ کلب کا ایک عہدے دار نظر آیا جو میری ہی جانب آ رہا تھا اس نے مجھے سلام کیا اور بولا۔

”سر! آپ کو منیجر صاحب نے یہ خط بھیجا ہے۔“

میں نے حیرانی سے لفافہ کھولا تو اس کے اندر سے ایک پرچہ نکلا۔ منیجر صاحب نے بڑی عاجزی سے لکھا تھا۔

”مسٹر خاقان!

آپ ہمارے کلب کے بہت ہی شاندار رکن رہے ہیں اور کلب آپ پر اپنی مصروفیات کا حق سمجھتا ہے اور فخر کرتا ہے۔ بہت ہی محبت بھرے انداز میں آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ ہمارے ساتھ آپ سری لنکا کا سفر کیجئے۔ آپ کی ٹیم چار دن کے بعد سری لنکا جا رہی ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت ہمیں آپ کی شدید ضرورت ہے۔ آپ کو اس ٹیم میں شامل کر لیا گیا ہے اس یقین کے ساتھ کہ آپ انکار نہیں کریں گے۔ فٹ بال کے ایک عظیم کھلاڑی کی حیثیت سے ہم آپ سے یہ توقع کرتے ہیں کہ آپ ہماری دعوت قبول کر لیں گے۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمڈن کلب بین الاقوامی شہرت کا حامل تھا اور فٹ بال کی اتنی بڑی ٹیم میں میری شمولیت میرے لئے بہت بڑا اعزاز تھی۔ لیکن اس خط کو پڑھنے کے بعد نہ تو مجھے اعزاز کا خیال آیا اور نہ ہی سری لنکا جانے کی خوشی تھی۔ بلکہ میرے کانوں میں سیوک سندھورتی کی آواز گونج رہی تھی۔

”دھرم راج! اب یہ آنکھیں اپنے بودھی ستو کو مہان بھکشو کے دھار میں دیکھیں گی۔“

میں پوری جان سے لرزنے لگا۔ سری لنکا...... سری لنکا...... پھولا کھانچن...... رانگا پوری۔ یہ الفاظ میری آنکھوں میں ناچ رہے تھے۔ دوسری طرف اسپورٹس کلب کا رُکن میرے جواب کا منتظر تھا۔ اس نے کہا۔

”سر! منیجر صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ کا جواب لے کر آؤں۔“

نجانے کیوں میرے ارادے کے بغیر میرے منہ سے نکل گیا۔

”ٹھیک ہے...... میں چلوں گا۔“

✲✫✲

جو کچھ ہوا تھا، میں پورے اعتماد کے ساتھ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس میں میر
سوچ کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنے بڑے کلب کی طرف سے ف
بال کے ایک عظیم کھلاڑی کی حیثیت سے دعوت ملنا بہت بڑی بات تھی۔ یہ کلب نہ صرف
ہندوستان بھر میں بلکہ دنیا کے کئی ملکوں میں اپنے کھلاڑیوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا
اکثر اس کے کھلاڑیوں کو دنیا کے الگ الگ ملکوں سے کھیل کی یا پھر کسی اسپورٹس سیمینا
میں شرکت کی دعوتیں بھی ملتی رہتی تھیں اور اس کے کھلاڑی دنیا کے مختلف ممالک میں
جاتے تھے۔ لیکن مجھ پر اس کا اس وقت کوئی اثر نہیں تھا۔ میں تو ہوسٹل میں اپنے کمر
میں لیٹا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ میرے خدا، میں کس عذاب میں پھنس گیا ہوں۔

اس وقت مجھ پر لرزا سا طاری تھا۔ یہ سب کچھ کیا ہے اور کیوں ہے؟ مجھے یو
محسوس ہو رہا تھا جیسے میری زندگی اب میرے اختیار میں نہیں رہی ہے۔ میں خود ا
بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر رہا بلکہ میرے اطراف میں احاطہ کرنے والی پراسرار قوتی
میرے آگے کے ہر قدم کا فیصلہ کر رہی ہیں۔ لیکن یہ قوتیں مجھ سے کیا چاہتی ہیں، ی
مجھے نہیں معلوم تھا۔

ادھر گھر والے باقاعدہ میری واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ اب مجھے
کیا کرنا چاہئے۔ بہرحال میں نے سب سے پہلے والد صاحب کو تار دیا کہ میں اپ
کلب کی جانب سے میچ کھیلنے سری لنکا جا رہا ہوں۔ یہ اطلاع دینے کے بعد آخر کار میں
ٹیم کے ساتھ جانے کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ سارے کام کر رہا تھا لیکن مجھے سیوک
سندھورتی کی باتیں سخت پریشان کر رہی تھیں۔ ہر لمحہ اب یہی سوچیں میرے ذہن پر سوا
رہتی تھیں۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔

کلاڈیا اب ذرا مجھ سے کچھ زیادہ بے تکلف ہو گئی تھی۔ اس کی کتابیں واپس کر
اس کے گھر پہنچا تو اس نے میری بہترین پذیرائی کی۔ اس وقت کرنل صغیر موجود نہیں

تھے۔ وہ کچھ پریشان سی نظر آ رہی تھی۔ کتابیں لیتے ہوئے اس نے کہا۔

"مجھے معاف کرنا خاقان! کچھ ایسی باتیں کرنا چاہتی ہوں جنہیں کہتے ہوئے مجھے خود بھی اپنے ہلکے پن کا احساس ہو رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کالج میں لڑکیاں تمہارے بارے میں ایسی ایسی باتیں کیا کرتی تھیں کہ میں انہیں سن کر ہنستی تھی۔ تم سے کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں ہے۔ ان میں سے کئی لڑکیاں ایسی تھیں جو اپنے خوابوں میں تمہیں دیکھتی تھیں۔ اور ان خوابوں میں انہوں نے تمہیں حاصل کر لیا تھا۔ ان میں سے کچھ ایسی بھی تھیں جو نجانے کیوں مجھ سے پرخاش رکھتی تھیں حالانکہ اس وقت میری تمہاری کوئی دوستی نہیں تھی۔ لیکن ان میں سے کچھ کا کہنا تھا کہ میں نے تمہیں ان سے چھین لیا ہے۔ سچ کہتی ہوں میرے اپنے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ البتہ ان لڑکیوں کی دیوانگی پر غور کرتے ہوئے میں نے تمہارے بارے میں کئی بار سوچا ضرور تھا اور تمہیں اس لئے غور سے دیکھا تھا کہ آخر تم میں ایسی کون سی خاص بات ہے جس کی بناء پر وہ لڑکیاں ایسی حماقتیں کرتی ہیں۔ اب مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ کچھ خاص باتیں تھیں تو ضرور۔ مثلاً تمہاری ان کی جانب سے بے اعتنائی۔ میں نے کبھی تمہیں گھٹیا طریقے سے ان کی طرف متوجہ نہیں دیکھا نہ کبھی ان کے التفات پر تمہیں اتراتے ہوئے دیکھا۔ بس اس بات کو پسندیدگی کی نگاہ سے ضرور دیکھا تھا میں نے۔ لیکن اس میں پسندیدگی کا کوئی ایسا جذبہ شامل نہیں تھا جسے عامیانہ کہا جا سکے۔ بہرحال اسپورٹس کے سلسلے میں اور خاص طور سے پولو کے کھیل میں تمہاری مہارت نے مجھے متاثر کیا۔ تم نے دیکھا صرف میں ہی نہیں میرے پاپا بھی تم سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے ہمیشہ یہ بات کہی کہ یہ شخص بہت معیاری ہے، خاص طور سے چوپان کے کھیل میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ ایک دن یہ چوپان کے بہت بڑے کھلاڑی کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت حاصل کر جائے گا۔ تو میں یہ کہنا چاہتی تھی خاقان! کہ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم بھی بدھ مت سے دلچسپی رکھتے ہو تو مجھے عجیب سی ایک خوشی ہوئی اور اب میں تمہارے لئے اپنے دل میں ایک خاص مقام پاتی ہوں۔ تم یقین کرو اس میں ایک لڑکی اور لڑکے کا معاملہ نہیں ہے بلکہ میرے دل میں خواہش ہے کہ میرے تم سے روابط گہرے ہوں۔ میں تم سے بھی اس بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ میرے ذہن میں ایک خیال ہے، کیوں نہ ہم بدھ مت کے بارے میں مزید تحقیقات کریں اور اس سلسلے میں، میں اور تم مل کر ایسا

کر سکتے ہیں۔"

میں نے سپاٹ نگاہوں سے کلاڈیا کو دیکھا۔ یہ حقیقت ہے کہ پہلے بھی کلاڈیا میرے لئے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ لوگ کالج میں باتیں کیا کرتے تھے، اس کے حسن کی داستانیں سنایا کرتے تھے۔ بعد میں مجھے اس کے بارے میں مزید تفصیلات معلو ہوئیں جو ذرا دلچسپ تھیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میرے ذہن میں کبھی ایسا کو تصور نہیں ابھرا۔ اور اس وقت بھی کلاڈیا نے جو الفاظ کہے تھے انہوں نے مجھے بہت زیا متاثر نہیں کیا۔ لیکن بدھ مت کے بارے میں تحقیقات کی بات جو اس نے کی تھی وہ مجھ خاصی دلچسپ محسوس ہوئی۔ میں نے اس سے کہا۔

"کلاڈیا! میں کلب کی جانب سے کھیلنے سری لنکا جا رہا ہوں اور اس کے بعد میر وہاں سے واپسی ہوگی۔ لیکن شاید یہاں نہیں بلکہ اپنے گھر۔ کیونکہ میرے اہل خاندان ا اس کے بعد میرے لئے آگے کے راستے منتخب کریں گے۔ جیسا کہ میں تمہیں بتا چ ہوں کہ میں ایک زمیندار کا بیٹا ہوں اور میرا خیال ہے اس سے زیادہ تعلیم مجھے نہیں دلا جائے گی۔ کیونکہ وہ لوگ زیادہ تعلیم کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ تو کلاڈیا، اگر واپس کلکتے آیا تو وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے رابطہ رکھوں گا اور ہو سکتا ہے اس وقت ہم دونوں مل کر بدھ مت کے بارے میں تحقیقات کا کام شروع کر دیں۔ لیکن اس سے پہلے میں تم سے کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتا۔ اس کا فیصلہ تو میرے گھر پہنچنے کے بعد ہی ہوگا کہ مجھے واپس کلکتے بھیجا جاتا ہے یا پھر اور کوئی کام میرے سپرد کیا جائے گا۔"

ساری باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن کلاڈیا کو میں اتنی تفصیل سے اپنے اوپر بیتنے وال داستان نہیں سنانا چاہتا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ داستان میرے پاس ایک امانت کی حیثیت رکھتی ہو اور امانت میں خیانت میرے لئے ممکن نہ تھی۔ بہر حال کلاڈیا نے چونک کر پوچھا۔

"تم کون سے کلب کی جانب سے کھیلنے جا رہے ہو؟"

"میں محمڈن اسپورٹس کلب کا ریگولر ممبر ہوں۔"

"اوہ...... ویری گڈ۔ میں نے کہا تھا نا کہ تم ترقی کی منازل طے کرتے چلے جا گے۔ ٹھیک ہے، میں ان تمام حقیقتوں کو سمجھتی ہوں۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔" کلاڈ نے کہا۔ ایک عجیب سا تاثر اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔

بہر حال ساری تیاریاں کرنے کے بعد ہم سری لنکا چل پڑے۔ یہاں پہنچ کر میں میچ کی ہنگامہ آرائیوں میں کھو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے ذہن پر ایک خاص دباؤ ہمیشہ رہتا تھا۔ بس وہی سیوک سندھورتی کی پیش گوئیاں اور گزرے ہوئے واقعات کا عکس۔ لیکن سری لنکا آنے کے بعد ہم نے کولمبو، رتن پورے میں کئی میچ کھیلے اور یہ حقیقت ہے کہ یہاں بھی میری اپنی کارروائیوں کے بجائے کچھ پراسرار قوتوں کا عمل زیادہ کارفرما رہا۔ آپ یقین کیجئے، میں حیران رہ جاتا تھا جب میرا بدن وزن سے بے نیاز ہو جاتا تھا اور میں فٹ بال لے کر چلتا تو لوگوں کے منہ سے آوازیں نکل جاتیں۔ میں فضا میں تیر کی مانند اُڑتا ہوا بال تک پہنچتا اور گول کر آتا۔ مخالف ٹیموں پر میرے کھیل کی دھاک بیٹھ گئی تھی اور کلب کے کارکنان میرے دیوانے ہو گئے تھے۔ میں نے بہت کامیاب اور صاف ستھرے کھیل کا مظاہرہ کیا تھا۔

پھر کیانڈی میں میری ملاقات ایک بدھ لڑکے سے ہوئی۔ اس کا نام اجے ورتنا تھا۔ اجے ورتنا میرا دوست بن گیا اور ہم بہت جلد ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ ورتنا کا باپ رتن پورے میں یاقوت کی ایک کان میں انجینئر تھا۔ اس کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہم کیانڈی سے رتن پورے میچ کھیلنے جائیں گے تو اس نے بھی میرے ساتھ چلنے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ کیانڈی میں تعلیم حاصل کرتا تھا اور چھٹیوں میں رتن پورے جاتا رہتا تھا۔ رتن پورے ہی میں وہ لڑکی بھی رہتی تھی جس کا اجے سے معاشقہ چل رہا تھا۔ پھر ہم رتن پورے پہنچ گئے۔ یہاں اجے نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ٹیم کے ساتھ ہوٹل میں قیام کرنے کی بجائے اس کے گھر میں ٹھہروں۔ اس کا باپ صاحب حیثیت آدمی تھا۔ ٹیم کے منتظمین سے اس نے خاص طور سے یہ اجازت لے لی تھی کہ وہ مجھے اپنے گھر مہمان بنائے۔ ہماری ٹیم کا یہاں خاصے دنوں قیام تھا۔ اور پھر کوئی خاص پابندی نہیں تھی چنانچہ رتن پورے میں میچ کھیلنے کے بعد میں نے ورتنا کے ساتھ وہاں کے قابل دید مناظر دیکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ رتن پورے کے بارے میں اگر کوئی ایسا شخص تفصیلات جانتا ہے جس نے سری لنکا کا دورہ کیا ہو تو وہی بتا سکتا ہے کہ رتن پورے کا یہ علاقہ کتنا حسین تھا۔ ورتنا مجھے جگہ جگہ کی سیر کراتا رہا اور یہاں ہم نے پہاڑی سلسلے میں آخری چوٹی بھی دیکھی جس کے بارے میں یہ روایت ہے کہ حضرت آدمؑ کو اس چوٹی پر پھینکا گیا تھا۔ وہاں باقاعدہ ایک احاطہ بنا ہوا تھا۔ سری لنکا کے مسلمان عقیدت مند بہزار دقت اس چوٹی پر

آتے تھے اور یہاں بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ مختلف چیزوں کو دیکھنے کے بعد بدھوں کی مشہور عبادت گاہ مہاسان دیول پہنچے تو مجھے یہ لگا جیسے مجھے خاص طور سے یہ لایا گیا ہو۔ سیوک سندھورتی اور کچھ پراسرار قوتیں میرے قریب ہی کہیں موجود ہو ایک بہت بڑی حقیقت میں آپ کو بتاؤں، یہاں آنے کے بعد میں ہر وقت کچھ محسوس کرتا تھا جیسے میں عالم خواب میں ہوں اور ذہن پر ایک دُھند سے چھائی رہتی تھی

جب مہاسان دیول سے واپس آ رہے تھے تو ہم نے ایک ایسی جگہ قیام کیا جہاں کی ایک چٹان شیر کے منہ کی شکل میں بنی ہوئی تھی۔ پورا شیر کا دہانہ تھا، لمبے لمبے دا نکلے ہوئے تھے۔ ورتنا نے مجھے بتایا کہ لوگ یہاں آتے ہیں تو اس میں بیٹھ کر تصویر کھنچواتے ہیں، بالکل یوں لگتا ہے جیسے وہ شیر کے حلق میں بیٹھے ہوں۔ آؤ یہاں بیٹ ہیں۔ اس وقت آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ میں اجے ورتنا کے ساتھ وہاں جا بیٹھا یہاں پہنچ کر میرے ذہن پر ایک پراسرار سی دُھند چھا گئی۔ اجے ورتنا مجھے صرف ا ہیولے کی شکل میں نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''ورتنا! میں اپنے دل کی داستان تمہیں سنانا چاہتا ہوں۔ میں ایک عجیب سی کیفیت شکار ہوں۔ کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کر سکو گے؟''

اجے ورتنا نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے میرے دوست بتاؤ، کیا بات ہے؟''

''یہ کہانی میرے بچپن سے شروع ہوتی ہے اجے ورتنا! اور بچپن سے اس کہانی گزرتے ہوئے یہاں تک آ پہنچا ہوں۔ لیکن اس داستان کا تسلسل نہیں ٹوٹتا۔ میں سخ پریشان ہوں اجے، میری مدد کرو۔''

''کیا بات ہے؟ اگر تم مناسب سمجھو تو مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔''

اور پھر وہی کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں خود نہ بول رہا ہو میرے اندر سے ایک آواز بلند ہو رہی ہو۔ نیم غشی، دُھند، خواب، اس عالم میں، میں ورتنا کو اپنے بارے میں کیا بتایا اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے میر داستان سن رہا تھا۔ اور جب میں اپنی بات کہہ چکا تو اس نے زور سے مجھے جھنجھوڑ ہوئے کہا۔

''تم جاگ رہے ہو نا خاقان؟''

''ہاں...... کیوں؟'' میں نے چونک کر آنکھیں پھاڑ دیں۔

''تمہاری آواز بالکل ایسے لگ رہی تھی جیسے تم خواب میں بول رہے ہو۔'' ورتنا نے مجھے یہ کہہ کر مزید چونکا دیا۔ میں خاموش نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ ورتنا جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ کچھ دیر وہ اسی طرح خاموش بیٹھا رہا اور اس کے بعد اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''دیکھو خاقان! ہمارا تعلق سری لنکا کے ایک ایسے قبیلے سے ہے جس کا اپنا ایک وقار ایک مقام ہے۔ ہم جسے دوست کہہ دیتے ہیں اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی تمہارے علم میں ہے کہ میں مذہباً بدھ ہوں اور میں نے اپنے قبیلے کی روایات کے مطابق بہت سی مذہبی تعلیمات کا جائزہ لیا ہے۔ مذہب اسلام کی طرح ہمارے ہاں بھی توہمات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں تمہیں پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات بتاتا ہوں کہ یہ محض ایک اتفاق ہے کہ تمہاری پیدائش تقریباً ویسے ہی حالات میں ہوئی ہے جیسے بھگوان بدھ کا جنم ہوا تھا۔ تم اس اتفاق سے کسی الجھن میں نہ پڑو۔ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ ویدوان سادھانی یا وہ دوسرا شخص جس کا نام تم نے سیوک سندھورتی بتایا ہے ان دونوں سے دور رہو تو کیا تم میرا کہنا مان لو گے؟ یہ دونوں تمہارے لئے بہتر ثابت نہیں ہوں گے۔ یہ میری پیشگوئی ہے۔''

میں حیرانی سے اجے ورتنا کی صورت دیکھتا رہا، پھر میں نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''اجے ورتنا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا، میں کیا مانوں اور کیا نہ مانوں۔ سیوک سندھورتی کی باتوں اور اس کی پیشگوئیوں نے میرا دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا ہے اور یہاں آنے کے بعد تو مجھے یوں لگنے لگا ہے جیسے میرا پورا سفر وردان سادھانی ہی کی طرف ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے وردان سادھانی کسی ایک انسان کا نام نہیں بلکہ یہ زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی ایک چمکدار دُھند ہے جو آہستہ آہستہ میرے بدن کے گرد لپٹتی جا رہی ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہئے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔''

اجے ورتنا ہمدردی کی نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''ایسا ہی ہوتا ہے۔ واقعی ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کبھی کبھی حالات انسان کو اسی طرح جکڑ لیتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں تجربے کی کوئی بات نہیں کہہ رہا لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اسی کی بنیاد پر یہ بات کہہ رہا ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ بدھ میں بھی ایسے کسی

وہم کا وجود نہیں ہے۔ ویسے تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو یہ بات۔ ہم واقعی اس وقت وردا سادھانی کے بالکل قریب ہیں اور رانگا پوری یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ ہمار یہاں سے تھوڑے قریب ہی ایک بستی ہے جہاں سے دشوار گزار پہاڑوں کا ایک را جاتا ہے۔ بستی کا نام مودنبے ہے۔ کسی زمانے میں اس راستے پر آمدورفت رہتی تھی ا محکمہ جنگلات کے لوگ یا جنگلی ہاتھی پکڑنے والے ادھر جا نکلتے تھے۔ مگر اس کے بعد وہا پے درپے حادثات ہونے لگے۔ بہت سے حادثات ہوئے ہیں وہاں اور لوگوں نے اد جانا چھوڑ دیا ہے۔ اسی راستے پر کافی دور جا کر پہاڑوں میں وردان سادھانی اور اس ک بدعقیدہ بھکشوؤں کا دھار ہے۔ بہت کم لوگوں نے وہ جگہ دیکھی ہے اور اس کی ایک وجہ بھی ہے کہ سال کے آٹھ مہینے ان پہاڑوں پر برف جمی رہتی ہے۔ میرے پتا نے بھی دو سے اس دھار کی عمارت دیکھی ہے پر قریب جانے کی ہمت کبھی نہیں کی اور اس کی وج وہاں کی روایات ہیں۔"

اجے ورتنا کے ان انکشافات نے میری دلچسپی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ٹھہرو اجے ورتنا! اپنی باتوں کی تشریح کرتے چلو۔ ابھی تم نے کہا تھا ک وردان سادھانی بدعقیدہ، بدمست ہے۔"

"ہاں...... ان لوگوں کے عقیدے ہمارے عقائد سے میل نہیں کھاتے بلکہ ہم اپ الفاظ میں انہیں کافر کہتے ہیں کیونکہ وہ بدھ مذہب سے بہت دور کی باتیں کرتے ہیں او وہ بھی بدھ مذہب کے عقائد میں لپیٹ کر۔"

"ٹھیک۔ تو تم کہہ رہے تھے کہ بہت کم لوگوں نے وہ جگہ دیکھی ہے۔"

"ہاں۔ وہاں برف جمی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ وہاں لوگوں کے نہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں جو ایک دفعہ چلا گیا، وہ یا تو دنیا کو ترک کر کے انہی گمراہ بھکشوؤں میں شامل ہو گیا یا پھر پاگلوں کی طرح واپس آیا، وہ صحیح دماغ نہیں رہتا۔" اجے ورتنا نے کسی قدر متاثر کن لہجے میں کہا۔

"آہ...... ان باتوں سے تو مسئلہ سلجھنے کی بجائے کسی قدر الجھ گیا ہے۔"

"بس۔ میں نے تمہیں جو مشورہ دیا ہے وہ ایک دوست کا مشورہ ہے۔ بہت ہی بہتر ہوگا تمہارے حق میں کہ تم ان الجھنوں میں نہ پڑو۔"

یہ سچ ہے کہ اجے ورتنا کی باتوں نے مجھے اور الجھا دیا تھا۔ بہرحال اس کے بعد میں

گھر واپس آ گیا۔ اجے کا گھر بہت ہی اچھا تھا، ایک مخصوص طرزِ تعمیر کا نمونہ۔ اور مجھے ایک ایسی جگہ دی گئی تھی جو مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتی تھی اور اس کا راستہ باہر سے ہی تھا۔ بہرحال میں کافی گم صم تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں سیوک کا منتظر تھا یا اس سے بھاگ کر کہیں دور چھپ جانا چاہتا تھا۔ واقعی اس وقت میرا ذہن میرے قابو میں نہیں تھا۔ اجے ورتنا کے مشورے نے مجھے اور پریشان کر دیا تھا۔ اتنا اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا کہ وہ انتہائی مخلص انسان ہے اور اپنی دانست میں اس نے مجھے غلط مشورہ نہیں دیا ہے۔ لیکن سیوک سندھورتی بھی اپنا ایک مقام رکھتا تھا۔ اجے نے مجھے جس جگہ ٹھہرایا تھا اس کی ایک کھڑکی ٹینس کورٹ کی طرف کھلتی تھی۔

کچھ دیر کے بعد اجے میرے پاس آ گیا۔ اس نے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں خاقان! میں تمہارے چہرے پر پریشانی کی جھلک نہیں دیکھ سکتا۔ تمہیں اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دینا چاہئے۔ ایک بہتر طریقہ یہ ہے کہ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دو۔ بہرحال حالات کوئی نہ کوئی مناسب فیصلہ کر لیں گے۔"

رات کے کھانے کے بعد وہ دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا اور ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "تمہاری آنکھوں میں بھی نیند اتر رہی ہے اور میں بھی سونا چاہتا ہوں۔ جاؤں؟"

"ہاں اجے، میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔ یہاں تم نے مجھے جیسے کمپنی دی ہے اور جس قدر محبت کا سلوک کیا ہے، میں اس کا بدلہ تمہیں کبھی نہیں دے سکتا۔"

"چھوڑو یار! میں اپنی محبت سے تمہیں لایا ہوں، ایسی باتیں نہ کرو۔ اچھا چلتا ہوں۔"

وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور میں بھی بتی بجھا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اور پھر بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ میری سوچ کا محور ورتنا سے کی ہوئی باتیں ہی تھیں۔ نجانے کب مجھے نیند آ گئی اور نجانے کتنی دیر سویا تھا کہ نیند ہی کی حالت میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے پکار رہا ہو۔ لیکن پکارنے والا مجھے اس نام سے نہیں پکار رہا تھا جس سے مجھے دنیا جانتی ہے یعنی خاقان جمشیدی۔ بلکہ میرے کانوں میں جو آواز اُبھر رہی تھی اور جو مجھے ہی مخاطب کئے ہوئے تھی، وہ لوک ناتھ، لوک ناتھ کی آواز تھی۔ کوئی مجھے لوک ناتھ کہہ کر پکار رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میرے کمرے میں نائٹ بلب جل رہا تھا۔ میری نگاہیں گھڑی پر پڑیں تو وہ ایک بجا رہی تھی۔

"دھم راج...... مہا وستو...... روانہ ہونے کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ ہمیں چلنا ہے مہاراج!" یہ آواز میرے کانوں تک پہنچی تو میں تڑپ کر بستر سے اٹھ گیا۔ میری نگاہیں اب کھڑکی کی جانب دیکھ رہی تھیں جو باہر کی جانب کھلتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میری کھڑکی سے لگا ہوا ایک سایہ سا کھڑا ہے۔ ایک لمحے کے لئے دل پر ایک عجیب سا بوجھ آ پڑا۔ مگر دوسرے لمحے میں جھپٹ کر کھڑکی کی طرف بڑھا تو اس سائے نے دونوں ہاتھ باندھ کر چوکھٹ پر اپنا ماتھا ٹکا دیا۔ میری نگاہوں نے ایک لمحے میں اسے پہچان لیا۔ یہ سیوک سندھورتی ہی تھا۔ لمحے بھر کے لئے میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کر تمام لوگوں کو اکٹھا کرلوں۔ اجے ورتنا کو پکاروں جو مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں آنے والوں کو بتاؤں کہ مجھے وردان سادھانی اور اس کے پیروکاروں سے بچاؤ۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں ان لوگوں سے بغاوت کا جذبہ ابھرا تھا، لیکن پھر نجانے مجھے کیا ہوا کہ میرا یہ جذبہ سرد پڑ گیا۔ میں ایک لمحے کے لئے سوچتا رہا اور پھر دوسرے لمحے میں دروازہ کھول کر اور ایک لمبا چکر کاٹ کر گھومتا ہوا آخر کار سیوک سندھورتی تک پہنچ گیا۔ سیوک سندھورتی نے بڑے عقیدت مندانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہی ایک بار پھر سجدہ کیا، اس کے بعد اٹھا اور بغیر کچھ کہے سنے میرا بازو پکڑ کر مجھے ایک طرف لے کر چل پڑا۔ مجھے حیرت تھی کہ میں سوچے سمجھے بغیر اور کسی تعارف کے بغیر اس کے ساتھ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ تصور کئے بغیر کہ میں کہاں جا رہا ہوں، کتنا فاصلہ طے کرنا ہے مجھے۔

اونچی نیچی ٹھیکریوں، وادیوں اور میدانوں سے گزرتے ہوئے میں سیوک سندھورتی کے ساتھ نجانے کب تک چلتا رہا۔ ہم دونوں کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم چل نہیں رہے بلکہ تیر رہے ہیں بلکہ اُڑ رہے ہیں۔ مجھے اس بات کا اندازہ تو نہیں تھا کہ ہم کتنی دور نکل آئے ہیں مگر اجے ورتنا نے جو نشانیاں بتائی تھیں انہیں یاد کر کے مجھے اندازہ ہوا کہ ہم مودنبے سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ آہ...... یہ انوکھا سفر میرے لئے ناقابل یقین تھا۔ گویا فضا کی پرواز ہمیں کسی جہاز سے زیادہ تیز رفتاری سے لئے جا رہی تھی۔ مودنبے نامی بستی پیچھے رہ گئی تھی اور اب ہم پہاڑی راستوں پر جا رہے تھے۔ رات کا پچھلا پہر، گھنے جنگلوں کا گزر اور پھر بلندیاں اور پستیاں جن پر چڑھتے اترتے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ فضا، یہ سناٹا ہمارے قدموں تلے ہو اور ہم اس پر پوری طرح قادر ہوں۔ ادھر سیوک سندھورتی منہ ہی منہ میں کچھ اشلوک پڑھتا جا رہا تھا۔ اب ہم جس

علاقے سے گزر رہے تھے اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں پر بہت سردی ہے مگر وہ سردی مجھے نہیں محسوس ہو رہی تھی اور اتنا چلنے کے باوجود تھکن کی بجائے میرے اندر ایک طرح کی توانائی اور سرشاری کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میں ہر بات سوچ رہا تھا، ہر تصور، ہر احساس میرے ذہن میں تھا۔ اپنی کیفیت کو بھی محسوس کر رہا تھا۔ اجے ورتنا کی بتائی ہوئی باتیں بھی میرے ذہن میں تھیں۔ ان راستوں کا بھی تعین کر رہا تھا جو انتہائی دشوار گزار تھے۔ لیکن کسی تکلیف اور پریشانی کے بغیر یہ سفر طے کر رہا تھا اور اس سے غیر مطمئن نہیں تھا بلکہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ ایک عجیب طرح کی فرحت میرے دل و دماغ پر تھی۔

مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ ہم کتنی بلندی پر ہیں یا رات کتنی گزر گئی ہے۔ آخر کار کچھ دیر کے بعد میں نے دیو قامت درختوں پر اِکا دُکا پرندوں کی چہچہاہٹ سنی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی مدھم مدھم روشنی بھی نمودار ہوتی جا رہی تھی۔ گویا صبح ہونے والی تھی۔ پھر ذرا اجالا ہوا تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا، اس وقت ہم پہاڑ کی جس دُشوار گزار چڑھائی پر چڑھ رہے تھے اس کے خاتمے پر دُھند میں مجھے ایک عمارت دھبے کی طرح نظر آئی۔ میں نے دیکھا کہ اس عمارت کے عقب میں پہاڑ ایک دیوار کی طرح سیدھا اُٹھتا چلا گیا ہے اور اتنا بلند ہے کہ اس کی چوٹی بادلوں میں چھپ گئی ہے۔ ادھر سیوک سندھورتی کی بڑبڑاہٹ بھی اب کچھ بڑھتی جا رہی تھی اور اس کی آواز اب بلند ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً کوئی پراسرار منتر پڑھ رہا تھا اور اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

سنگھا شرنا گچھالی یعنی میں سونڈ یا جماعت کی پناہ میں آتا ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ یہی پُرجلال، ہیبت ناک اور آسمان سے باتیں کرتی ہوئی پُرشکوہ عمارت مہمان بھکشو وردان سادھانی کی دھار تھی۔ میں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں اور خاص طور سے اب سری لنکا میں بھی بہت سے بدھ دھار دیکھے تھے لیکن وردان سادھانی کا دھار ایک عجیب عمارت تھی بلکہ اسے عمارت کہنا بھی مناسب نہیں ہے۔ پہاڑ کی ایک ٹھوس چٹان کو تراش کر قدرتی غار کے دہانے کو بہت بڑی محراب کی شکل دے دی گئی تھی۔ محراب سے گزر کر ایک طویل غلام گردش تھی جس کی چھت پر ایک آدھا گنبد نظر آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس باقی آدھے گنبد کا حصہ پہاڑ نے نگل لیا ہو۔ دھار کا اندرونی حصہ سرنگوں اور گپھاؤں پر مشتمل تھا۔ چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر چھوٹے بڑے حجرے بنائے گئے تھے۔ یقیناً ان

حجروں میں وردان سادھانی کے بھکشو یا پجاری رہتے ہوں گے۔ ہم جب کشادہ اور اونچی نیچی ناہموار سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اس عمارت کے چبوترے تک پہنچے تو میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا جس کی کمر بہت زیادہ جھکی ہوئی ہے، اس عظیم الشان محراب سے گزر کر لکڑی ٹیکتا ہوا ہماری طرف آ رہا ہے۔ وہ گیروا لباس اور کھڑاویں پہنے ہوئے تھا۔ جب وہ کچھ اور قریب آیا تو میں نے دیکھا اس کی سفید اور گھنی بھنویں اس کی آنکھوں پر جھکی پڑ رہی ہیں لیکن آنکھوں میں سفید روشنی تھی اور ان سے سفید چمک نکلتی معلوم ہوتی تھی۔ جھریوں نے اس کے چہرے اور بدن پر جال سا بن رکھا تھا۔ اس کا چہرہ داڑھی مونچھوں سے بے نیاز تھا اور سر انڈے کے چھلکے کی طرح صاف۔ وہ بے شک لاٹھی ٹیک کر چل رہا تھا لیکن سنگین فرش پر اس کے قدم ایسی دھمک کے ساتھ پڑ رہے تھے جیسے کوئی بہت ہی وزنی شے چلی آ رہی ہو۔ ساتھ ہی اس کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ اس کی عمر دو سو سال یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہو گی تو دیکھنے والا اس بات پر فوراً یقین کر لیتا۔ اس کی کیفیت سے ایسا ہی احساس ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر راہبوں کا سا سکون اور مجسمے جیسی سنگینی کا ایک عجیب ملا جلا تاثر تھا۔ آخر کار وہ ہم سے کچھ فاصلے پر رُکا۔ اور جب اس نے پلکیں اٹھا کر میری طرف نگاہ کی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی گزری ہوئی صدی کے غبار میں سے مجھے دیکھ رہا ہو۔ کچھ لمحے وہ اسی طرح خاموش کھڑا مجھے دیکھتا رہا اور اس کے بعد اس کی انتہائی مکروہ اور کانوں کو چبھنے والی آواز سنائی دی۔

''دھم راج، دھم راج، بودھی ستو......''

اور اس کے بعد اس نے اپنی لکڑی زمین پر پھینک دی اور دونوں ہاتھوں کو پیشانی سے لگا کر سجدے میں گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی سیوک سندھورتی بھی میرے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ میں درحقیقت اس وقت نیم خوابیدہ کیفیت میں تھا۔ سب کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے ایک طویل خواب ہو اور میں یہ خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرے ذہن میں اب بھی لاتعداد سوچیں گردش کر رہی تھیں اور یہ خیال میرے ذہن سے گزر رہا تھا کہ کیا واقعی میں ان انوکھے بھکشوؤں کا اوتار ہوں۔ آخر کیا ہے یہ سب۔ کوئی کھیل یا پھر سچ مچ کی حقیقت؟ آہ...... اس وقت میرا ایمان ڈانواں ڈول ہو رہا تھا اور سچی بات یہ تھی کہ کوئی بھی میری پشت پر ہاتھ رکھ کر یہ کہنے والا نہیں تھا کہ خاقان! تیرا مذہب کچھ اور ہے، تیرا منصب کچھ اور ہے۔ وقت کے یہ دھارے مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟ یہ تو شیطانی ٹولہ ہے۔ یہ تو

شیطانوں کا نشیمن ہے۔ ایک شیطانی طلسم کدہ جہاں مذہب سے بھٹکانے والوں کا ایک پورا گروہ موجود ہے۔ یہ تجھے آسمان کی مخلوق قرار دے رہے ہیں۔ تو ایک مسلمان ہے۔ شیطان اگر ایک صاحب ایمان کو بہکا لے تو اپنے طور پر وہ بے حد خوشی محسوس کرتا ہے۔

بہرحال چند لمحوں کے بعد وہ دونوں اٹھے اور میرے دائیں بائیں آ گئے۔ پھر دونوں نے اپنی چادروں کے گوشے اپنے بازوؤں پر ڈالے اور میرے ہاتھ تھام کر مجھے دھار میں لے چلے۔ راہداری میں داخل ہونے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ غار کا ایک اندرونی حصہ جو دور سے تاریک دکھائی دیتا ہے، درحقیقت اتنا تاریک نہیں ہے۔ کسی ایسی نامعلوم جگہ سے ہلکی ہلکی دودھیا روشنی سرنگوں کی ان بھول بھلیوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ راہداری سے گزر کر ہم جب سب سے بڑی اور مرکزی سرنگ میں پہنچے تو مجھے شہد کی مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ کی آواز سنائی دی۔ جوں جوں قدم آگے بڑھتے چلے گئے، یہ آوازیں نمایاں ہوتی چلی گئیں۔ اور کچھ لمحوں کے بعد ان آوازوں کا راز مجھ پر کھلا۔ بہت سے مرد اور عورتیں بڑے سوز و گداز سے کچھ پڑھ رہے تھے۔ ایک بار پھر مجھے اپنے بدن میں شدید سردی کا سا احساس ہوا۔ ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہریں دوڑنے لگیں اور میں اپنے بدن کی لرزشوں پر قابو نہیں پا سکا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ آوازیں میرے ذہن کے ہر گوشے پر چھاتی جا رہی ہوں۔ آوازیں اب اور واضح ہو گئی تھیں۔ بے شمار بھکشو اور پجارنیں شرن مگن کا جاپ کر رہی تھیں۔ الفاظ نمایاں تھے۔

بدھاں شرنا گچھامی...... دھماں شرنا گچھامی...... سنگھاں شرنا گچھامی۔ مطلب بھی خود بخود میرے ذہن میں واضح ہو رہا تھا۔ یعنی میں بدھ دھرم اور جماعت کی پناہ میں آتا ہوں۔ بہرحال یہ آوازیں نمایاں ہوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ ہم سرنگ کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں سے یہ آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے اندازہ پہلے ہی ہو چکا تھا کہ یہ حجرے بھکشوؤں سے آباد ہیں۔ ہم ان آوازوں کے درمیان سے گزرتے رہے یہاں تک کہ یہ آوازیں پیچھے رہ گئیں۔ ہر دس بیس قدم کے بعد ہمیں ناہموار سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ سرنگ اونچائی کی طرف جا رہی ہے۔ اچانک ہی مجھے اپنے بدن پر نمی کا سا احساس ہوا اور میں نے کہیں دور سے پانی گرنے کا شور سنا۔ یہ آواز ایک یکساں حیثیت سے آ رہی تھی۔ مزید کچھ فاصلہ طے ہوا اور ہم کسی ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے دو راستے پھوٹتے تھے۔ یہاں ان دونوں بھکشوؤں نے دائیں بائیں راستے کی طرف

مڑ کر مجھے تعظیمی اشارے کئے اور آخر کار بائیں طرف کی سمت اختیار کی۔ مجھے تو خیر ان کے ساتھ چلنا ہی پڑ رہا تھا۔ ویسے یہ اندازہ مجھے بخوبی ہو گیا تھا کہ پانی گرنے کی آواز بائیں سمت سے آ رہی ہے۔ اس عمارت کا یہ حصہ سب سے زیادہ روشن تھا اور یہاں سرنگ بھی بہت بلند ہو گئی تھی۔

ہم مزید کچھ آگے بڑھے تو سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا مجھے چھوتا ہوا گزر گیا۔ اس سے اندازہ یہ ہوتا تھا کہ جہاں سے پانی کی دھار بہہ رہی ہے یعنی جو آبشار یہاں پہاڑوں میں بہہ رہا ہے ہم اس کے قریب پہنچ چکے ہیں۔

اچانک ہی یہ سرنگ کچھ دور جانے کے بعد دائیں طرف مڑ گئی اور میں نے دیکھا کہ ہم ایک بہت بڑے قدرتی ہال کی دہلیز پر کھڑے ہوئے ہیں۔ میری نگاہوں کے سامنے تقریباً پچاس فٹ کی بلندی سے چشمہ کا پانی ہال کے وسط میں ایک ناہموار چٹان پر گر رہا تھا اور ایسی گونج پیدا ہو رہی تھی کہ مجھے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ ان دونوں بھکشوؤں نے اب بلند آواز سے کچھ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن آبشار کی آواز اتنی تیز تھی کہ اس کے شور میں ان کے الفاظ بالکل سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ اس کے بعد بوڑھے نے سیوک سندھورتی کو اسی طرح کا اشارہ کیا اور سیوک سندھورتی نے بڑے ادب سے گردن جھکا کر کہا۔

''جو حکم وردان سادھانی!''

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ تو یہ بوڑھا ہے وردان سادھانی۔ بے شک اس کی عمر کا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جھریوں میں لپٹا ہوا لیکن اتنا حیرت انگیز کہ یقین نہ آئے۔ بہرحال وردان سادھانی نے سیوک سندھورتی کو کوئی اشارہ کیا اور سیوک سندھورتی نے اپنی چادر کا ایک کونا پھاڑ کر دو رومال سے بنائے۔ ایک سے اس نے وردان سادھانی کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور دوسرا رومال اپنی آنکھوں پر باندھ لیا۔ پھر اس نے میرے بہت قریب آ کر بلند آواز میں کہا۔

''دھم راج...... اس بدھ کے مقدس چشمے میں راستے کی دھول دھو ڈالئے۔ مہان بھکشو وردان سادھانی اور میں نے اپنی ظاہری آنکھیں بند کر لی ہیں اور اپنے اندر دیکھنا شروع کر دیا ہے۔''

کچھ عجیب سے الفاظ تھے جن کے بارے میں، میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ یہ کیا

کہہ رہا ہے۔ اس کے بعد میری نگاہیں سامنے کی جانب اُٹھ گئیں۔ میں نے دیکھا کہ جہاں ہم کھڑے ہیں، وہاں چٹان میں چار پانچ سیڑھیاں تراش کر جانے کا راستہ بنا ہوا ہے۔ دونوں بھکشو آنکھوں پر پٹی باندھے اور ہاتھ باندھے ساکت و جامد کھڑے ہوئے تھے۔ گویا وہ چاہتے تھے کہ چشمے کے پانی سے نہا کر میں سفر کی تھکن اور گرد صاف کر لوں۔ ایک سب سے انوکھی بات یہ تھی کہ اب تک انہوں نے جو کچھ چاہا تھا اور جو کچھ مجھ سے کہا تھا میں آنکھیں بند کر کے ان کے کہے پر عمل کرتا رہا تھا اور کہیں بھی میرے اندر مدافعتی کیفیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ گویا میرے دل و دماغ تو بے شک میرے قبضے میں تھے اور میرے احساسات میرے اپنے تھے۔ لیکن میرا پورا وجود ان کے سامنے ایک معمول بنا ہوا تھا۔ چنانچہ اس پر بھی میں نے اعتراض نہیں کیا اور کسی معمول کی طرح ہی اپنے کپڑے اتارے اور سیڑھیاں اتر کر اس چٹان کے پاس جا کھڑا ہوا جس پر آبشار کا پانی زور و شور سے گر رہا تھا۔ میں عام حالات میں پچاس فٹ اونچائی سے گرنے والی پانی کی چادر کے نیچے جانے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن نجانے کون سی طاقت مجھے آگے بڑھنے کے لئے اکسا رہی تھی اور میں یخ بستہ پانی کی چھینٹیں بدن پر سہتا ہوا اس چٹان کے پاس جا پہنچا جہاں صدیوں کی کائی جمی ہوئی تھی۔ کسی سحر زدہ انسان کی سی حرکتیں کرنے کے باوجود مجھے غیر شعوری طور پر اس بات کا ضرور احساس تھا کہ میں موت کی جانب بڑھ رہا ہوں اور اس کے چنگل سے بچنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اور اگر میں حیاتِ ابدی سے ہمکنار ہونے والا ہوں تو میرا یہ عمل میری مرضی کے مطابق نہیں ہے۔

میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ میں وہ سب کچھ کر گزرنے پر تیار ہوں جو یہ لوگ مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ آہ...... اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میرا ذہن مجھے خوف کا احساس دلا رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ میں کسی چنگل میں پھنسا ہوا ہوں۔ لیکن میرا سارا وجود ان کی آواز کے تابع تھا۔ میں کچھ نادیدہ اور پراسرار قوتوں کے ہاتھوں میں ایک بے جان پتلا بن کر رہ گیا تھا۔ میرے قدم میرے خوف کے باوجود اس چٹان کی جانب بڑھے تھے اور میں چٹان پر جا پہنچا تھا۔ لیکن حیرت ناک بات یہ تھی کہ اس کائی سے جس پر انسان تو کیا اگر کوئی مکھی بھی جا کر بیٹھ جائے تو اپنے قدم نہ جما سکے، لیکن کائی سے بھری سخت چٹان پر میرے قدم ایک لمحے کے لئے بھی نہیں پھسلے اور اب آبشار کا بے پناہ شور جیسے میرے پورے وجود میں گرج رہا تھا۔ میری نگاہیں نیچے کی طرف اٹھ گئیں تو میں نے

دیکھا کہ آبشار کا پانی نیچے ایک جگہ جمع ہو رہا ہے اور اس جگہ قیامت کے بھنور پڑ رہے ہیں۔ لیکن اس کے بعد پتہ نہیں چل رہا تھا کہ پانی کہاں جا رہا تھا۔

میرے دل و دماغ پر عجیب سی کیفیت چھائی ہوئی تھی اور سوچ کا یہ دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا کہ پانی کی ان ہولناک ضربوں نے میرے جسم کے چیتھڑے کیوں نہیں اڑا دیئے؟ اور پگھلی ہوئی اس برف کے آبشار میں میری موت کیوں نہ واقع ہو گئی۔ یہ پانی تو اتنا سرد تھا کہ اگر اس میں پتھر کو بھی ڈال دیا جائے تو وہ جم جائے۔ لیکن میرے جسم کو اس پانی سے ایک عجیب طرح کی لطافت کا احساس ہو رہا تھا اور ایک عجیب سی کیفیت میرے سارے وجود میں اترتی جا رہی تھی۔

زمین دوز ہال کی دہلیز پر وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی دست بستہ مجسموں کی طرح بے حس و حرکت کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس حیات بخش آبشار کے نیچے ساری زندگی اسی طرح کھڑا رہوں۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں سیوک سندھورتی نے میرے بارے میں جو حیرت ناک انکشاف کیا تھا اور جسے میرے شعور نے آج تک تسلیم نہیں کیا تھا، اس وقت مجھے ایک آسمانی حقیقت معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے یہی لگ رہا تھا کہ میں واقعی مہتر بدھ کا آسمانی روپ ہوں، میں ان کا بودھی ستو ہوں، میں اس غار میں رہنے والے بے شمار بوڑھوں کا نجات دہندہ ہوں اور ان کو نجات دلانے والا بدھ ہوں۔ خاقان جمشیدی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یا پھر ہے تو وہ صرف ایک قالب ہے جسے مقدس روح نے اپنا مسکن بنایا ہے۔ خاقان جمشیدی درحقیقت مہتر بدھ ہے، بودھی ستو ہے اور اس کا دوسرا روپ خاقان جمشیدی ہے یا پھر اس کا اصل روپ موجود ہی نہیں ہے۔ وہ تو صرف ایک خیال، ایک تصور ہے۔

میرے ذہن میں مسلسل خیالات کی چرخی چل رہی تھی۔ وہ گھر جہاں میرے دوست اجے ورتنا نے مجھے ٹھہرایا تھا، بس ایک آرام گاہ تھی میرے لئے، ایک راستہ تھا جس سے یہاں تک آنا تھا۔ اور اس وقت میری روح وردان سادھانی کے حلقہ ارواح میں شامل ہونے یہاں تک پہنچی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں ایک روح نہیں بلکہ ایک زندہ انسان ہوں۔

مجھے اپنے صحت مند ورزشی جسم پر تیز پانی کی دھاریں پڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس پانی میں کلیلیں کروں۔ میں نے کسی کھلنڈرے بچے کی طرح چلو میں پانی بھر کر پیا۔ اتنا مزیدار پانی کہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حالانکہ میں شراب

سے ناواقف تھا۔ لیکن اس آبشار کا پانی مجھے لطیف اور سرور انگیز شراب کی طرح خوش ذائقہ اور نشہ آور محسوس ہوا۔

پھر اچانک میرے کانوں میں کسی نے سرگوشی کی اور کچھ نامانوس الفاظ میں کچھ کہا گیا۔ یہ آواز نہ تو وردان سادھانی کی تھی اور نہ ہی سیوک سندھورتی کی بلکہ ایک اجنبی آواز تھی۔ میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ آواز پھر میرے کانوں میں آئی اور نجانے کیا ہوا کہ میں نے یونانی دیوتاؤں کی طرح اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے اور اپنے سینے کی پوری طاقت سے پکار کر کہا۔

"انیک دکھ سادھانی! نمو آزت نمو بدھا۔" یہ دنیا فانی دُکھوں سے بھری ہوئی ہے اور غیر حقیقی ہے اور سچا نام بدھ کا ہے۔

میری آواز آبشار کے بے پناہ شور کو تلوار کی طرح کاٹتی ہوئی جیسے پہاڑوں کے جگر میں اُترتی چلی گئی اور یقینی طور پر یہ آواز وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی نے بھی سنی اور دونوں کے حلق سے آواز نکلی۔

"نموستو......نمو بدھا"

تب میں نے ایک عجیب بات دیکھی، وہ یہ کہ آبشار کا پانی اور ہلکا ہوتا گیا۔ اور پھر صدیوں سے پہاڑ کے جگر میں بہنے والا یہ مقدس چشمہ آخر کار رک گیا اور سرنگوں کی بھول بھلیوں سے گزرتی ہوئی خاصی ہلکی لیکن واضح آواز سنائی دی۔ یہ ساگر کے بھکشوؤں اور بھکشونیوں کی آواز تھی جو ایک ساتھ دوہرا رہے تھے۔

"نموست......نمو بدھا"

اور مجھے یوں لگا جیسے میری حیثیت بالکل بدل گئی ہو۔ میں کسی روحانی فتح مندی کے سے غرور میں جھومتا ہوا چٹان پر سے اتر آیا اور ان دونوں کی جانب بڑھا جو بدستور مؤدب مجسموں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے میرے قدموں کی چاپ سنی اور دونوں رکوع کے انداز میں جھکے اور دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا ہوا ہال سے باہر آ گیا۔ اس وقت میں ایک دیوتاؤں جیسی برہنگی میں ان کی رہنمائی کر رہا تھا اور وہ اس اندھے سفر میں میرے قدموں کی آہٹ پر میرے پیچھے چلے آ رہے تھے۔

سرنگ کے اس حصے میں پہنچ کر جہاں سے دو راستے کھلتے تھے، میں رُک گیا۔ دونوں

بوڑھوں نے پہلے کی طرح اس دوسرے راستے کی طرف منہ کر کے تعظیمی اشارے اور میں اس دوسری سرنگ میں داخل ہو گیا۔ تین چار قدم چل کر رکا، سرنگ کی سنگیں میں ایک تاک بنا ہوا تھا جس پر گیروے رنگ کی ایک بڑی سی گٹھڑی رکھی ہوئی تھی۔ نے ایک گٹھڑی اٹھائی، کھول کر دیکھا تو یہ تین کپڑے تھے۔ ایک لنگوٹ، ایک تہد اور ا لمبی سی چادر۔ میں نے لنگوٹ پہن کر تہد باندھا، اس لمبی چادر کو پاؤں سے لپیٹا اور با کندھے پر اس طرح ڈال لیا کہ میرا داہنا کندھا کھلا رہا۔ یہ کپڑے پہن کر میں دونوں بھکشوؤں کو دیکھا، وہ اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹیاں کھول رہے تھے۔ پتہ انہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں کپڑے پہن چکا ہوں۔ یہ واقعات اس قدر عجیب و غریب اور پے درپے ہو رہے تھے کہ میرا اپنا ذہن تو کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ میں اس بات کو اہمیت نہیں دی لیکن مجھے اس لباس میں دیکھ کر وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی کے چہروں پر بڑی گہری مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے محبت بھرے انداز آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ میں ابھی ننگے پیر تھا اور وہ دونوں کھڑاویں پہنے ہوئے تھے۔ جب ہم دو قدم آگے چلے تو ان دونوں نے بھی اپنی کھڑاویں اتار دیں آگے سرنگ بتدریج بلند ہو رہی تھی۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں اور آگے چل کر تو مسلسل سیڑھیاں شروع ہو گئیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پہاڑ کے اندر ہی کوئی مینارا ہے جس پر چڑھتے جا رہے ہیں۔ پھر یہ سیڑھیاں ختم ہو گئیں اور بائیں جانب مڑ کر ایک بڑے حجرے میں ہمارے اس سفر کا اختتام ہوا۔ یہ حجرہ آبشار والے غار سے زیادہ طویل و عریض اور بہت روشن اور ہوا دار تھا۔ ہم جس دروازے سے داخل ہوئے تھے اس کے علاوہ حجرے میں دائیں اور بائیں دوسرے دروازے بھی تھے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا، چاروں طرف روشن دان تراشے گئے تھے جن میں کہیں کہیں سے آسمان نظر آتا تھا۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ ہم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے ہیں۔ جس دروازے سے ہم داخل ہوئے تھے اس دروازے کے عین سامنے چبوترے پر ایک عظیم الشان مجسمہ نصب تھا۔ اسے بھی چٹان ہی سے تراشا گیا تھا۔ حجرے کا یہ حصہ کچھ تاریک تھا اور مجسمے کے نقوش واضح نظر نہیں آ رہے تھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ وردان سادھانی اور سیوک، مجسمے کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ پھر سادھانی اپنی جگہ سے اٹھا اور لکڑی ٹیکتا ہوا دیوار کے پاس گیا۔ کسی زنجیر کے

کھڑکھڑانے کی آواز سنی گئی اور ایک زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ حجرے کی آدھی چھت اپنی جگہ سے کھسک گئی۔

اب سورج کی روشنی براہِ راست مجسمے پر پڑنے لگی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے جو کچھ دیکھا، اسے دیکھ کر پہلی بار میرے حواس واپس آئے۔ میں حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا اور میرے منہ سے ایک دبی ہوئی چیخ نکل گئی۔ یہ مجسمہ بدھ کے مجسمے کی طرح آسن جمائے بیٹھا تھا۔ وہ آلتی پالتی مارے ہوئے تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے استغراق کے عالم میں تھے۔ لیکن جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ مورتی کا بدن اور آسن بدھ کا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ...... اُس کا چہرہ میرا چہرہ تھا...... سو فیصدی میرا چہرہ۔ اور اس چہرے کو دیکھ کر میں اس قدر حیران ہوا کہ ایک لمحے کے لئے میرا ذہن اس طلسم سے آزاد ہو گیا اور میں پھر اپنے وجود میں واپس آ گیا یعنی خاقان جمشیدی......!

※☆※

مجھے یوں لگا جیسے میں کسی پہاڑ کی بلند چوٹی پر چڑھتے چڑھتے پھسل پڑا ہوں اور برق رفتاری سے لڑھکتا ہوا، پہاڑ کی چٹانوں سے ٹکراتا ہوا نیچے جا رہا ہوں۔ نیچے...... اور نیچے...... اور نیچے۔ لیکن پھر مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے اپنے دونوں بازوؤں میں سنبھال لیا ہو اور ایک عجیب و غریب خوشبو میرے سارے وجود میں تیر گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی کے گھنیرے بال میرے چہرے کو چھو رہے ہوں۔ ایک لمحے کے لئے میری آنکھیں بند ہوئیں، لیکن پھر میں نے فوراً ہی آنکھیں کھول دیں۔ ایک نرم و گداز وجود مجھے اپنے آپ میں سموئے ہوئے تھا۔ میں نے گھبرا کر اس چہرے کو دیکھا۔ یہ چہرہ بھی اجنبی نہیں تھا، کلاڈیا...... کرنل صغیر کی بیٹی کلاڈیا۔ ایک غیر ملکی ماں کی اولاد۔ لیکن عجیب و غریب خیالات کی حامل یہ تمام کیفیت لمحوں میں گزر گئی۔ اور دوسرے لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میری گردن پکڑ کر مجھے جھنجھوڑ دیا ہو۔ میں ان خیالات سے چونکا۔ آہ...... کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، کون سی حقیقت ہے اور کون سا فریب۔ آپ مجھ جیسے کسی انسان کا تصور کریں جو اچھی خاصی شخصیت کا مالک ہونے کے باوجود بچپن ہی سے زندہ طلسمات میں گھرا ہوا ہو۔ درحقیقت میں زندہ طلسمات کا شکار تھا۔ میرے سامنے میری پتھر کی مورتی ایستادہ تھی۔ اپنا بدھ دیکھ کر اور وہ بھی اس انداز میں جس قدر حیرت ہو سکتی ہے، اتنی حیرت ہوئی

تھی۔ تب میں نے آنکھیں گھما کر سادھانی اور سندھورتی کو دیکھا۔ دونوں ہاتھ باند گردن جھکائے کھڑے تھے۔ میرے ہاتھ بے جان سے انداز میں اٹھے۔ میں ا مخاطب کر کے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میں نہ کہہ سکا۔ بے بسی کی نگاہوں سے میں چاروں طرف دیکھا اور پھر میری نگاہ سامنے والی مورتی کے چبوترے پر پڑی۔ چبوتر کے نیچے ایک چوکی سی نظر آئی جس پر گیروے رنگ کا ایک کپڑا پڑا ہوا تھا۔ وردان نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر بڑے ادب سے مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"بودھی ستو...... دھن راج، اس سنگھاسن کا سُونا پن آپ کے آنے کے بعد ختم ہو گ آئیے، اس سنگھاسن پر پدھاریئے۔" اس نے چوکی کی طرف اشارہ کیا۔ میرے بدن تار، میرے جسم کا ہر عضو جیسے آواز کے تاروں سے بندھا ہوا تھا۔ دماغ کسی بھی طر جائے، ذہن کچھ بھی سوچے، کرنا مجھے وہ پڑ رہا تھا جو ان میں سے کوئی کہتا تھا۔ میں آ آہستہ چلتا ہوا چوکی کی طرف بڑھا اور بیٹھ گیا۔ دونوں بھکشو آگے بڑھ کر میرے قدم میں دو زانوں بیٹھ گئے تھے۔ ان کے بیٹھتے ہی حجرے کے دائیں اور بائیں درواز تاریکی میں شرن گول کی پُرسوز آوازیں بلند ہونے لگیں۔ گیروے رنگ کے لباس پہنے، جھکائے اور ہاتھ باندھے ایک جانب سے بھکشو اور دوسری طرف سے بھکشونیاں قطار قطار حجرے میں داخل ہونے لگے۔ وہ بڑے سُوز کے ساتھ آواز ملا کر وہی تین بول رہے تھے۔

"بدھاں شرنا گچھامی۔ دھماں شرنا گچھامی۔ سنگھاں شرنا گچھامی۔"

ان کی تعداد بے شمار تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں پورا حجرہ ان سے بھر گیا۔ یہ سارے سارے سنگھاسن کے سامنے پہنچ کر سجدے میں گر گئے۔ کچھ دیر اسی طرح پڑے رہے ا پھر اسی ترتیب سے بیٹھتے چلے گئے۔ جب پورا حجرہ بھر گیا تو وردان سادھانی میری طرف بڑھنے لگا اور میری جانب پشت کئے بغیر چبوترے کے ایک جانب لاٹھی ٹیک کر کھڑا گیا۔ وہ پہلے بھنبھناتی آواز میں کچھ بڑبڑاتا رہا، پھر اس نے ایک نامانوس زبان میں کچ کہنا شروع کر دیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ ہاتھ باندھ کر تعظیماً میری طرف جھک اپنی گمبھیر آواز میں کچھ کہتا۔ اور آخر اپنی تقریر ختم کر کے وہ میری جانب بڑھ آیا۔ جھک میرے پیروں کو بوسہ دیا اور پھر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اٹھتے ہی تمام لوگ کھڑ ہو گئے اور عجیب و غریب کیفیت میں ایک گیت گانا شروع کر دیا۔ یہ گیت کوئی بھجن معلو

ہوتا تھا۔ گیت کے بول میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ لیکن مردوں اور عورتوں کی آواز میں ایسا خلوص اور مٹھاس تھی کہ میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور میں نے خود کو اس موسیقی کی لہروں پر بہنے کے لئے چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ غیر محسوس طریقے سے آوازیں ہلکی ہوتی چلی گئیں اور گیت ختم ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو پورا ہال یا حجرہ خالی تھا۔ میرے سامنے ہی سادھانی کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر اس نے گلا صاف کیا اور بولا۔

"لوک ناتھ! جہان بھکشوؤں کے سنگ نے اور یشوسنگ کی بھکشونیوں اور ان سب کے داس یعنی وردان سادھانی نے دیکھا اپنی آنکھوں سے اور ہم سب جان گئے کہ آپ ہی دھم دیول ہیں، بودھی ستو ہیں، مہتر بدھ کا دیہانی روپ ہیں۔"

اس نے اس دیو ہیکل مورتی کی طرف ہاتھ پھیلا دیئے جس کا چہرہ میرا تھا اور بدن پتہ نہیں کس کا اور پھر بولا۔

"آپ ہی وہاں ہیں اور آپ ہی یہاں ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھے۔ پھر اس نے ایک ہاتھ بلند کیا اور اسے فضا میں گردش دے کر کہا۔ "اور آپ ہی چاروں کھونٹ ہیں۔"

میں چوکی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا اس کا یہ قصیدہ سنتا رہا۔ وہ دیر تک اسی طرح بولتا رہا۔ اس نے دلیلیں، شہادتیں اور مثالیں دیں، اپنے ایک ایک بیان کی تائید میں مذہبی کتابوں اور روایتوں کے حوالے دیئے۔ اس کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ میں یعنی خاقان جمشیدی اس فرقے کے عقیدے کے مطابق وہ آخری بدھ ہوں جس کا تذکرہ تاریخ میں صدیوں سے ہے۔ میں ابھی بودھی ستو کی منزل میں ہوں اور آج کے بعد سے میرا ہر قدم تکمیل کی طرف اٹھے گا۔ وہ دن بہت جلد آنے والا ہے جب میں گیان حاصل کرنے کے بعد اپنے مہتر بدھ یعنی بدھ ہونے کا اعلان کروں گا اور سادھانی کے بھکشوؤں اور بھکشونیوں کی اس جماعت کو لے کر خانقاہ سے اٹھوں گا اور ساری دنیا پر اس مذہب کا پیغام پھیلا دوں گا۔ وردان سادھانی نے کہا۔

"اور بودھی ستو! تکمیل کی منزل تک پہنچنے کے لئے تمہیں بہت سی ریاضتیں بھی کرنا پڑیں گی۔ جن میں تم برائیوں اور نیکیوں کے ساتھ ساتھ سفر کرو گے۔ ان میں نیک کام بھی ہوں گے اور کچھ ایسے کام بھی جنہیں انسان برا سمجھتا ہے۔ نیک ریاضتوں میں محبت،

ہمدردی، خوشی اور اطمینان کے دھیان کرنا ہوں گے اور بدی کی ریاضتوں میں اشبھ بھاوناؤں یا منحوس دھیان کی مشق کرنا پڑے گی۔ اس ریاضت کا طریقہ یہ ہوگا کہ کسی ایسی لاش پر دھیان دیا جائے جو نیلی پڑ گئی ہو اور جس میں سوراخ ہوں یا جس کا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہو یا جس میں سے خون بہتا ہو یا پھر جو محض ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو۔ اس پر اشلوک پڑھے جائیں گے۔ جب یہ اشلوک مکمل ہوں گے تو ایسی کسی لاش میں کوئی جسم حرکت کرتا ہوا دکھائی دے گا۔ یہی بدن اپنے شریر میں منتقل کیا جائے گا اور جب وہ زندہ ہو کر تمہارے وجود میں پیوست ہو جائے گا تو تمہارا یہ بدی کا عمل مکمل ہو جائے گا۔ اشبھ بھاونا چارن نیک بھاوناؤں کی تکمیل کے بعد کرنا ہو گی ورنہ اس اشبھ بھاونا کے بھیانک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔“ آخر میں اس کا لہجہ خوفناک ہو گیا اور اس کی آواز اُبھری۔

”دھم راج! آپ نے تو اپنے دل میں جان لیا تھا کہ آپ وہی ہیں جو آپ ہیں۔ مگر کسی نے آپ کو سچ سے دور رکھنا اور بہکانا چاہا۔ سو وہ بہکانے والا اب کہیں کا نہیں رہے گا۔ کہیں کا نہیں رہے گا وہ۔ سنا...... اشبھ بھاوناؤ، ہنسا ارتیشاء کے پیروکارو! جس نے مہتر بدھ کو بہکایا وہ اب کہیں نہ ہو۔“

یہ الفاظ کہتے وقت سادھانی کا چہرہ اتنا بھیانک ہو گیا کہ اس پر نگاہ نہ جمائی جا سکے۔ اس کے یہ الفاظ اور یہ کیفیت میری سمجھ میں نہ آ سکی تھی۔ میں کسی سحر زدہ انسان کی طرح اس کی آواز سن رہا تھا۔ اس نے اچانک ہی بولنا بند کر دیا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا میری مورتی کے پہلو میں جا کھڑا ہوا۔ وہ نامعلوم زبان میں کچھ کہتا جا رہا تھا۔ جب وہ مورتی کے پاس سے واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں گیروے رنگ کے بوسیدہ کپڑے میں کوئی چیز تھی۔ میرے قریب آ کر اس نے اس پلندے کو سر پر رکھا، بوسہ دیا اور بڑی احتیاط کے ساتھ اس کپڑے کی تہیں کھولنا شروع کر دیں۔ اس پلندے سے عجیب و غریب مہک اٹھ رہی تھی۔ کپڑے کی ساری تہیں کھلیں تو اس میں سے تمباکو کے پتے کی طرح ایک خوشبودار پتا نکلا۔ اس کی سطح کیلے کے تنے کی طرح چکنی اور ہموار تھی اور اس کی رنگت تانبے کی طرح تھی۔ سادھانی نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا پھر آنکھوں سے لگا کر میری طرف بڑھا دیا اور کہنے لگا۔

”دھم راج! یہ جنموں کے بھید کھولنے والا بھوج پتر ہے۔ شاکیہ منی گوتم کے نروان پانے کے بعد سیانوں نے اسے کوشی نگر سے دھرم شالہ پہنچا دیا تھا۔ پرانی پوتھیوں میں لکھا

ہے اور مہان سیوکوں کے بھکشوؤں نے ایک دوسرے کو یہ بات پہنچائی ہے کہ ایک دن مہتر بدھ یہاں آئے گا اور جنموں کے بھید کھولنے والا یہ پتر اپنے ساتھ لے جائے گا۔ مہتر بدھ کے نروان پانے تک یہ پتر ان کے پاس رہے گا۔ لوک ناتھ! دوہرا دیجئے کہ جنموں کے بھید کھولنے والا یہ پتر میں نے اپنے مہان بودھی ستو کو پہنچا دیا۔ آپ کہئے کہ پر بھوج پتر آپ کو حاصل ہو چکا ہے۔“

میں نے اس کے کہے ہوئے الفاظ دوہرائے اور اس بھوج پتر کو اپنی گود میں رکھ لیا۔ میرے ہاتھ لگاتے ہی اس پتر کی مہک اور بڑھ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ خوشبو برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ چمپا کے پھول کی طرح میٹھی، تیز اور کسی حد تک ناگوار بو جس سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں نے چاہا کہ اسے اپنے پاس سے دور ہٹا دوں لیکن اس سے پہلے کہ میں ہاتھ بڑھا کر بھوج پتر اٹھاتا، میرا اٹھا ہوا ہاتھ بے حس و حرکت میرے پہلو میں ڈھلک گیا اور میری پیٹھ سنگیں چبوترے سے جا لگی۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے مجھے شدت کی نیند آ رہی ہو۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ سادھانی کا جھریوں بھرا چہرہ اور چمکتی ہوئی آنکھیں میرے قریب آتی جا رہی تھیں۔ پوری طرح نیند آنے سے پہلے میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر انکسار اور عبودیت کے تاثرات اور گہرے ہو گئے تھے۔ پھر نیند میرے اعصاب میں گھلتی چلی گئی۔ کچھ لمحوں کے بعد میرے کانوں میں ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے بہت سے لوگ مل کر رو پیٹ رہے ہوں۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں دُھوپ بھری ہوئی تھی اور کہیں دور سے مردوں اور عورتوں کے چیخ چیخ کر رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں شدید حیران ہو گیا اور میں نے کروٹ بدلی، پھر پلنگ کی پٹی پکڑ کر جھٹکے کے ساتھ اٹھ گیا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا، جو مناظر میرے اردگرد پھیلے ہوئے تھے اور جو کچھ میں نے عالم ہوش میں دیکھا تھا، اب وہ نہیں تھا۔ میں اجے ورتنا کے مہمان خانے میں تھا...... میرے اندر ایک ایسی خوفناک گڑگڑاہٹ ہوئی کہ میرا سارا وجود تھر تھر کانپنے لگا۔ تو کیا میں یہ خوب دیکھ رہا تھا؟ آہ...... یقینی طور پر یہ خواب ہی تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں سادھانی اور سیوک کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گیا تھا۔

دیوار پر لگی گھڑی پر نظر پڑی تو پتہ چلا کہ صبح کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ رات کے انوکھے خواب کی وجہ سے شاید یا پھر دیر تک جاگنے کی وجہ سے، میرا سر بھاری ہو گیا تھا اور

جوڑ جوڑ دُکھنے لگا تھا۔ لیکن ایک بار پھر میرا ذہن ان آوازوں کی جانب متوجہ ہو گیا جو میرا وہم نہیں تھیں۔ یہ رونے پیٹنے کی آوازیں کیسی ہیں؟ میں بستر سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا لیکن چادر میرے پیروں میں الجھ گئی اور میں گرتے گرتے بچا۔ ٹھیک اسی وقت کسی نے میرے کمرے کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

”آ رہا ہوں...... آ رہا ہوں...... کون ہے؟“ میں نے کہا اور چادر سے اپنا پیر نکالنے کے لئے جھکا۔ لیکن اسی وقت میرے حلق سے ایک دہشت زدہ آواز نکل گئی۔

”ارے...... یہ...... یہ......“

آہ، واقعی ایک انتہائی حیرتناک عمل ہوا تھا۔ جس نے ایک لمحے کے لئے میرے ہوش وحواس چھین لئے تھے۔ جو چادر میرے پیروں میں لپٹی تھی وہ سفید چادر نہیں تھی۔ یعنی وہ چادر نہیں تھی جو میرے بستر پر تھی اور نہ ہی میرے بدن پر وہ سوٹ تھا جسے پہن کر میں سویا تھا بلکہ ایک گیروے رنگ کی چادر تھی جو میرے بدن سے لپٹی ہوئی تھی۔ وہی لباس، وہی چیز جو اس مندر میں میرے حوالے کی گئی تھی۔ دستک دینے والا کچھ کہہ رہا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں تو اس وقت دہشت سے کانپتے ہوئے اس گیروے رنگ کے لباس میں کھو گیا تھا۔ اگر وہ سب کچھ خواب تھا تو میرے بدن پر یہ کپڑے کہاں سے آئے اور یہ تیز خوشبو کہاں سے آ رہی ہے؟ یہ...... یہ چمپا کی بو ہے اور میرے ہی بستر سے آ رہی ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنے بستر کو دیکھا، میرے سرہانے تمباکو کے پتے کے برابر ایک خشک پتا پڑا ہوا تھا اور یہ خوشبو اسی میں سے آ رہی تھی۔

”بھوج پتر......“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا اور پھر میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ میں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا تو پتر کی سطح پر ایک نقش بنا ہوا تھا۔ میں نے اسے روشنی کے سامنے کیا تو دیکھا وہ ایک تصویر تھی، ایک انسانی تصویر...... اور ایک بار پھر میرے سینے کو ایک زور کا گھونسا سا لگا تھا، میں نے اس تصویر کے نقوش پہچان لئے۔ یہ اجے ورتنا کی تصویر تھی۔ اور اس میں اجے ورتنا کے گلے میں رسّی کا پھندہ پڑا ہوا تھا۔

”یہ کیا تماشہ ہے؟“ میرے منہ سے بے اختیار آواز نکلی اور پھر مجھے دروازے پر دستک کا احساس ہوا جو مسلسل ہو رہی تھی۔ اس وقت میرے سامنے فوری مسئلہ یہ تھا کہ اس گیروے لباس اور بھوج پتر کو کہاں چھپاؤں؟ بہرحال میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گیروے رنگ کی یہ چادر اتار کر الماری میں ٹھونسی، جلدی سے پتلون قمیض پہنی، بھوج

پتر بھی الماری میں چھپایا اور اس کے بعد میں نے جھپٹ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولتے ہی اجے کا ملازم کمرے میں گھس آیا۔ وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اس کے منہ سے صحیح طور پر آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ میں اسے ایک طرف ہٹاتا ہوا باہر نکلا۔

برآمدے میں بہت سے لوگ بھرے ہوئے تھے اور رونے پیٹنے کی آواز اجے کے کمرے سے آ رہی تھی۔ میرا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ میں لوگوں کو ہٹاتا ہوا اندر داخل ہوا اور وہاں میں نے جو منظر دیکھا وہ مجھے پاگل کر دینے کے لئے کافی تھا...... بستر پر اجے کی لاش پڑی ہوئی تھی اور لاش کے گلے میں رسّی کا پھندا تھا......!

مجھے یوں لگا جیسے میرے سر پر بم پھٹا ہو۔ میرے پاؤں لرز کر رہ گئے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ اجے ورتنا میرا نوجوان دوست میری وجہ سے موت کا شکار ہوا تھا۔ صرف میری وجہ سے۔ میرے ذہن میں ایک ایک چیز گردش کر رہی تھی۔ اجے کی لاش مجھے بتا رہی تھی کہ وردان سادھانی کے ساتھ جو لمحے میں نے گزارے تھے وہ کوئی خواب نہیں بلکہ ایک بہت ہی ہولناک حقیقت تھے۔ میرے کانوں میں اس قہر زدہ بھکشو کے الفاظ گونج رہے تھے جس نے کہا تھا کہ بہکانے والا اب کہیں نہ ہو۔ وہ اب کہیں نہ ہو۔ اور ان الفاظ کا مطلب اس وقت اجے ورتنا کی لاش کی شکل میں میری نگاہوں کے سامنے تھا اور یہ کوئی خواب، دھوکا یا فریب نہیں تھا، ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ کیونکہ اجے ورتنا نے مجھے ان بد عقیدہ بدھ بھکشوؤں کے بارے میں تفصیلات بتائی تھیں۔ حیرت ناک بات تھی۔ بہت ہی حیرت ناک۔ گویا کوئی ایسی پراسرار تحریک ان کے درمیان بھی چل رہی تھی جسے ایک مذہبی تحریک کہا جا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ تو صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ حسن بن صباح، فری میسن اور پتہ نہیں کون کون سی جماعتیں اپنے الگ گروہ بنا کر مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی میں بری طرح ملوث نظر آتی ہیں۔ اصل میں یہ تو ایک بہت ہی لمبا کھیل ہے، بہت ہی لمبا جس کے بارے میں اگر تفصیل میں جایا جائے تو کہانی میں بے مقصد طوالت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں تو اس ہولناک حقیقت کے بارے میں سوچ رہا تھا اور مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ صرف ان الفاظ کی نحوست ہے کہ ہنستے کھیلتے، زندگی سے بھرپور اجے ورتنا کی موت واقع ہو گئی تھی۔ میرا دوست میرے خواب پریشاں کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ کاش میں نے اسے اپنی روداد نہ سنائی ہوتی۔ کاش اس نے مجھے وردان سادھانی کے دھار جانے سے نہ روکا ہوتا۔

بہرحال اجے ورتنا کی موت کا ماتم کیا جا رہا تھا۔ جوان بیٹا زندگی سے گزر گیا تھا۔ عجیب و غریب دن گزرا تھا میرا۔ میں تو سارا دن اجے ورتنا کی لاش کے پاس بیٹھا رہا۔ سوچتا رہا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ یہ حقیقت ہے میں نے موت کو کبھی قریب سے نہیں دیکھا تھا اور خاص طور سے ایک نوجوان کی موت کو۔

پھر اجے ورتنا کی ارتھی شمشان لے جائی گئی۔ میں نے اپنے دوست کا کڑیل بدن شعلوں کی لپیٹ میں آتے دیکھا۔ میرا کلیجہ دہل رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ خداوند عالم! موت کیسی بھیانک چیز ہے۔ میرا دل اس لئے کٹ رہا تھا کہ اجے ورتنا میری وجہ سے موت کا شکار ہوا۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہے۔ اس کے باپ کی حالت بہت خراب تھی۔ میں ان کے سینے سے لگ کر چیخ چیخ کر رو دیا۔ دوسرے لوگ اسے میری بے پناہ محبت سمجھ رہے تھے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ میں اجے کا قاتل تھا اور احساسِ پشیمانی مجھے پاگل کئے دے رہا تھا۔

میری ٹیم یہاں سے کولمبو روانہ ہو گئی تاکہ واپس کلکتے کا رخ کرے۔ لیکن میں نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں ابھی ان کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ اور حقیقت یہ تھی کہ میں اپنے دوست کی موت کے دوسرے دن اطمینان سے اپنے وطن نہیں جانا چاہتا تھا۔ بمشکل تمام ٹیم کے منیجر نے مجھے اجازت دی کہ میں یہاں رک جاؤں۔ لیکن اس نے یہ صاف بات کہہ دی تھی کہ ایسا میں صرف اپنی ذمہ داری پر کروں گا۔ میری ذہنی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ میں اپنے کھلنڈرے ساتھیوں کی رفاقت اختیار کر سکتا۔

بہرحال پانچ دن کے بعد میں اجے کے پتا سے اجازت لے کر بذریعہ ٹرین کولمبو روانہ ہو گیا۔ اس عرصے میں، میں مستقل اپنے گیروے لباس اور بھوج پتر کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر کار میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔

ٹرین جب یہاں سے روانہ ہوئی تو سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں ایک مقامی آدمی میرا ہم سفر ہو گیا۔ وہ باتونی آدمی تھا۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ جو کچھ کہتا رہا میں نے اس سے ناواقفیت کا اظہار کیا۔ اس نے انگریزی بولی تب بھی میں نے خاموشی ہی اختیار کی اور پھر خدا کا شکر ہے کہ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر وہ رخصت ہو گیا تو میں نے فوراً اپنا سوٹ کیس کھول کر گیروے کپڑے اور وہ منحوس بھوج پتر نکالا۔ پہلے تو میں نے

گیروے کپڑوں کا بنڈل کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور اس کے بعد وردان سادھانی کے دیئے ہوئے بھوج پتر کو مسل کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ میرا دل بڑا مطمئن تھا کہ وہ منحوس تصور جو وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی کی نحوست سے نجات نہیں لینے دیتا تھا، مجھ سے دور ہو گیا۔ اس ناقابلِ فہم واقعہ کو میں اپنی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خارج کر دینا چاہتا تھا۔

بہرحال میں کولمبو پہنچا اور وہاں سے بذریعہ اسٹیمر کلکتے روانگی ہوئی۔ کلکتے پہنچ کر میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ واپس ہوسٹل جاؤں۔ یہاں میرے بہت سے دوست موجود تھے۔ کوئی اور پخ نکل آتی۔ چنانچہ میں نے وہیں پر یہ فیصلہ کیا کہ اب میں اپنے گھر کا رخ کرتا ہوں۔ اور آخر کار میں اپنے گھر جا پہنچا۔

میری اچانک آمد پر یہاں خوب ہنگامہ ہوا تھا۔ میرے گھر میں میری والدہ بھی تھیں لیکن ابا جان موجود نہیں تھے۔ وہ شکار کی تلاش میں بندھیاچل پہاڑ کی ترائیوں میں گھوم رہے تھے۔ میں ایک عجیب اضطراب دل میں لے کر یہاں آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں آ کر میرا دل بہل جائے گا۔ یہاں میرے ماں باپ اور دوسرے اہل خاندان تھے جو مجھے بے پناہ چاہتے تھے اور صحیح معنوں میں میری آمد سے بڑی خوشیاں منا رہے تھے۔ لیکن میں ان کی خوشیوں میں اس انداز سے شریک نہ ہو سکا جس طرح مجھے ہونا چاہئے تھا۔ میری شخصیت جیسے بکھر سی گئی تھی۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں مجھ پر جو انکشاف ہوئے تھے اور خاص طور سے دھرم شوالہ میں جو عذاب مجھ پر سوار ہو گیا تھا، اس وقت تو میرے ناپختہ ذہن نے کوئی تاثر قبول نہیں کیا تھا۔ لیکن سری لنکا جانے کے بعد پھولا کھانچن کی پہاڑیوں میں مجھ پر جو گزری تھی میں نے اس پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ شعور کی جس کیفیت سے میں ان باتوں کو سمجھ رہا تھا اب وہ میرے لئے عذاب بنتی جا رہی تھیں۔ الٰہی! کسے اپنی مشکل کا حال بتاؤں؟ اب تو دہشت ہو رہی تھی۔ اجے ورتنا اسی رازداری کا شکار تو ہو گیا۔ ماں کو بتاؤں، باپ کو بتاؤں۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ منحوس جادوگر، وہ خونخوار جنونی انہیں بھی کوئی نقصان پہنچا دیں۔

بہرحال وقت گزرتا رہا اور میں اپنے عذاب میں گرفتار رہا۔ کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ ہر کونا، ہر گوشہ میرے لئے عذابِ جان بنا ہوا تھا۔ والد صاحب شکار سے واپس آ گئے اور انہوں نے معمول کے مطابق دوستوں کی طرح مجھ سے کلکتے اور اس کے بعد لنکا کی

مصروفیات کے بارے میں دریافت کیا اور پھر خوشگوار لہجے میں بولے۔

"یار! تیرے دادا، دادی کی خواہش پوری ہو گئی۔ تیری والدہ بھی یہی چاہتی ت
لیکن میری سوچ اور میرا مقصد دوسرا تھا۔ ان لوگوں نے ایک طویل عرصے کے لئے
سے میرا یار چھین لیا تھا۔ کیا خیال ہے، اب اس کے بعد پھر وہی کام شروع ہو جا
ویسے میں تجھے ایک بات بتاؤں یار، تیری ماں بہت جلدی بوڑھی ہو گئی۔ حالانکہ
عورت سے میں نے صرف اس لئے شادی کی تھی کہ ایک نامور شکاری کی بیٹی تھی اور
میں شکار کے سامنے اس طرح سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی تھی کہ تو یقین کر کہ بعض او
تو شیر بھی اسے دیکھ کر بھاگ جاتا تھا۔ لیکن اب پتہ نہیں اس کو کیا ہو گیا ہے۔ بہر
اب تو آ گیا ہے۔ کیا خیال ہے بنائیں کوئی عمدہ سا پروگرام؟"

"ابھی نہیں پاپا! میں ایک طویل عرصے تک آرام کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے
سے کہا۔

"میں جانتا تھا...... میں جانتا تھا۔ یہ اسکول اور کالج کی زندگی انسان کو کچھ سے ک
دیتی ہے۔ اسی لئے تو میں اپنے شیر کو جنگل میں ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ دھت تیرے
سارے کے سارے بزدل ہو گئے۔ ٹھیک ہے بھائی، تیری مرضی۔"

میں ہنس کر خاموش ہو گیا۔ نجانے کیا بات تھی کہ شکار جس کا میں خود بھی عاش
اب میرے لئے بے معنی سی چیز ہو کر رہ گیا تھا۔ بات وہی تھی، میرے دل و دماغ پر ا
بوجھ سا طاری تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے کوئی میری شخصیت کے دو ٹکڑے کرنا چاہتا
کبھی کبھی ان لوگوں کی باتوں پر بھی غور کرتا تو یہ احساس ہوتا کہ بہرحال وہ سب کچ
دلچسپ اور کچھ نہیں تو کم از کم ان کا وہ دیوتا بن کر یا مہتر بدھ بن کر دیکھوں تو سہی
بات کہاں تک جاتی ہے۔ لیکن پھر خوف دامن گیر ہو جاتا۔ نجانے کتنے لوگ میری
سے ہلاکت کا شکار ہو جائیں اور نجانے مجھے کیا کرنا پڑے۔

آخر مجھے اپنا نتیجہ معلوم ہوا۔ میں نے فرسٹ کلاس میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی ا
پاس کر لیا تھا۔ یہاں پھر ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی اور میرے بزرگ اس بات پر تیا
گئے کہ مجھے آئی۔ سی۔ ایس کی تیاری شروع کر دینی چاہئے۔ والد صاحب نے بھی ہتھ
ڈال دیئے تھے کیونکہ انہوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اب ایک دلیر شکاری نہ
ہوں۔ بہرحال میں نے سوچا کہ شاید تعلیمی سلسلے میں میرا ذہن بٹ جائے۔ چنانچہ

نے آئی۔ سی۔ ایس کی تیاری شروع کر دی۔ اس سلسلے میں کئی بار کلکتے بھی جانا ہوا لیکن بس دوستوں سے مل کر واپس آ گیا۔ وہ پرانی خوشی تو اب مجھ سے دور ہی ہو گئی تھی۔

مقابلے کے امتحان کی تیاری کے دوران بہت حد تک مجھے اس دماغی اُلجھن سے نجات مل گئی تھی۔ میں صرف اپنے آپ کو اس اُلجھن سے نجات دلانے کے لئے بارہ بارہ گھنٹے تک مسلسل پڑھتا رہتا تھا۔ ویسے چند دوست بھی بنا لئے تھے جن سے صرف علمی موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ میں آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں بیٹھا اور سول سروس کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ منتخب ہونے والوں کی فہرست میں میرا چوتھا نمبر تھا۔ پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر پر بالترتیب چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے مقرر کردہ دو صاحبان اور سروس کمیشن کے افسر اعلیٰ کے بھانجے آئے تھے۔ گویا لیاقت کی بناء پر منتخب کئے جانے والوں میں میرا پہلا نمبر تھا۔

بہرحال آئی۔ سی۔ ایس میں کامیابی میرے لئے رحمت ثابت ہوئی کیونکہ اس دوران زیادہ تر پڑھنے میں توجہ دی تھی اس لئے میرے دل سے اُداسی کم ہو گئی اور اب میں نے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اصل میں، میں اپنے آپ سے خوفزدہ تھا۔ حالانکہ اس کے بعد سے اب تک نہ تو مجھے سیوک سندھورتی ملا تھا اور نہ ہی وردان سادھانی کی طرف سے کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ ان دنوں چونکہ شکار وغیرہ پر بھی نہیں گیا تھا اس لئے ذرا سکون رہا تھا۔

آخر کار ٹریننگ کے بعد سروس کمیشن سے مجھے ہدایات ملی کہ میں کلکتے پہنچ کر وائسرائے کے اسٹاف آفیسر سے ملوں۔ وائسرائے بہادر ان دنوں کلکتے میں مقیم تھے۔ میرے والد نے زندگی میں پہلی بار مجھے سنجیدگی سے کچھ نصیحتیں کیں۔ یعنی یہ کہ میں ہمیشہ اپنے منصب سے وفادار رہوں اور ایسا کوئی کام نہ کروں جس سے اس عظیم الشان خاندان پر حرف آئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس کے لئے آئی سی ایس ہونا زندگی کی معراج سمجھی جاتی تھی۔ اماں کو تو سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ میں اب جنگلوں میں مارا مارا پھرنے والا نیم وحشی آدمی نہیں رہوں گا بلکہ ایک اہم سرکاری افسر بن کر عملی زندگی میں قدم رکھوں گا۔ والد صاحب بدستور من موجی تھے۔ حالانکہ عمر بہت بڑھ چکی تھی۔ انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے بھائی، ٹھیک ہے۔ ایک تجربہ تو مجھے بھی ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان

چاہے کتنا بڑا آدمی ہو، سارے فیصلے وہ خود نہیں کرتا۔ بادشاہ بھی ہے تو اسے راج نیتی کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور وہ دوسروں کے مشوروں پر چلتا ہے۔ اب دیکھو ہمارے شکاری شیر کو کس طرح سرکاری نوکر بنا دیا گیا جبکہ وہ اس جیسے پچاس نوکر رکھ سکتا ہے۔“

”تو، تو ہمیشہ کا بے وقوف ہے۔ کبھی عقل کی بات کی ہو تو جانیں۔ ہمیشہ کا ایسا ہے۔ تیرے باوا نے تجھے جنگلی جانور بنا کر چھوڑ دیا اور تو جنگلوں میں ٹکریں مارتا رہا۔ کبھی کبھی تو تیری صورت دیکھنے کو ترس جاتے تھے ہم۔ خاک پڑے ایسی شکاری زندگی پر۔“ یہ دادی اماں کے الفاظ تھے۔ سارے ہی میرے آئی سی ایس کرنے سے خوش تھے۔

بہرحال میں کلکتے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ سری لنکا سے واپسی پر میری زندگی میں وہ ترتیب نہیں رہی تھی جو ایک اعتبار سے میرا مزاج تھی۔ مجھے اب یوں لگ رہا تھا کہ میری زندگی کی ترتیب اور میرا پرانا مزاج واپس آ گیا ہے۔ سفر کے لئے میں اپنے کپڑے اور دوسری چیزیں اپنے سوٹ کیسوں میں رکھتا جا رہا تھا اور ساتھ ہی اس وقت میرا موڈ بہت اچھا تھا اور میں مزے سے گنگناتا بھی جا رہا تھا کہ اچانک چمپا کی خوشبو سے میرا دماغ اُڑ گیا...... یہ خوشبو اس سوٹ کیس سے آ رہی تھی جس میں ابھی ابھی میں نے کپڑے رکھے تھے۔

میرے سارے وجود میں وحشت کی لہر دوڑ گئی۔ یہ میٹھی میٹھی خوشبو میرے ذہن کے نجانے کون سے حصے سے بری طرح ٹکرائی تھی اور میرا سارا وجود اتھل پتھل ہو کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ میں نے وحشت زدہ ہو کر قالین پر سوٹ کیس کا سارا سامان الٹ دیا۔ کپڑوں کی تہہ میں مجھے بادامی رنگت کی کوئی چیز نظر آئی تو میں نے ہاتھ بڑھا کر کپڑوں کی تہہ سے وہ چیز کھینچ لی۔ اور ایک بار پھر مجھ پر وحشت کا شدید حملہ ہوا۔ آہ...... یہ وردان سادھانی کا دیا ہوا وہی بھوج پتر تھا جسے میں نے مسل کر ٹرین سے باہر اُڑا دیا تھا۔ کمرہ اس کی تیز خوشبو سے بھر گیا تھا اور میں بری طرح کانپ رہا تھا۔

الٰہی، یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ یہ بھوج پتر یہاں پھر میری زندگی پر کیوں مسلط ہو رہا ہے؟ کیا دیکھ رہا ہوں میں یہ؟ سب کچھ کیا ہے یہ......؟ ایک بار پھر میری نگاہیں اس بھوج پتر پر پڑیں اور میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اب اس پر اجے کی تصویر کی بجائے ایک اور اجنبی تصویر بنی تھی۔ یہ تصویر مغربی لباس میں ملبوس کسی شخص کی تھی جو ایک بہت

بڑی الماری سے ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ پہلی نگاہ میں وہ مجھے سوتا ہوا ہی نظر آیا تھا۔ لیکن نہیں، وہ سو نہیں رہا تھا۔ اس کی گردن بڑی غیر قدرتی زاویئے سے مڑی ہوئی تھی۔ مزید غور سے دیکھا تو مجھے اس کی کنپٹی میں سوراخ نظر آیا جس سے کوئی سیال بہہ رہا تھا اور وہ سیال اس کے کوٹ پر گر رہا تھا۔ یہ شاید خون تھا۔ میں نے اس آدمی کو پہچاننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ سو فیصدی غیر ملکی معلوم ہو رہا تھا۔ شاید انگریز۔ لیکن یہ صورت میرے لئے بالکل اجنبی تھی۔ مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوئے تھے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ خداوند عالم! کیا پھر میں کسی مشکل میں پھنسنے والا ہوں؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟...... کیا ہو رہا ہے یہ؟

ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ برآمدے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے اس بھوج پتر کو سوٹ کیس میں رکھ کر چابی گھما دی۔ اماں سامان رکھنے میں میری مدد کرنے آئی تھیں۔ انہوں نے کمرے میں آتے ہی اِدھر اُدھر دیکھا اور ناک سکیڑ کر کہنے لگیں۔

”خاقان! یہ تیز خوشبو کیسی ہے؟“

”اماں! وہ خانساماں ابھی چمپا کے پھول لے کر آیا تھا۔ بڑی تیز خوشبو تھی ان کی۔ میرے تو سر میں درد ہونے لگا۔ اسی وقت پھنکوا دیئے میں نے۔“

”چمپا کے پھول لے کر آیا تھا؟“

”ہاں اماں۔“

”مگر یہ چمپا کا موسم تو نہیں ہے۔“

”پتہ نہیں کہاں سے اٹھا لایا تھا کمبخت۔“

”بس یہ لوگ بھی سر پھرے ہوتے ہیں۔ پھنکوا دیئے تم نے، اچھا کیا۔ دیکھو کیسی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔“

بہرحال اس سے پہلے کہ میں مزید اس سلسلے میں کوئی بات کرتا میرے ذہن میں ایک تیز درد کی لہر اٹھی۔ یہ لہر اس احساس کا نتیجہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کمرے میں اماں کا ٹھہرنا کسی طور مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ضرور اس پر مزید تبصرے کریں گی۔ وردان سادھانی کی نحوست بھوج پتر کی صورت میں سوٹ کیس میں موجود تھی۔ میں نے کہا۔

”آؤ اماں...... باہر چلتے ہیں۔ یہاں تو میرے سر میں درد ہو گیا۔“

"ہاں..... آ جاؤ، چلیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بدبو باہر نکل جائے گی۔" اماں میر
ساتھ کمرے سے باہر آ گئیں۔ پھر کافی دیر تک میں ان کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ جب وہ کسی اور کام سے اٹھ کر گئیں تو میں نے کمرے میں آ کر دروازہ بند کیا، سوٹ ک کھول کر دیکھا تو پھر سر چکراتا محسوس ہوا۔ بھوج پتر اب سوٹ کیس میں نہیں تھا کمرے میں چمپا کی خوشبو کے مدھم مدھم آثار تھے۔ لیکن بھوج پتر میرے سوٹ کیس غائب نظر آ رہا تھا۔ بہرحال اب اس کا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ میں پورے طور پر مافو الفطرت قوتوں کے بس میں آ چکا ہوں۔ لنکا سے آنے کے بعد بڑی مشکل سے میں اپنے ذہنی انتشار پر قابو پایا تھا لیکن بھوج پتر کے ظاہر ہونے سے میری تمام اُلجھنیں احساسِ دہشت پھر اُبھر آیا۔ میرے اندر ایک عجیب سی کمزوری پیدا ہو گئی تھی۔ میں ا کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ کیا کروں کیا نہ کروں؟ میرا دل چاہا کہ میں کلکتے نہ جاؤں لیکن یہ بھی مجبوری تھی۔ سب کچھ تو ہو چکا تھا۔ وہاں نہ جانے سے بھی کوئی خاص فر نہیں پڑتا۔ بہرحال اس کے بعد میں نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ اپنی اس آگ میں، میں ہی جلنا چاہتا تھا۔ دوسروں کو جلانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ آج تک اجے ورتا میر ذہن سے نہیں نکل سکا تھا۔

آخر کار دوسرے دن میں کلکتے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے دن بھر آرام کیا میرے دوستوں کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ میں آ گیا ہوں تو وہ میرے پاس آ گئے ا میں نے صرف اپنے احساس کو منتشر کرنے کے لئے دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح پروگرام بنا لیا۔ وہ سب بے حد خوش تھے کہ میں اب کلکتے میں ہی رہوں گا۔ اس طر ایک بار پھر گھومنے پھرنے کے مواقع حاصل ہوں گے اور وہ بھی ایک بہت اچھی اور بڑ حیثیت سے۔ میں خود بھی اب ان لوگوں کے ساتھ شامل رہنا چاہتا تھا۔ پہلی بات تو یہ ک پرانے ساتھیوں کی رفاقت ہمیشہ دنیا کے دوسرے لوگوں سے زیادہ دلکش ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں سوچ رہا تھا کہ اب اپنے آپ کو کسی ایسے طریقے سے منظم کروں ک میرے اندر قوت ارادی پیدا ہو جائے اور میں ان منحوس طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤں۔ واقعی بڑی عجیب بات تھی۔ انسان کسی کو اپنا دشمن بنا لیتا ہے، دشمنی چلتی ہے۔ اسے خود بھی محتاط رہنا پڑتا ہے۔ لیکن اس میں یہ ہوتا ہے کہ اگر احتیاط برتی جائے تو دشمن پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ نادیدہ دشمن، وہ پراسرار لوگ جو ایک مسلمان لڑکے کو

ایک مذہبی فرقے کا اوتار بنانا چاہتے تھے وہ میرے لئے نامعلوم تھے۔ ان کے لئے کیا کرتا، کیا نہ کرتا۔

لیکن بہرحال میں ہر صورتحال سے نمٹنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا۔ بلویڈا ہاؤس کے اسٹاف افسر سے ملنا تھا۔ رات میں نے اپنے ہوسٹل میں نسبتاً آرام سے گزاری۔ صبح اپنا شاندار سوٹ پہن کر میں نے اپنے کاغذات سنبھالے اور بلویڈا ہاؤس روانہ ہو گیا۔ اس وقت آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہندوستان پر انگریزی حکومت مسلط تھی۔ انگریزی حکومت کے انتظامی چونچلے ویسے قابل ذکر ہوتے ہیں۔ میں صبح پونے نو بجے بلویڈا ہاؤس پہنچ گیا تھا۔ یہاں چار مرتبہ میرے کاغذات کی پڑتال ہوئی، شناختی دستاویزات دیکھی گئیں۔ پھر کہیں جا کر وائسرائے ہاؤس میں داخل ہونے دیا گیا اور دوپہر کے دو بجے کے قریب اس آفیسر صاحب بہادر کے ہاں باریابی نصیب ہوئی۔ ایک عجیب سا ڈھیلا ڈھالا ہیڈ کلرک مجھے ملا اور اس نے مجھے یہ خبر سنائی کہ خاقان جمشیدی صاحب کو اسٹاف افسر نے یاد فرمایا ہے۔

بہرحال میں اسٹاف آفیسر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اسٹاف آفیسر سر جھکائے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ میں نے اسے انگریزی میں سلام کیا تو اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور ایک بار پھر مجھ پر بجلی گر گئی۔ وہ بریف کیس جس میں میرے کاغذات تھے، میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ کیونکہ اسٹاف افسر کا چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میں بھوج پتر پر اس چہرے کو موت کی نیند سویا ہوا دیکھ چکا تھا۔ اسٹاف افسر نے تعجب بھری نگاہوں سے مجھے اور پھر زمین پر گرے بریف کیس کو دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر پیدا ہوا لیکن دوسرے لمحے اس نے انگریزی چار سو بیسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے روایتی مسکراہٹ سے کام لیا اور کرسی سے تھوڑا سا اٹھ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا اور بولا۔

"ہیلو مسٹر خاقان جمشیدی! میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

میں نے نجانے کتنی ہمت اور حنت کے ساتھ اپنے حواس پر قابو پایا تھا۔ بہرحال میں نے تیزی سے بریف کیس اٹھایا اور بڑھ کر مصافحہ کیا۔ پھر میں نے کہا۔

"سوری سر! اصل میں آپ کی شخصیت کچھ ایسی متاثر کن ہے کہ میں اپنے اعصاب پر قابو نہیں پا سکا۔ معذرت چاہتا ہوں آپ سے۔"

حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک چالاک انگریز تھا، ایک انتہائی چالاک قوم کا نمائندہ جس نے اپنی چالاکی سے ہندوستان پر قبضہ کرلیا تھا لیکن یہ انسانی فطرت ہے کہ اپنی تعریف سن کر ہر شخص پر تھوڑا بہت اثر ہوتا ہے۔ وہ مجسم اخلاق بن گیا اور اس نے اس طرح گردن ہلائی جیسے واقعی اس کی شخصیت اتنی ہی اہم ہو۔ البتہ مجھے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسے معلوم ہو کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ ادھر میں اس کے چہرے کے نقوش کو مزید غور سے دیکھ رہا تھا اور یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ مجھے غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟ بھوج پتر پر میں نے اسی چہرے کو دیکھا تھا؟ اور میری یادداشت کا ہر نقش یہی تصدیق کر رہا تھا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی تصویر بھوج پتر پر مُردہ حالت میں بنی ہوئی تھی۔

اس نے کہا۔ ”آپ کے بارے میں تو میں جان چکا ہوں مسٹر خاقان! میرا تعارف آپ سے نہیں ہے۔ میرا نام این مورالس ہے۔“

”آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی جناب!“ میں نے پُراخلاق لہجے میں کہا۔ لیکن میں ابھی تک ذہنی طور پر اس کیفیت سے متاثر تھا جو میں نے بھوج پتر پر دیکھی تھی۔ سو فیصدی وہی تھا۔ اور جو کچھ اجے ورتنا کے ساتھ پیش آیا تھا، اسے ذہن میں رکھتے ہوئے میں پورے اعتماد سے یہ بات کہہ سکتا تھا کہ اجے ورتنا کے بعد اب مورالس کی باری ہے۔ حالانکہ ان تمام چیزوں کا کوئی جواز نہیں تھا میرے پاس۔

ایک بار پھر میں نے مورالس کو غور سے دیکھا، یہ تیس پینتیس سال کا صحت مند آدمی تھا صحیح معنوں میں۔ افسوس کی بات تھی کہ بہت جلد یہ سر میں گولی لگنے سے ہلاک ہو جائے گا۔ مگر کیوں اور کب؟ کیا اس شخص کا میری آئندہ زندگی میں کوئی دخل ہے؟ اور کیا اس کا خون بھی میری گردن پر ہی ہوگا؟ حالانکہ سچی بات تو یہ تھی کہ اجے ورتنا تو ان افریقی قوتوں کے انتقام کا شکار ہوا تھا۔ کیونکہ اس نے مجھے ان کے خلاف بھڑکایا تھا۔ اس شخص کا کیا رول ہوگا؟ میں انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ لیکن افسر اعلیٰ کے سامنے تھا۔ سنبھل کر اس سے گفتگو کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ لیکن اس کی پراسرار مسکراہٹ نے میری الجھن اور بڑھا دی تھی۔ یہ انوکھی مسکراہٹ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کئی بار میں نے یہ غور بھی کیا کہ ممکن ہے یہ اس کے چہرے کا ایک حصہ ہو۔ لیکن اندازہ ہوا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن

کیا پوچھتا؟ کس طرح پوچھتا؟ وہ بہرحال ایک بڑا افسر تھا اور اس کے ماتحت کی حیثیت سے مجھے وائس ریگل لاج میں اپنے فرائض انجام دینا تھے۔ انگریز کی حکومت میں سرکاری ادب و آداب کا خیال رکھنا بڑا ضروری تھا۔ بہرحال دفتری نوعیت کی گفتگو کے علاوہ اور کوئی ذاتی گفتگو نہیں کرنی۔ ابھی میں اسی الجھن میں تھا کہ یکایک اس نے پوچھا۔

”ایک سوال کروں آپ سے مسٹر خاقان جمشیدی؟“

”جی سر، ضرور۔“ میں نے نیاز مندی سے کہا۔

”کیا ہماری ملاقات پہلے کہیں ہو چکی ہے؟“

”جی؟“ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر میں نے کہا۔ ”میں سمجھا نہیں سر۔“

”آپ جب کمرے میں داخل ہوئے تھے، مجھے دیکھ کر چونکے تھے۔ بلکہ اس قدر پریشان ہوئے تھے کہ آپ کے ہاتھ سے بریف کیس چھوٹ گیا۔“

”جی سر، جی......“

”مگر مجھے یاد نہیں آتا کہ آپ سے میری ملاقات کہاں ہوئی تھی؟ یا آپ نے مجھے اس سے پہلے کہاں دیکھا تھا؟“

”سر! وہ...... میں...... میں......“ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تو وہ ہنس پڑا اور پھر بولا۔

”میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ آپ نے مجھے کہاں دیکھا ہوگا۔“

”سس...... سر!...... مم...... میں...... میں...... حقیقت میں، میں نروس ہو گیا تھا۔“ وہ بولا۔

”آپ نے مجھے پشاور میں دیکھا ہوگا کرنل کی وردی میں۔“

”پشاور...... کرنل......؟“ میں نے حیرت سے دوہرایا۔ جواب میں مورالس نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ پھر وہ ہنسنے لگا اور بولا۔

”بہت سے لوگوں کے ساتھ یہ تماشہ ہو چکا ہے۔ ایک شخص نے مجھے آگرا کینٹ کے فوجی ہسپتال میں پلاسٹر میں جکڑا ہوا دیکھا تھا اور تیسرے دن اس نے مجھے کلکتے میں ایک کلب میں یا ڈینس سکوپ میں یا بلوبیڈا ہاؤس میں۔ ہاہا...... ہاہاہا...... تو آپ نے مجھے کس حال میں دیکھا تھا، بتائیے؟“ وہ باقاعدہ مجھ سے کھیل رہا تھا اور میں خود کو سنبھالنے کی کوشش میں ابھی تک ناکام تھا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ بیوقوف میں نے تجھے جس حال

میں دیکھا ہے اگر میں تجھے بتا دوں تو تیری خود ہوا خراب ہو جائے گی۔ اس کی یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس نے کہا۔

"آپ نہیں سمجھے مسٹر جمشیدی! اصل میں ہم دو بھائی ہیں، جڑواں بھائی۔ میرا بھائی این پیٹر جسے آپ نے پشاور چھاؤنی میں دیکھا ہو گا، مجھ سے بڑا ہے لیکن صرف چالیس منٹ بڑا۔ ہم دونوں کی حد درجے مشابہت بہت سے لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث بن چکی ہے۔ کیا سمجھے آپ؟"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس شخص کی پراسرار مسکراہٹ کے پیچھے کوئی گہرا راز نہیں تھا بلکہ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ میں اسے دیکھ کر اس لئے چونکا ہوں کہ میں نے اس کی شکل کے جڑواں بھائی کو کہیں اور دیکھا ہے اور وہ بڑے دوستانہ انداز میں اپنے بھائی کے واقعات مزے لے لے کر سنانے لگا اور میں دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ یہ الجھن آخر کار دور ہوئی۔ ایک لمحے کے لئے میرا دل چاہا کہ میں اس کو بتا دوں کہ اس کا بھائی یا تو اب تک گولی کا نشانہ بن چکا ہے یا جلد ہی ہلاک ہونے والا ہے۔ لیکن بھوج پتر کا راز میں کسی پر ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ ایک اطمینان سا ہوا تھا کہ یہ شخص جس سے آئندہ زندگی میں میرا واسطہ پڑے گا، میری وجہ سے ہلاک نہیں ہو گا۔ ر اس کا بھائی تو وہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔

بہرحال اسٹاف آفیسر سے میری پہلی ملاقات نے اس درجہ غیر رسمی رخ اختیار کر لیا کہ گھنٹے بھر کے بعد جب میں اس سے رخصت ہوا تو وہ مجھے اپنے بنگلے پر رات کے کھانے کی دعوت دے چکا تھا۔ اصل میں اسے بھی یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ میں یہ ملازمت صرف تنخواہ کے لئے نہیں کر رہا ہوں بلکہ ہندوستان کے ایک بہت بڑے حصے ایک طرح سے میری حکومت قائم ہے اور میں ایک بہت بڑے جاگیردار کا بیٹا ہوں۔

بہرحال اپنے بنگلے پر اس نے میرا استقبال اپنے ایک ماتحت افسر کے تحت نہیں بلکہ ایک معزز مہمان کی حیثیت سے کیا۔ یہاں آ کر مجھے معلوم ہوا کہ مورالس اس کوٹھی میں اپنے ملازموں کے ساتھ تنہا رہتا ہے۔ رات کے کھانے پر اس نے چار پانچ انگر دوستوں کو بھی بلا لیا تھا اور وہیں اس نئی خاتون سے میرا تعارف ہوا جو وائسرائے کی پر سیکرٹری تھی۔ اس کا نام ایلس فیوری تھا۔ میں نے خاتون اسے اس لئے کہا کہ وہ ا بتیس برس کی عورت تھی لیکن دیکھنے میں لڑکی لگتی تھی۔ البتہ اس کے اندر ایک خوبی یہ تھی

ہ نہایت ذہین، بدمزاج اور انسانوں سے دور رہنے والی نظر آ رہی تھی۔ ہم اسے لڑکی اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ابھی تک مِس تھی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی اور آئندہ بھی ایسا کوئی ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ دو چار رسمی جملوں کے علاوہ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ لیکن اس کا چہرہ مجھے بہت عجیب و غریب محسوس ہوا۔ پتلے پتلے ہونٹ، دبلا پتلا بدن، موٹے شیشوں والی عینک، بھورے بال اور ہری آنکھیں۔ اسے دوسری نگاہ دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک بلی جیسی شخصیت کی مالک عورت ہے۔ بلاشبہ وہ ایک بلی معلوم ہو رہی تھی جس کی مرضی کے خلاف اگر ذرا سی بھی بات ہو جائے تو وہ غرا غرا کر آسمان سر پر اٹھا لے اور جو بھی سامنے آئے اسے نوچ ڈالے۔

بہرحال کلکتے میں وائس ریگل لاج کے افسروں اور ماتحتوں سے میرا تعارف ہوا۔ چوتھے پانچویں دن وائسرائے بہادر کے سامنے پیشی ہوئی۔ وائسرائے لارڈ کارل بروکس خاموش طبع شخص تھا۔ اس نے مجھ سے دو چار رسمی باتیں کیں اور پھر سرکاری امور کے بارے میں ہدایت دے کر رخصت کر دیا اور میں وائسرائے کے انتظامات معاملات کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ بل ویدا ہاؤس کلکتے میں وائسرائے کی قیام گاہ تھی۔ جب وائسرائے دہلی جاتا تو اس کا اسٹاف بھی اس کے ہمراہ دہلی چلا جاتا۔ ایک طرح سے ہماری زندگی خانہ بدوشوں جیسی زندگی تھی۔ وائسرائے جہاں بھی ہوتا ہمیں اس کے ساتھ وہاں قیام کرنا ہوتا تھا۔ اس طرح کلکتے میں وائسرائے کا قیام طویل ہوا۔

کلکتہ میرے لئے ایک گھر کی طرح تھا۔ یہاں میرے بہت سے دوست بھی تھے جنہیں میری شخصیت کا مکمل طور پر علم ہو چکا تھا لیکن میں نے اپنے انداز میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی اور ایک سرکاری افسر ہونے کے ناطے ذرا بھی کسی قسم کی علیحدگی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ میرا فرصت کا وقت بہت اچھی طرح گزرتا تھا اور دوسرے لوگوں کے علاوہ اب مورالس بھی میرا دوست بن گیا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر ہم لوگ زیادہ تر گھوڑ سواری کرتے یا دوسری تفریحات کرتے۔ میری زندگی کے دن بڑے ہموار اور پُرآسائش گزر رہے تھے۔ مورالس اگرچہ مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں تھا مگر آدمی خوش مزاج تھا۔ ویسے اس شخص کے بارے میں انگریزوں اور دیسی افسروں میں طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ کسی نامعلوم لڑکی کے عشق میں گرفتار ہے۔ کوئی کہتا کہ یہ شادی

کے قابل نہیں ہے۔ ویسے ایک اندازہ اور بھی مجھے ہوا، وہ یہ کہ مورالس کی ایلس فی[ور...] کے علاوہ کسی اور سے نہیں بنتی تھی۔ وہ عورت ہی اس ڈھب کی تھی۔ مورالس ایک [...] نشے کے عالم میں بولا۔

''مسٹر خاقان! آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ میں ایلس فیوری پر جان دیتا ہوں[...] اتنا عشق کرتا ہوں اس سے کہ شاید رومیو نے جولیٹ سے بھی نہ کیا ہو۔''

''مجھے اندازہ ہے مسٹر مورالس۔''

''لیکن وہ عورت پتہ نہیں کمبخت اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ میں نے اسے شادی[...] پرپوزل دے دیا ہے لیکن اگر اس نے مجھ سے شادی نہ کی یا پھر میری قربت قبول نہ ک[...] تم دیکھ لینا ایک دن کیا ہو جائے گا۔''

میں نے حیرت سے مورالس کو دیکھا۔ اتنا اندازہ تو مجھے بھی ہو چکا تھا اس دنیا [...] رہتے ہوئے کہ نشے کے عالم میں انسان کبھی کبھی سچ بھی بول دیتا ہے۔ مورالس نے الفاظ بے شک نشے کے عالم میں کہے تھے لیکن بڑا ہیجان تھا ان الفاظ میں۔ تعجب کی با[ت] تھی، ایک با اصول انگریز اس انداز میں سوچتا ہے۔ لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں تھ[ی] انڈین سول سروس کے سنگین چہرہ بت کا یہ روپ میرے لئے بڑا حیران کن تھا۔ [...] اندازہ نہیں تھا کہ ہندوستانی معاشرے نے جس طبقے کو دیوتاؤں جیسا درجہ دے رکھا [...] اس کی نجی زندگی اس قدر افسوس ناک ہے۔ بہرحال ظاہر ہے یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ م[یں] نے اس پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی۔ اپنے محکمے میں، میں نیا تھا۔ لیکن اپنی فطرت اور خو[ش] اخلاقی کے بل پر سرکاری ملازموں کے اس طبقے میں قبول ہو گیا اور بہت جلد ان [...] اندرونی حلقوں تک میری رسائی ہو گئی۔ ساتھ ہی اپنے کالج کے استادوں اور ہم جماع[ت] دوستوں سے میری ملاقاتیں بدستور رہتی تھیں۔ انہی پرانے ساتھیوں میں میرا ایک [...] دوست بھی تھا جس کا نام اختیار تھا۔ میں اور اختیار بہت دن ہوسٹل کے ایک کمرے م[یں] رہے تھے اور اب وہ دریائے ہگلی میں چلنے والے کسی اسٹیمر پر انجینئر لگا ہوا تھا۔ میں [...] چونکہ پرانے دوستوں میں سے کسی سے رابطہ نہیں توڑا تھا اس لئے وہ مجھ سے اکثر ملنے جایا کرتے تھے۔

ایک دن اختیار نے ایک غیر ملکی شخص کو مجھ سے ملایا۔ اس کے اس نئے دوست کا نا[م] ہیگ جونس تھا۔ ہیگ جونس بیالیس، ترتالیس سال کا لمبا تڑنگا نوجوان تھا۔ لیکن اس [...]

سر کے بال وقت سے پہلے سفید ہو چکے تھے۔ اپنی آنکھوں ہی سے وہ ایک اوباش مزاج اور عیار فطرت کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ اور بھاری جبڑے اس کے ظالمانہ مزاج کی عکاسی کرتے تھے۔ ہیگ جونس اسپین کا رہنے والا تھا اور کئی زبانیں روانی سے بول سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ شاندار سوٹ میں ملبوس نظر آتا تھا اور اس کی انگلیوں میں انتہائی قیمتی ہیروں کی انگوٹھیاں ہوتیں۔ وہ بیش قیمت سگار پینے کا عادی تھا۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ شخص بے پناہ دولت مند ہے۔ البتہ مجھے پہلی ملاقات میں یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک ہنگامہ پسند آدمی ہے اور اس کا اندازِ گفتگو ایسا ہے کہ جہاں بیٹھ جائے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا سکتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ تاجر ہے اور کاروبار کے سلسلے میں کچھ دن کلکتہ ٹھہرے گا۔ خوش باش غیر ملکیوں کی طرح اس کو محفل آرائی کا فن بھی آتا تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔

''زندگی میں ہر طرح کے دلچسپ تجربات کئے ہیں میں نے۔ اور کسی بھی جگہ بیٹھ کر میں دوستوں کو بیوقوف بنا سکتا ہوں۔ مجھے معاف کرنا میرے الفاظ میں بے ساختگی ہے۔ اب جیسے مجھے بہت شعبدے آتے ہیں۔'' اس نے اپنی جیب سے تاش کی گڈی نکالی اور اس کے بہت سے کرتب دکھائے۔ شعبدہ بازی سے بات نظر بندی یا مسمریزم تک پہنچی تو اس نے پُروقار اور ٹھوس لہجے میں کہا۔

''ہاں، میں مسمریزم کا ماہر ہوں۔ لیکن اس کے مظاہرے عام نہیں ہوتے۔ میں تمہیں کسی وقت اپنے اس فن کا مظاہرہ بھی دکھاؤں گا مسٹر خاقان! کیونکہ میں بہت کم دوست بناتا ہوں اور جنہیں دوست بنا لیتا ہوں پھر ان سے بے تکلف ہو جاتا ہوں۔ تمہارے اندر ایک اچھے دوست کی تمام صفات موجود ہے۔''

دو ایک مرتبہ تو وہ میرے دوست کے ساتھ آیا لیکن اس کے بعد وہ اختیار احمد کے بغیر بھی میرے پاس پہنچا۔

''اکیلا آ گیا ہوں، مائنڈ تو نہیں کرو گے میری جان؟'' اس نے بے تکلفی سے کہا۔

''نہیں نہیں، مائنڈ کرنے کی کیا بات ہے۔ بیٹھئے پلیز۔''

''اچھا یہ بتاؤ، پینے پلانے کی کیا کیفیت ہے؟''

''افسوس، میں نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے، وہاں شراب کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔''

''کوئی مسئلہ نہیں...... کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اپنا شراب خانہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔'' اس نے کہا اور اپنی جیب سے شراب نکال کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ ویسے شراب کے بارے میں میرے خیالات بے حد خراب تھے۔ نشے کے عالم میں انسان وہ بولتا ہے جو اس کے اندر بسا ہوا ہوتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ اپنے اندر کی باتیں مجھے بتا رہا ہے لیکن وہ ڈینگیں ایسی مارتا کہ سن کر ہنسی آتی۔ کبھی کبھی اس طرح سنجیدہ ہو جاتا کہ بالکل دوسرا آدمی معلوم ہوتا۔ ایک دن شراب کی ایسی ہی کیفیت میں اس نے مجھے بتایا۔

''میں تمہیں ایک بہت ہی گہری بات بتاؤں۔ وعدہ کرو کہ ہنسو گے تو نہیں۔''

''چلو وعدہ، میں نہیں ہنسوں گا ڈیئر ہیگ۔''

''تو سنو، میرا تعلق اسپین سے نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''میرا باپ مراکش کا ایک عیسائی تھا اور میری ماں مصر کی قبطی نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ کیا سمجھے؟''

''تو پھر تم اپنے آپ کو اسپینی کیوں ظاہر کرتے ہو؟''

وہ آنکھیں بند کر کے ہنسنے لگا، پھر بولا۔ ''بہت سی باتیں صیغہ راز میں ہوتی ہیں۔ اچھا ایک بات بتاؤں۔ میری ایک محبوبہ ہے جو پہلے یہاں رہتی تھی لیکن اب یہاں نہیں رہتی۔''

''اب کہاں رہتی ہے وہ؟'' میں نے اس کی بے تکی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''یہی تو پتہ نہیں۔ نجانے کہاں کہاں اسے تلاش کر چکا ہوں۔ دیکھو میں تمہیں اس کی تصویر دکھاتا ہوں۔'' اس نے اپنے پرس سے ایک تصویر نکال کر میرے سامنے کی۔ میں تو اب یہی کہہ سکتا ہوں کہ میری تقدیر میں قدرت نے صرف ذہنی جھٹکے ہی لکھے ہیں۔ ایک بھولی داستان مجھے پھر سے یاد آ گئی تھی۔ تصویر کلاڈیا کی تھی۔ سو فیصدی کلاڈیا کی تصویر تھی یہ۔ اور کلاڈیا کوئی ایسا کردار نہیں تھا جسے میں آسانی سے نظر انداز کر دیتا۔ وہ میری زندگی کی فہرست سے خارج نہیں ہوئی تھی۔ بس یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ اپنی الجھنوں میں پھنس کر میں نے اسے فراموش کر دیا تھا۔ بلکہ کچھ عرصے پہلے کی بات ہے کہ ایک بار میرا دل چاہا تھا کہ میں کرنل صغیر سے ملاقات کروں۔ لیکن پھر خوف دل پر چھا گیا تھا اور وہ خوف اجے ورتنا کی صورت سے متعلق تھا۔ کلاڈیا نے جس پراسرار کتاب کا تذکرہ کیا تھا وہ میرے لئے بڑی انوکھی نوعیت کا حامل تھا اور میں یہ سوچتا تھا کہ کہیں کلاڈیا بھی کوئی

ی بات مجھ سے نہ کہہ بیٹھے جو خود اس کے لئے مصیبت کا باعث بن جائے۔ پھر بھی ر اتجس جاگ اٹھا۔ میں تصویر دیکھ ہی رہا تھا کہ ہیگ نے وہ تصویر میرے ہاتھ سے لے لی اور مسکراتا ہوا بولا۔

''یہ اتنی ہی خوبصورت ہے کہ کوئی بھی اس کی تصویر کو ایک دفعہ دیکھ کر دیر تک دیکھتے ہنے کی خواہش کو اپنے اندر سے نہیں نکال سکتا۔''

''واقعی، آپ خوش قسمت ہیں مسٹر ہیگ کہ اتنی حسین لڑکی آپ کی محبت میں گرفتار ہے۔''

وہ ایک دم افسردہ ہو گیا اور اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں...... ایسی کوئی ات نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ میری محبت میں گرفتار نہیں ہے۔ یہ تو ون وے ٹریفک چل رہا ہے۔ ویسے بڑی پراسرار لڑکی ہے۔ جانتے ہو اس سے میری پہلی ملاقات کہاں ہوئی۔ میں ایک سمندری سفر کر رہا تھا کوئین وکٹوریہ نامی جہاز پر۔ میرا یہ سفر بہت ہی خوبصورت گزر رہا تھا کہ ایک دن میں نے تاروں کی چھاؤں میں اسے جہاز کے عرشے پر دیکھا۔ سفید رنگ کے لباس ں وہ کوئی بھٹکی ہوئی روح معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا انداز بھی ایسا ہی تھا۔ تم کبھی اسے چلتے ہوئے دیکھو تو لگے جیسے فضا میں تیر رہی ہو۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ ایک بدبخت شخص نے مجھے آواز دی تو میری نگاہیں اس کی طرف سے ہٹ گئیں۔ اور پھر جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔ تم یقین کرو، میں نے اسے پورے جہاز کے چپے چپے پر تلاش کر لیا۔ کوئی ایک ہفتے تک میں اس کی کھوج میں رہا۔ یہاں تک کہ اپنے اختیارات سے کام لے کر میں نے جہاز کے کپتان سے ایسی کسی لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کی لیکن کپتان تک مجھے اس کے بارے میں نہ بتا سکا جبکہ خفیہ طور پر اس نے مجھے ایک کیبن کی سیر کرائی۔ وہاں موجود ہر ایک نوجوان لڑکی کو مجھے دکھایا لیکن وہ ان میں موجود نہیں تھی۔ میں اس وقت اپنے دل و دماغ کو یہ سوچ کر سکون دینے کی کوشش کرنے لگا کہ ممکن ہے میں نے نشے کے عالم میں اسے دیکھا ہو، میرا مطلب ہے وہ صرف میرا تصور ہو۔ جہاز کے سفر کے دوران میں خود کو یہی سمجھانے لگا کیونکہ وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی تھی۔

اس واقعے کے کوئی تین ماہ کے بعد میں رنگون میں تھا اور ایک لفٹ سے رنگ
ایک عمارت کی آٹھویں منزل پر جا رہا تھا کہ میں نے اسے دوسری لفٹ سے نیچے
ہوئے دیکھا۔ اصل میں لفٹ کا دروازہ شیشے کا بنا ہوا تھا اور اس سے باہر دیکھا
تھا۔ لفٹ اوپر چل پڑی تھی۔ میری نگاہوں نے مجھے دھوکا نہیں دیا تھا۔ لفٹ کو سب
پہلے چوتھی منزل پر رُکنا تھا۔ میں چوتھی منزل پر اتر کر نیچے بھاگا اور اس کے بعد بس
لو کہ میں پاگلوں کی طرح چاروں طرف دوڑتا رہا۔ پھر مجھے خود ہی اپنی اس حالت پ
گئی۔ وہاں موجود لوگ مجھے حیرت سے اس طرح بھاگتے دوڑتے دیکھ رہے تھے۔
میری آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ وہی تھی۔ سو فیصدی وہی تھی۔ پھر تم یوں سمجھ
رنگون مجھے صرف چھ دن کے لئے رُکنا تھا لیکن چوبیس دن میں نے رنگون میں گزار
بس میں ہوتا تھا اور میری کار اور اس کے بعد وہاں کی گلیاں، کوچے، بازار، مارکیٹیں
ہال ہر جگہ میں اسے تلاش کرتا پھرتا تھا لیکن وہ مجھے نہیں ملی۔ ایک عجیب سا سحر میرے
و دماغ پر طاری تھا۔ اب تو مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے وہ کوئی آوارہ روح ہو جو بار بار
نظر آ جاتی ہو۔ اور تیسری بار پھر وہ مجھے ملی۔ جانتے ہو کہاں؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔ معاملہ اگر کلاڈیا کا نہ ہوتا تو شاید میں اتنی دلچسپ
نہ لیتا۔ میں نے اس سے دلچسپی سے پوچھا۔ ''تیسری بار وہ تمہیں کہاں ملی؟''

''روم میں...... میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ روم گیا ہوا تھا۔ یہ دوست ا
معزز تھے۔ انہوں نے مجھ سے روم کی سیر کے بارے میں مشورے کئے اور پھر ہم
پڑے۔ روم سے کیپیٹن جمنازیم میں جس کی تاریخ بہت بڑی ہے، میں نے ایک با
اسے دیکھا۔ اس وقت ہم لوگ کیپیٹن جمنازیم کی فوٹو گرافی کر رہے تھے۔ کیمرہ میر
پاس تھا۔ وہ ایک ریلنگ سے ٹکی ہوئی ڈولفن شو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت میرے ذہن
فوراً ہی یہ خیال آیا کہ میں اس کی تصویر بنا لوں۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ ہمیشہ کی طرح اب
غائب ہو جائے۔ چنانچہ میں نے کیمرے کا رُخ اُس کی جانب کر کے اس کی
تصویریں بنائیں۔ وہ ان تصویروں سے بے خبر تھی۔ ذرا دیکھو، غور کرو۔ جہاں وہ
کھڑی ہے اور جو ریلنگ تمہیں نظر آ رہی ہے یہ کیپیٹن جمنازیم کی ہے جو روم میں و
ہے۔ اس وقت وہاں اتنا رش تھا کہ تصویر بنانے کے بعد میں نے اپنے دوستوں
معذرت کی اور کہا کہ میں ابھی آیا۔ میں اس کی طرف لپکا۔ بس انسانوں کی بھیڑ میں

لمحوں کے لئے میری نگاہوں سے اوجھل ہوئی تھی اور پھر میں اسے دوبارہ تلاش نہیں کر
کا۔ یہاں تک کہ میرے دوست پریشان ہو کر واپس چلے گئے کہ میں کہاں چلا گیا۔ لیکن
ہ پر اسے دیکھ کر ہمیشہ ایسی ہی کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ میں سب کچھ بھول جاتا تھا۔
د میں، میں نے ان لوگوں سے معذرت کی۔ دوسرا کام میں نے یہ کیا کہ فوراً وہ فلم
یلپ کروائی۔ یہاں ایک کسوٹی تھی اس بات کی کہ اگر وہ کوئی روح ہے تو اس تصویر میں
یں آئی ہو گی۔ لیکن یہ دیکھ لو، اس کی وہ تمام تصویریں میرے پاس محفوظ ہیں جو میں
نے کیپیٹن جمنازیم میں بنائی تھیں۔ یہ ہے میری محبوبہ اور میں اسے ہر لمحے تلاش کرتا رہتا
ں۔ حالانکہ میں ایک خواب دیکھنے والا آدمی نہیں ہوں، میری زندگی پریکٹیکل رہی ہے۔
لیکن اس لڑکی نے میرے ہوش و حواس چھین لئے ہیں۔ پتہ نہیں کون ہے، کہاں ہے۔''

میرے اندر ایک عجیب سی لہر اٹھی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ میں اسے
لاڈیا کے بارے میں بتا دوں۔ لیکن پھر نجانے کون سے تصور نے میری زبان بند کر
ی۔ یہ وہ پابندی نہیں تھی جو بھوج پتر کے حوالے سے مجھ پر لگائی گئی تھی بلکہ یہ شاید
برے اندر کی کوئی بات تھی جس نے مجھے روک دیا۔ البتہ ہیگ کی سنائی ہوئی کہانی
برے لئے بڑی حیران کن تھی۔ ویسے بھی کلاڈیا نے اپنے بارے میں جو تفصیلات مجھے
ائی تھیں وہ اس قدر حیران کن تھیں کہ مجھے اس کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہئے تھا۔
یکن مجھ پر جو کیفیات طاری تھیں میں ان سے نہیں نکل سکا تھا۔ اور اس کے بعد کچھ ایسی
صروفیات ہوئیں کہ بے شک میں دوسرے دوستوں سے ملا لیکن کلاڈیا سے نہ مل سکا اور
نہ ہی اس دوران وہ میرے ذہن میں آئی۔ حالانکہ وہ خود ایک پراسرار کردار تھی۔ لیکن اب
جبکہ میں نے ہیگ کی زبانی یہ تمام تفصیلات سنیں تو ایک دم سے کلاڈیا میرے ذہن میں
جاگ گئی۔ واقعی وہ بھی ایک پراسرار وجود اور پراسرار کردار ہے۔

میں نے ہیگ سے تو اس بارے میں کچھ نہیں کہا لیکن خود خفیہ طور پر کرنل صغیر کی کوٹھی
پر جا پہنچا۔ کلاڈیا کی خیریت اس سے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کرنل کے ہاں میں اجنبی آدمی
نہیں تھا لیکن جب میں کوٹھی پر پہنچا تو دروازے کے ہی چوکیدار نے بتایا کہ کرنل صاحب
اپنی پوری فیملی کے ساتھ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں اور ان کو گئے ہوئے بھی کئی ماہ گزر
گئے ہیں۔ کوئی لمبا پروگرام ہے ان کا۔''

''ان کی بیٹی کلاڈیا بھی گھر پر نہیں ہیں؟''

"نہیں سر! پوری فیملی گئی ہوئی ہے۔ ان کی مسز، بیٹی اور وہ خود۔ اور بھی چند افراد کے ساتھ ہیں۔"

"واپسی کا کچھ پتہ ہے؟"

"نہیں سر! کچھ پتہ نہیں ہے۔"

پھر اچانک ہی مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے پوچھا۔ "اچھا ایک بات بتاؤ، وہ یہ سے کس طرح گئے ہیں؟"

"سر! یہاں سے تو وہ سمندری جہاز سے گئے تھے۔ اب اس کے بعد معلوم نہیں کہاں پہنچے اور کہاں سے کہاں گئے۔ ویسے ان کے بارے میں اطلاعات ملتی رہتی ہیں وہ خیریت سے ہیں اور ابھی ان کی واپسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

سمندری جہاز کے سفر کے بارے میں سن کر میں ششدر رہ گیا تھا۔ بہرحال پراسرار زندگی تو میرے ہمرکاب تھی ہی۔ کیا کہتا اور کیا نہ کہتا۔ کوئی بات ہی نہیں کہی سکتی تھی۔

ادھر اختیار کے ذریعے ملنے والے شخص کا تعلق بھی چونکہ حکمران گروہ سے تھا اس لئے اس کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی تھی کہ آخر وہ ہے اور ہم سے کیا چاہتا ہے؟ مہینے دو مہینے اس کا قیام یہاں رہا تھا اور اس نے ہم لوگوں پر پیسہ صرف کر دیا کہ مجھے وحشت ہونے لگی وہ ہر وقت ہی کوئی نہ کوئی پروگرام بناتا رہتا اور اس پروگرام کے سارے اخراجات وہ خود برداشت کرتا تھا۔

سچی بات ہے کہ میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ آخر یہ شخص ہے کس چکر میں؟ وہ مجھے ا اختیار کو ضد کر کے ریس کورس لے جاتا۔ ہماری طرف سے گھوڑوں پر بڑے بڑے لگاتا، گھوڑے جیت جاتے تو ساری رقم ہماری جیبوں میں ٹھونس دیتا۔ ہار جاتے تو ا کے جوتے کو بھی پرواہ نہ ہوتی۔ ہم کوشش کرتے کہ وہ ہم پر اتنا نہ خرچ کرے لیکن ہماری ایک نہ چلنے دیتا۔

ایک دن اختیار کے اسٹیمر پر ہگلی کی سیر کرتے ہوئے اس نے ایک اور انکشاف کیا میرے لئے بڑا سنسنی خیز تھا۔ ہیگ نے مجھے بتایا کہ وہ ڈرگز کا بہت بڑا سوداگر ہے ا ایک بین الاقوامی گروہ کا سرغنہ ہے۔ اس گروہ کا کام ہانگ کانگ سے بحیرہ روم تک ا سطح پر پرفیوم، کوکین، ہیروئین، وغیرہ کی فروخت اور دنیا بھر سے پکڑی ہوئی لڑکیوں

تجارت کرنا ہے۔ میں اس وقت بھی یہی سمجھا تھا کہ وہ حسب عادت شراب کے نشے میں بڑ ہانک رہا ہے کیونکہ نشے میں وہ ہمیشہ ہی رہتا تھا اور عام طور سے الٹی سیدھی ہی ہانکتا رہتا تھا۔ اگر تھوڑی سی بھی عقل ہوتی اس میں تو وہ ایک سرکاری افسر کو یہ باتیں بتانا کسی طور بہتر نہ سمجھتا۔ اب تک یا تو وہ ڈینگیں مارتا رہا تھا یا پھر شعبدے دکھاتا رہا تھا۔ لیکن ایک دن اس نے ہپناٹزم کا کھیل بھی دکھا دیا اور میں اس کی مہارت کا قائل ہو گیا۔

"تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں صرف ایک سڑک چھاپ شعبدہ گر ہوں یا جو کچھ میں تمہیں اپنے بارے میں بتاتا رہا ہوں یا تمہیں تاش کا جو کھیل دکھاتا رہا ہوں وہ صرف ایک تفریح ہے۔ نہیں میرے دوستو، میں بین الاقوامی شخصیت کا مالک ہوں۔ تم لوگ میری حقیقت کو نہیں پہنچ سکتے۔ اچھا دیکھو، مسمریزم کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ میں نے تم سے دعویٰ کیا تھا نا، میں تمہیں تماشہ دکھاتا ہوں۔"

اس وقت کئی افراد وہاں موجود تھے۔ سامنے کی میز پر ایک بڑا سا گلدان رکھا ہوا تھا۔ اس نے گلدان کو گھورنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد گلدان میں حرکت پیدا ہوئی اور پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھنا شروع ہو گیا اور میز سے کوئی دو فٹ بلند ہو کر خلا میں معلق ہو گیا۔ سب حیران نگاہوں سے ہیگ کو دیکھ رہے تھے اور وہ گلدان پر نظریں جمائے بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا۔ کوئی دو منٹ تک معلق رہنے کے بعد گلدان آہستہ آہستہ اپنی جگہ واپس آ گیا۔ مسمریزم کا یہ کمال دکھانے کے بعد ہیگ نے اپنے گرد کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا اور اس طرح ہنسنے لگا جیسے اس نے کوئی دلچسپ لطیفہ سنایا ہو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت وہاں جتنے افراد موجود تھے سب اس سے مرعوب ہو گئے جن میں، میں بھی شامل تھا۔

یہ اس کی شخصیت کا جادو تھا یا پھر مسمریزم کی کارستانی تھی کہ ایک دن میں نے جب اس کا تعارف این مورالس سے کرایا تو این مورالس بھی اس کی شخصیت سے بری طرح متاثر ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"کمال کی شخصیت ہے مسٹر ہیگ کی۔ تم نے اب تک انہیں کہاں چھپا کر رکھا تھا؟"

"بس سر! آپ بڑے آدمی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ اتنی نفیس شخصیت کے مالک ہیں کہ اپنے ماتحتوں سے بھی دوستوں کی طرح پیش آتے ہیں۔"

"بھئی ہیگ جونس جیسی شخصیتیں بہت کم ملتی ہیں۔"

میں نے تنہائی میں ہیگ جونس سے پوچھا۔ ''ہیگ! مجھے ایک بات بتاؤ؟''

''ہاں، کہو؟''

''جب تم مسمریزم میں اتنی مہارت رکھتے ہو تو پھر تم نے کلاڈیا کو سحر زدہ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ اسے کیوں نہیں مجبور کیا کہ وہ تمہاری محبت کا دم بھرے؟''

''اس کی دو وجوہات ہیں۔'' اس نے پوری سنجیدگی سے میری بات کا جواب دیا۔

''کیا؟''

''پہلی بات تو یہ کہ کم از کم محبوبہ کو زبردستی قابو میں نہیں کرنا چاہئے۔ ساری شخصیت ختم ہو جاتی ہے اس کی۔ اور دوسری بات یہ کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ تو بس اپنی ایک جھلک دکھا کر میری نگاہوں سے اوجھل ہو جایا کرتی تھی۔ مجھے اتنا موقع ہی نہیں ملا کہ میں اس سے قریب ہو سکوں۔'' بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔

اب زیادہ تر ملاقاتیں میرے بنگلے پر ہی ہوا کرتی تھیں۔ ایک دن این مورالس نے کہا۔ ''ڈیئر خاقان! اپنے دوست ہیگ کو اور اختیار احمد کو یہاں لے آیا کرو۔ میں بھی تنہا ہی ہوتا ہوں۔ چنانچہ تم لوگ یہاں جس طرح کی پارٹی چاہو کر لیا کرو۔''

پھر یہ ملاقاتیں مورالس کے بنگلے پر ہونے لگیں۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک بات میں نے عجیب سی محسوس کی کہ جب میں نے ہیگ کی ملاقات مورالس سے کرائی، وہ میری طرف سے بے نیاز سا ہو گیا تھا جس طرح مجھ سے ملاقات ہونے کے بعد اس نے اختیار سے ملنا جلنا کم کر دیا تھا اور مجھ سے براہِ راست تعلقات بڑھا لئے تھے، اسی طرح اب یہ ہونے لگا کہ جب میں مورالس کی کوٹھی پر جاتا تو وہاں ہیگ کو پہلے سے موجود پاتا۔ دور ہی سے قہقہوں کی آواز سنائی دیتی اور میں سمجھ جاتا کہ محفل جمی ہوئی ہے۔ بہر حال یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر میں غور کرتا۔ بہر حال ابھی تک میں اس شخص کی گتھی کو نہیں سلجھا سکا تھا۔ پتہ نہیں کیا چیز تھا۔

پھر ایک دن مورالس کی موجودگی میں ہیگ نے مجھے بتایا کہ جس بین الاقوامی گروہ کا وہ سرغنہ ہے جلد ہی اس کے دو اہم رکن کلکتے پہنچنے والے ہیں۔ اس نے یہ بات آتے ہی سرسری انداز میں جیسے کوئی عام خبر سناتا ہے سنائی تھی۔ مجھے تو اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ مجھ سے بھی بڑے افسرِ اعلیٰ کے سامنے اس نے اپنے منشیات کے اسمگلر ہونے کا اعتراف کر لیا تھا۔ لیکن اس وقت زیادہ حیرت ہوئی جب مورالس یہ سن کر ہنسنے لگا۔

ہیگ اپنے بین الاقوامی جرائم کا ذکر اس طرح کر رہا تھا جیسے گپ اُڑا رہا ہو۔ ظاہر ہے ہمارا فطری ردِ عمل یہی ہونا چاہئے تھا کہ ہم بھی اس کی باتوں کو لطیفہ سمجھ کر اپنے ذہن سے نکال دیتے۔ لیکن بعد میں یہ معلوم ہوا کہ یہ اس کی بڑی گہری چال تھی اور ہمیں یہ اندازہ اس وقت ہوا جب ہم پوری طرح اس کے جال میں پھنس چکے تھے!

※☆※

ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ یہ شخص بڑبولا ہے۔ چونکہ ہر وقت نشے میں رہتا ہے اس نشہ آور کہانیاں ہی سناتا رہا ہے۔ البتہ تھوڑا بہت شک و شبہ تھا تو اس کے بے اخراجات پر۔ لیکن ہماری ساری خوش فہمی دور ہوگئی۔ ایک دن وہ دو افراد کو لے کر کے وقت مورالس کی کوٹھی پر پہنچ گیا اور اس نے اپنے مخصوص انداز میں ان دونو تعارف کرایا۔

"یہ سائرس میکائل ہے جس کا تعلق قبرص سے ہے۔ یہ بہت بڑا کاروباری آدمی ہے اور یہ دوسری شخصیت مسٹر یوآن لی کی ہے۔ جاپان کے شہر کوبے میں ان کی بہت بڑ تجارتی فرم ہے۔ کیا سمجھے آپ لوگ۔" اس نے کہا اور عادت کے مطابق قہقہہ مار کر اور بولا۔ "اصل میں ہم قبرص، یونان اور اٹلی وغیرہ سے خام افیون حاصل کرتے ہیں سائرس میکائل بحری جہازوں کے کپتانوں کے ہاتھ جاپان پہنچا دیتا ہے اور وہاں یوآن لی کے آدمی یہ افیون اتار کر اپنی ذاتی تجربہ گاہ میں لے جاتے ہیں جہاں اس کوکین جیسی منشیات تیار کی جاتی ہیں۔"

اس وقت ہم ایک عجیب و غریب انتشار کا شکار ہو گئے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ خالص سرکاری افسران ہونے کے باوجود اس مسئلے پر غور نہیں کر پائے تھے اور ا خطرناک بین الاقوامی مجرموں سے بے تکلف ہو گئے تھے۔ لیکن اب میں پورے اع کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس پراسرار شخص نے جس کا نام ہیگ جونس تھا ہم پر اپنی مقناطیس قوت استعمال کی تھی اور یقینی طور پر ہم اس کے مسمریزم کے زیر اثر تھے۔ ہماری قوت ارادی اس کی تابع ہو چکی تھی اور یہ خیال بعد میں بالکل سچ ثابت ہوا۔ کیونکہ آگے چل ہمیں اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ کلکتے کا بل ویدا ہاؤس اور اس سے ملی ہو سرکاری اہل کاروں کی کوٹھیاں ایک الگ ہی نوعیت رکھتے تھے۔ ہماری یہ محفلیں وائسرا کی قیام گاہ سے بہت قریب جمتی تھیں۔

ہیگ کے ساتھیوں کو آئے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ ایک دن ایک ہولناک واقعہ پیش آ گیا۔ مورالس اور ہیگ بہت دیر تک شراب پیتے رہے تھے۔ وائسرائے کارل بروکس اس دن اپنی فیملی کے ساتھ تفریح کی غرض سے کلکتے سے باہر گئے ہوئے تھے چنانچہ ادھر سے بھی آزادی تھی۔ یہ محفل خوب جمی۔ حالانکہ میں شراب نوشی نہیں کرتا تھا مگر ان لوگوں کی محفلوں میں برابر شریک رہتا تھا۔ چند ہفتوں کے تعلقات کے بعد مورالس کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ ہیگ جونس جو چاہتا تھا مورالس وہی کرتا تھا۔ مگر اس رات......

اس رات غضب ہوگیا۔ اچانک ہی ہیگ نے بیٹھے بیٹھے کہا۔

"مورالس! آؤ بل ویدا ہاؤس چلتے ہیں۔"

میں بری طرح چونک پڑا تھا۔ بڑی عجیب سی صورتحال تھی۔ میرا چونکہ خود بھی تعلق اسی ڈیپارٹمنٹ سے تھا۔ بے شک این مورالس میرا چیف تھا لیکن ذمہ داریاں سب کی برابر ہوتی ہیں۔ ہیگ نے جو کچھ کہا تھا وہ تو قابل عمل تھا ہی نہیں۔ اس بدبخت نے شاید میری بے چینی محسوس کر لی اور میری طرح رخ کر کے بولا۔

"اور خاقان! تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔" یہ کہہ کر اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے واقعی اس وقت ہم لوگوں کا وائسرائے کی قیام گاہ پر جانا ضروری ہے۔

مورالس تو اس طرح کھڑا ہو گیا تھا جیسے وہاں پہنچنے میں ذرا بھی دیر ہوگئی تو قیامت آ جائے گی۔ میں بھی خودبخود اٹھ گیا تھا۔ مورالس کی کوٹھی سے نکل کر ہم لوگ سڑک پر آ گئے۔ سڑک سنسان تھی۔ سامنے بل ویدا ہاؤس کی مضبوط عمارت برطانوی حکومت کی سنگین علامت بنی کھڑی تھی۔ دور جنوبی رخ پر اسٹاف بنگلے میں وائسرائے کی پرسنل سیکرٹری ایلس فیوری کی رہائش گاہ میں روشنی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ فیوری جاگ رہی ہے۔ بل ویدا ہاؤس کی چار دیواری پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سرچ لائٹیں نصب تھیں۔ ہر سو قدم کے فاصلے پر چوکیاں بنی تھیں جن میں مسلح سنتری سنگیں مجسموں کی طرح کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ صدر دروازے پر گارڈ روم میں دن رات حفاظتی دستے کے لوگ مستعدی کے ساتھ ڈیوٹی دیتے رہتے تھے۔ ہم نے دور سے دیکھا، اس وقت بھی دو انگریز سارجنٹ اور دو دیسی سنتری رائفلوں پر سنگینیں چڑھائے مستعد تھے۔ ہیگ اور اس کے دونوں ساتھی احاطے کی دیوار تک ہمارے ساتھ پہنچے اور ہم سب ایک درخت کے نیچے جا

کھڑے ہوئے۔ میرا ذہن اس وقت ایک ہی نقطے پر سوچ رہا تھا کہ مجھے وہی کچھ کرنا چاہئے جو ہیگ چاہتا ہے۔ دوسری طرف موالس بھی ٹکٹکی باندھے ہیگ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میں بھی پلک جھپکائے بغیر اسی کو دیکھے جا رہا تھا اور ہیگ جونس کی آنکھیں انگاروں کی طرح روشن تھیں۔ اس نے اب بل ویدا ہاؤس کے اس رخ پر نظریں جما دیں جہاں وائسرائے اجلاس کرتا تھا۔ وائسرائے چیمبر کی پیشانی پر حسب معمول سرخ روشنی روشن تھی۔ ہیگ نے رُک رُک کر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے مجھ سے اور مورالس سے کہا۔

"تم دونوں وائسرائے کے چیمبر میں اس کی پوری عمارت کا چکر لگاؤ اس طرح کہ گارڈ روم والے تمہیں اندر داخل ہوتے ہوئے نہ دیکھیں۔ تمہیں واپس بھی اسی طرح آنا ہے۔ مورالس! تم گارڈ روم سے چابی لے کر خاقان کے ساتھ چیمبر میں داخل ہو جاؤ گے۔ وائسرائے کی نشست کے بائیں جانب دیوار میں لوہے کی جو الماری ہے تم اسے کھول کر اس میں سے سرخ جلد کی ایک فائل نکالو گے اور تم لوگ واپس آ کر یہ فائل مجھے دے دو گے اور پھر ہم لوگ واپس مورالس کی کوٹھی پر پہنچ جائیں گے۔ صبح سے پہلے تمہی دونوں کو یہ فائل واپس ادھر رکھنا ہو گی۔ اور صبح جب تم سو کر اٹھو گے تو رات کی کوئی بات تمہیں یاد نہیں ہو گی۔ سمجھے؟ تم سب کچھ بھول چکے ہو گے۔ چلو، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تم اس کی تکمیل کرو۔"

میں اور مورالس جیسے نیند میں یہ تمام باتیں سنتے اور اس کی تکمیل کرتے رہے۔ مگر مورالس کا منتقی ذہن ہیگ کے زیر اثر ہونے کے باوجود بھی کام کر رہا تھا۔ اس نے سوئے ہوئے آدمی کی سی آواز میں کہا۔

"وائسرائے چیمبر کی چابی گارڈ روم میں نہیں رہتی۔"

"پھر کہاں رہتی ہے؟"

"وہ چابی اس کی سیکرٹری ایلس فیوری کے پاس ہوتی ہے۔" مورالس کی آواز اس طرح ابھری جیسے کسی مشین سے ابھر رہی ہو۔ لیکن اس کے الفاظ سے ہیگ کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ لمحے بھر خاموش رہا، پھر بولا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں تالے کھولنے والا ایک آلہ دیتا ہوں۔ ذرا سی کوشش کرو گے تو چیمبر کا تالا کھل جائے گا۔" یہ کہہ کر ہیگ نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور

دھات کا ایک ٹکڑا سا نکالا۔ عجیب و غریب شکل کا یہ آلہ اس نے مورالس کے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال دیا اور بدستور تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"بس، اب جاؤ۔"

یہ ایک عجیب و غریب عمل تھا جو ہم کرنے پر مجبور تھے۔ مورالس کی کیفیت بھی یقینی طور پر مجھ سے مختلف نہیں ہو گی۔ میں جو محسوس کر رہا تھا وہ یہ بات تھی کہ اس کا ایک ایک لفظ ہمارے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا اور ہم اس کی تکمیل کرنے پر مجبور تھے حالانکہ شاید مجھ سے زیادہ مورالس اس عمل کے خلاف مدافعت کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اُلجھن کے آثار پیدا ہوئے۔ یقیناً وہ اپنے سوئے ہوئے ذہن کو جگا کر کوئی اہم بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ بات اسے یاد نہیں آ رہی تھی۔ لمحے بھر یہ کیفیت رہی، پھر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ گھوم گیا۔ میں سائے کی طرح اس کے ساتھ تھا۔ اگرچہ میں یہ بات سن اور سمجھ رہا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ ایک انتہائی خطرناک عمل ہے لیکن جو کچھ کہا جا رہا تھا اس کے خلاف عمل کرنے کی طاقت نہ مجھ میں تھی اور نہ مورالس میں۔ ہیگ اور اس کے ساتھیوں کو سڑک پر چھوڑ کر ہم دونوں بل ویدا کے کمپاؤنڈ کے صدر دروازے کی طرف بڑھے۔ کمپاؤنڈ کا آہنی پھاٹک بند تھا۔ مورالس نے سلاخوں پر اپنی انگوٹھی بجائی۔ سنتریوں میں سے ایک ہماری طرف بڑھا۔ اس نے ہمیں پہچان لیا اور پھر گارڈ روم کی طرف رخ کر کے آواز لگائی۔

"مسٹر این مورالس اور مسٹر خاقان جمشیدی۔"

"دروازہ کھول دو۔" گارڈ روم کے کمانڈر نے بھاری آواز میں کہا اور دروازہ کھل گیا۔ سنتری نے پھاٹک کھول کر ہمیں سیلوٹ مارا اور اس کے بعد گارڈ کے چاروں آدمیوں نے ہمیں تعظیم دی۔ گارڈ کے کمانڈر نے جب یہ دیکھا کہ ہم عمارت کے جنوبی حصے کی طرف جا رہے تھے تو وہ یہ سمجھا کہ ہمیں یا تو مورالس کے دفتر میں کوئی کام ہے یا پھر ہم دونوں فیوری سے ملنے جا رہے ہیں۔

ہیگ کی ہدایت کے مطابق ہم نے پوری عمارت کا چکر لگایا اور دوسری جانب سے وائسرائے چیمبر پہنچ گئے۔ برآمدے کے چوڑے ستونوں کی ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ گارڈ روم میں کھڑا کوئی بھی شخص ہمیں چیمبر تک جاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ برآمدے میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وائسرائے کے کمرے کے سامنے پہنچ کر مورالس نے کوٹ کی

جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہیگ کا دیا ہوا آلہ نکال لیا۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت بھی مورالس کی پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی انتہائی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے آلے کو دروازے کے تالے میں ڈال کر گھمایا۔ کچھ نہیں ہوا۔ ایک بار پھر اس نے کوشش کی اور آخر کار ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ دروازے کے ہینڈل پر زور دے کر میں نے وہاں بنے کواڑوں کو اندر دھکیلا اور کواڑ کھل گئے۔ ہم احتیاط کے ساتھ وائسرائے کے چیمبر میں داخل ہو گئے۔ وائسرائے چیمبر کی جانی پہچانی فضا، چمڑے کے صوفوں کی خصوصی بو اور دیواروں پر لگی ہوئی مانوس تصویروں کو دیکھ کر مورالس کے ذہن کو جیسے جھٹکا سا لگا اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبانے لگا۔ اس نے تین چار بار آنکھیں جھپکائیں اور پھر جیسے اس کے دماغ میں روشنی کی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ چند قدم وائسرائے کی نشست کی جانب بڑھا، پھر پلٹا۔ اس نے دہشت کے عالم میں دروازے کی طرف دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ کسی اندرونی سپرنگ کی مدد سے دونوں کواڑ آہستہ آہستہ بند ہو رہے تھے۔ دفعتہً ہی مورالس کی آواز ابھری۔

''خاقان! دروازہ بند نہ ہونے پائے۔ وہ خود چیختا ہوا دروازے کی طرف جھپٹا۔ اس کی ہدایت کے مطابق میں بھی دروازے کی طرف لپکا۔ اور پھر میری آنکھوں کے آگے تارے سے ناچنے لگے۔ ہم دونوں بری طرح ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے۔ دہشت سے مورالس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ ہم دونوں نیچے گر گئے۔ لیکن مورالس برق رفتاری سے اٹھا اور پھر دروازے کی طرف جھپٹا۔ دونوں کواڑ تقریباً بند ہو چکے تھے۔ مورالس نے بے بسی کے عالم میں دونوں کواڑوں کے درمیان اپنا پیر پھنسانے کی آخری کوشش کی مگر اس سے پہلے کہ اس کا پیر کواڑوں کی درز میں پھنس کر دروازے کو بند ہونے سے روک دیتا، وائسرائے چیمبر کا بھاری دروازہ ایک ہلکے سے کھٹکے کے ساتھ بند ہو گیا۔ مورالس اس بھاری بھر کم دروازے کو بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ میرا سر بھاری ہوتا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں یہ ٹکرا کر گرنے کا اثر تھا یا پھر میرے ذہن سے ہیگ کے ڈالے ہوئے اثرات زائل ہو رہے تھے۔ مورالس بھی دروازہ کھولنے کی ناکام کوشش کے بعد قریب کے صوفے پر گر گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔ فرش پر ہیگ کا دیا ہوا قفل کھولنے والا آلہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور دروازے کے تالے میں ہزار طریقے سے

گھمایا لیا بے سود۔ مجھے دروازے سے الجھتے ہوئے کافی دیر ہو گئی تو مورالس نے سر اٹھا کر دیکھا اور مری ہوئی آواز میں بولا۔

''بیکار ہے خاقان! اب یہ اندر سے نہیں کھل سکتا۔''

ظاہر ہے مورالس سے زیادہ اس بارے میں اور کون جان سکتا تھا۔ کیونکہ وہی تمام حفاظتی انتظامات کا ذمہ دار تھا۔ کچھ لمحے تک وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔''یہ خاص قسم کا تالہ ہے۔ اس تالے کو چابی کے بغیر اگر کوئی کھول کر اندر آ جائے تو دروازہ خودبخود بند ہو جاتا ہے اور پھر یہ کسی صورت میں اندر سے نہیں کھلتا...... آہ، یہ بات میں جانتا تھا لیکن...... لیکن......''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری نگاہیں اس وسیع و عریض ہال میں گردش کر رہی تھیں۔ تین بڑی بڑی کھڑکیاں اور دو روشن دانوں کے علاوہ اس کمرے میں دو دروازے اور تھے۔ ایک دروازہ غسل خانے میں اور دوسرا وائسرائے کی ذاتی لائبریری میں کھلتا تھا۔ میرے بدن میں بجلیاں سی بھر گئی تھیں۔ میں نے بڑی تیزی سے کھڑکیوں، روشن دانوں اور دروازوں کا جائزہ لیا۔ کھڑکیوں پر گاتھک طرز کے ڈیزائن میں بنی ہوئی چوڑی سلاخیں اور جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ روشن دان بہت بلندی پر تھے اور ان میں بھی حفاظتی سلاخوں کے علاوہ لوہے کی جالی بھی لگی ہوئی تھی تاکہ مکھیاں اور مچھر اندر نہ آ سکیں۔ غسل خانے کے اندر بھی کھڑکیوں اور روشن دانوں کا یہی حال تھا۔ میں نے لائبریری میں کھلنے والے دروازے پر بھی زور آزمائی کی لیکن دروازہ دوسری طرف سے مقفل تھا اور اس کے بعد یہ کہنے میں کوئی عار نہیں محسوس ہوتی کہ ہم وائسرائے چیمبر کے چوہے دان میں پھنس چکے تھے۔ میں نے مورالس کی طرف دیکھا، وہ اپنا سر تھامے بیٹھا تھا اور نجانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور ہاتھوں میں لرزش ہو رہی تھی۔

میں نے چیمبر میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ میری نظر وائسرائے کی میز پر پڑی اور سردی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اترتی چلی گئی...... وائسرائے کی نشست کی بائیں جانب لوہے کی الماری رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا...... خدا کی قسم یہ وہی الماری تھی، اتنی ہی اونچی اور وہی نقش و نگار اور وہی ہینڈل۔ اور پھر یہ حقیقت اپنی پوری ہولناکی کے ساتھ مجھ پر کھل گئی کہ میں نے بھوج پتر پر الماری سے ٹکی جو لاش دیکھی تھی وہ اسٹاف افسر کے بھائی کی لاش کسی طرح نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ خود این

مورالس کی لاش تھی۔ آہ...... یہ بالکل سچ تھا۔ وردان سادھانی کے بھوج پتر نے رات کا منتظر دکھایا تھا۔ یقیناً یہ وہی رات تھی۔ صبح ہونے سے پہلے اس الماری پر جا مورالس کا مقدر بن چکا تھا۔ یقیناً ایسی ہی بات تھی۔ آہ...... یہی تھا...... یہی تھا...... تھا۔ میں جو اس دوران گزرے ہوئے واقعات سے بہت دور ہو چکا تھا اور اپنی ذمے میں پھنس کر میں نے سیوک سندھورتی، وردان سادھانی، دھرم شوالہ، شِو مندر، دیوا پھولا کھانچن اور رانگا پوری سب کچھ بھلا دیا تھا۔ اپنی تمام تر قوت ارادی سے کام میں اپنے آپ کو اس طلسم سے نکالنے کی کوشش میں مصروف رہا تھا اور کافی حد تک میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اور جو کچھ میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں وہ ایک خوفناک سچائی تھی۔

میں وائسرائے کی میز پر جھکا ہوا سوچتا رہا، یہ سب کچھ جو ہوا ہے یا ہو رہا ہے اتفاق تو نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مورالس میرے ہاتھوں سے مارا جائے گا؟ مگر میں تو غیر مسلح تھا۔ مورالس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ حفاظتی عملے کا رکن ہونے کی بناء پر بھرا ہوا سروس ریوالور ہر وقت اس کے پاس رہتا ہے۔ یہ ریوالور اس کے بغلی ہولسٹر میں لگا رہتا ہے۔ اب اگر میں اس سے ان تمام باتوں کا تذکرہ کرتا تو اس کا نتیجہ نجانے کیا ہوتا اور سچی بات یہ ہے کہ تذکرہ کرنے کی ہمت بھی میرے اندر نہیں تھی۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ کیا وہ مجھ پر حملے کرے گا اور میں خود کو بچانے کے لئے اس کا ریوالور چھین کر اس کو ہلاک کر دوں گا یا وہ خودکشی کر لے گا؟ اور یہ آخری بات مجھے زیادہ درست معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ باصلاحیت افسر میری وجہ سے اس مصیبت میں گرفتار ہوا ہے۔ اگر میں اسے اس یقینی موت سے بچانے میں کامیاب ہو گیا تو میں سوچوں گا کہ میں نے اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ یہ بڑی سچائی تھی کہ میں نے ہی مورالس سے ہیگ کا تعارف کرایا تھا اور ہیگ کے بارے میں یہ کوئی شک و شبے کی بات نہیں تھی کہ وہ ایک انتہائی ہولناک مجرم تھا۔ اگر میں اس خطرناک مجرم سے دور رہتا یا مورالس کو اس سے متعارف نہ کراتا تو یہ بے چارہ اس خطرے میں پڑتا۔ مگر اس چکر میں وہ اکیلا تو نہیں گرفتار ہوا تھا۔ رات ختم ہونے سے پہلے اگر ہم چیمبر سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو صبح دونوں ہی حراست میں لے لئے جائیں گے اور دونوں کا ایک سا انجام ہو گا۔ مگر بھوج پتر نے تو صرف مورالس کے بارے میں ہی پیش گوئی کی تھی۔ فرض کیا اگر اس کی پیش گوئی ٹھیک نکلتی ہے، جس طرح

رتنا موت کا شکار ہو گیا تھا تو میرا کیا ہو گا؟

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہمارا ذہن ہیگ کی گرفت سے نکل آیا ہے۔ لیکن اس کے بعد ہمارا اپنا عمل بے مقصد ہو گیا تھا۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ ہم دونوں پر کیا گزرنے والی ہے۔

مورالس نے اب وحشت کے عالم میں ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے سارے وجود میں تشنج اور بے چینی نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا تو مجھے اس کے ستے ہوئے چہرے پر موت کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ میرے پاس آ کھڑا ہوا اور بڑے سنبھلے ہوئے انداز میں بولا۔

"خاقان! تم اس مصیبت کے اکیلے ذمہ دار نہیں ہو۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم بھی نہیں جانتے تھے کہ ہیگ کون ہے اور کس چکر میں ہے؟ ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ دنیا کا پراسرار ترین آدمی ہے۔ اس نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ حرف بہ حرف درست نکلا۔ بلاشبہ وہ مجرموں کے بین الاقوامی گروہ سے تعلق رکھتا ہے اور کسی ملک کے لئے جاسوسی کر رہا ہے۔ ہم دونوں تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ ہماری زندگی تو ایک سادہ سی کتاب کی مانند ہے۔ میں تمہارے بارے میں تو کچھ نہیں کہتا مگر اپنے بارے میں، میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس وقت میں ہیگ کے سامنے تھا اور ہیگ اپنی غیر معمولی قوتِ ارادی کے اثرات مجھ پر ڈال رہا تھا اس وقت بھی مجھے معلوم تھا کہ ہم کس درجے ہولناک کام کے لئے مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن میں تمہیں پورے وثوق کے ساتھ بتاتا ہوں کہ یہ جانتے ہوئے بھی مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ میں انکار کر سکتا یا اس کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی اٹھا سکتا۔ چیمبر میں داخل ہونے کے بعد نجانے کس طرح مجھ میں یہ قوت آ گئی کہ میں نے ہیگ کی شیطانی قوتوں کا مقابلہ کیا اور اپنے حواس میں آ گیا۔ لیکن میرے دوست، اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ دروازہ تو باہر ہی سے کھلے گا اور اس کے بعد جو کچھ ہو گا، تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میرے پیارے دوست، اب میرے اور تمہارے لئے صرف ایک ہی صورت ہے۔ صرف ایک ہی صورت۔" اس نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ ایک بار پھر اس کے چہرے پر پیلاہٹیں دوڑ گئیں اور وہ گھونسہ اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارنے لگا۔ پھر وہ بے چینی کے عالم میں مجھ سے دور ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ سوچتا رہا اور پھر اس نے مجھ سے کہا۔

"سنو، تم ایک کام کرو۔ غسل خانے میں جاؤ اور فلش کی ٹینکی پر چڑھ کر روشن دان
جالی کاٹنے کی کوشش کرو۔"

"لیکن کیسے مورالس؟" میں نے بے چین سے لہجے میں سوال کیا۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں۔" اس نے کہا اور وائسرائے کی میز سے ہاتھی دانت کے د
کا فولادی کاغذ تراش اٹھا لیا اور میری طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ "دیکھو...... تم یہ کوشش
دیکھو۔ اگر کامیابی نہ ہوئی تو میں تمہیں یہاں سے نکلنے کا آخری طریقہ بتاؤں گا۔ بہرحا
یہ کوشش تو کرنی چاہئے، باقی بات بعد میں کریں گے۔"

نجانے کیوں مجھے اس کا لہجہ بے حد کمزور محسوس ہوا تھا۔ وہ جس کیفیت کا شکار تھا و
تھا ہی لیکن میں دوہری کیفیت کا شکار تھا۔ البتہ مورالس کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں
تھی۔ اگر یہاں سے نکلنے کی کوئی اور صورت اسے معلوم ہے تو وہ بتاتا کیوں نہیں
یہی سوچا جا سکتا ہے کہ اب اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن بہرحال میں
سوچا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، اسی پر عمل کیا جائے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ چنانچہ اپنا اطمینا
کرنے کے بعد میں غسل خانے میں جا کر فلش کی ٹینکی پر چڑھنے کی ترکیب سوچنے
غسل خانے میں داخل ہو کر ابھی میں اس کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ چیمبر سے اچا
مجھے ایسی آواز آئی جیسے غبارہ پھٹا ہو۔ ایک لمحے کے لئے تو یوں لگا جیسے مورالس نے
کوئی خفیہ دروازہ کھولا ہے۔ کون سا خفیہ دروازہ ہو سکتا ہے؟ یہ سوچ کر میں چیمبر م
گیا اور میں نے دیکھا کہ وہ الماری پر جھکا ہوا ہے۔ پھر وہ آہستہ سے مڑا اور پھسل
قالین پر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے دیکھا اور بے اختیار میرے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر
گئے۔ میرے خدا...... میرے خدا...... میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی کنپٹی میں ا
سوراخ بن گیا تھا اور خون اس سوراخ سے نکل کر اس کے کپڑوں اور قالین پر گر رہا تھ
اس کے ہاتھ میں سروس ریوالور تھا اور ریوالور کی نالی پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔ اس
بجھتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور الماری سے ٹک گیا اور اس کی گردن
قدرتی زاویئے پر مڑ گئی۔

آہ...... بھوج پتر پر بنی ہوئی تصویر نمایاں ہو گئی تھی۔ میں نے جب پہلی بار اس شخص
دیکھا تھا تبھی چونکا تھا اور وہ بے چارہ غلط فہمیوں کا شکار ہو گیا تھا۔ موت اس کے بھائی
نہیں، اس کی ہونی تھی۔ یہی تصویر تھی وہ۔ بالکل یہی تصویر تھی۔ میں سکتے کے عالم

کھڑا رہا لیکن پھر اچانک ہی مجھے اپنی فکر ہوئی۔ میں وہاں سے ہٹ گیا۔ سرکاری رازوں کا محافظ موت کے بعد بھی اہم ترین کاغذات کی تجوری پر پہرہ دے رہا تھا۔ میرے پاؤں میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ میں چکرا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ آہ...... کیا کروں۔ اب کیا کروں؟ میں نے سوچا۔ جس سنگین صورتحال سے میں دوچار تھا اس کا پورا پورا ادراک مجھے تھا۔ وائسرائے کے چیمبر میں پایا جانا کیا ہو سکتا ہے، یہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ جتنی بڑی مصیبت میں، میں گرفتار ہونے جا رہا تھا اس کا مجھے بھرپور احساس تھا۔ اب مجھے صبح تک یہاں رہنا ہو گا اور صبح کو جب فیوری یہاں آئے گی تو میں یہاں ایک لاش کے ساتھ پایا جاؤں گا۔ گویا دوہرے سنگین جرم کا مجرم ہوں گا میں۔ جاسوسی اور ایک انگریز سرکاری افسر کا قاتل۔

میں سر پکڑے سوچ رہا تھا کہ اب میرا کیا ہو گا؟ بچپن سے اب تک کی زندگی میری آنکھوں میں گھوم گئی۔ بے شک میں بہت سی بار کیسی کیسی بلاؤں میں گرفتار ہوا تھا اور اب جبکہ زندگی کا لطف اٹھانے کا وقت آیا تھا تو بھری جوانی میں کس قدر ذلیل موت مارا جاؤں گا۔ واقعی یہ ذلیل موت اب میرا مقدر بن چکی تھی اور کوئی مجھے بچانے والا نہیں تھا۔ وہ سب مجھ سے شاید منحرف ہو گئے تھے۔ پتہ نہیں کس کس نام سے مجھے مخاطب کیا جاتا تھا۔ بڑی عزت، بڑا مقام دیا جاتا تھا۔ اگر میں کوئی مافوق الفطرت ہستی تھا بھی اور اگر مجھے روحانی قوتیں حاصل تھیں تو اس وقت یہ سب کیا ہوا؟ کیا میں واقعی ان حالات میں بدنامی کی موت مارا جاؤں گا؟ یا وہ پراسرار قوتیں میرا دفاع کرائیں گی؟ نجانے کیسے کیسے احساسات میرے دل میں پیدا ہوتے رہے۔ وہی تصور اس وقت مجھ پر حاوی ہو گیا تھا۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ برے حالات میں انسان کو اپنا ایمان سنبھالنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں اب تک ان تمام چیزوں سے نفرت کرتا رہا تھا۔ یہ سوچتا رہا تھا کہ وہ سب غیر ایمانی چیزیں ہیں۔ لیکن اس وقت میرے دل میں یہی خیال آ رہے تھے کہ اگر میں بودھی ستو ہوں، میں روحانی پیشوا بننے والا ہوں تو کیا اس وقت وہ پراسرار قوتیں میری مدد کریں گی؟ میرے پاس وہ بھوج پتر تھا جو نجانے اب کہاں ہے۔ پھر مجھے وہ ریاضتیں یاد آئیں جو مجھے سیوک سندھورتی اور وردان سادھانی نے سکھائی تھیں۔ کیا یہاں سے بچ نکلنے میں کوئی ریاضت میرے کام آ سکتی ہے؟ دھت تیرے کی۔ جن چیزوں سے میں بچ رہا تھا اور جنہیں میں نے نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا اس وقت وہی

میرے سر پر مسلط ہو گئی تھیں اور میں ان کے بارے میں مختلف انداز میں سوچ رہا تھا۔

میں نے سامنے پڑی ہوئی مورالس کی لاش پر نگاہ ڈالی اور مختلف انداز میں سوچنے لگا۔ یہاں ایک لاش موجود ہے۔ میں اس پر اشبھ بھاونا کر سکتا ہوں۔ اس منحوس ریاضت سے مجھے شاید بچ نکلنے کا راستہ ملے، شاید مجھے کوئی روحانی طاقت حاصل ہو جائے۔ چنانچہ میں نے کوٹ اتار دیا اور مورالس کی لاش کے روبرو آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ مجھے وردان سادھانی کے کہے ہوئے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ اس نے ریاضت کا طریقہ یہ بتایا تھا کہ کسی ایسی لاش پر دھیان لگایا جائے جو نیلی پڑ گئی ہو یا جس میں سوراخ ہو یا جس کے اعضاء بکھر گئے ہوں یا جس میں سے خون بہتا ہو۔ مورالس کی لاش اس کی آخری شرط پر پوری اترتی تھی۔ ہیگ کی غیر معمولی قوتِ ارادی سے مات کھایا اور جھنجھلایا ہوا میں مورالس کی لاش کے سامنے بیٹھا تھا۔ لڑکپن ہی سے میرے ذہن میں یہ بات بٹھا دی گئی تھی کہ حالات سے مجبور ہو کر ہار مان لینا مردوں کا شیوہ نہیں ہے۔ میں نے اپنے والد صاحب کے ساتھ جنگلوں اور ویرانوں میں ہنسی خوشی بھوک، تھکن اور سختیاں جھیلی تھیں۔ میں نے یہ سیکھا تھا کہ شکست کا سامنا ہو تو اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے اور اس سے دلبرداشتہ نہیں ہونا چاہئے۔ شدید غصے اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں، میں نے یہ سوچا کہ اس قید اور یقینی موت سے بچنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں ہے۔ مگر میں خاقان جمشیدی یا پھر ان شیطانوں کے خیال میں بودھی ستو یعنی مستقبل کا مہتر بدھ کوئی معمولی ہستی نہیں ہوں۔ مجھے چوہے کی موت نہیں مرنا چاہئے۔ وہ لوگ آئیں گے، مجھے گرفتار کر لیں گے اور اس کے بعد میری جو تحقیر ہو گی، میں جانتا ہوں۔ اور بات مجھ تک ہی محدود نہیں رہے گی۔ میرے بارے میں تحقیقات کرنے سے پتہ چلے گا کہ میں تو سیتا گڑھی کے ایک بہت بڑے زمیندار کا بیٹا ہوں۔ سیتا گڑھی کی عزت پر داغ لگ جائیں گے۔ میرے خاندان کا نام بدنام ہو جائے گا۔ نہ صرف بدنام ہو جائے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ انگریز حکومت میرے والد پر بھی ہاتھ ڈال دے۔ کیونکہ اتنے بڑے اور پھر انگریز افسر کی موت کو وہ لوگ آسانی سے ہضم نہیں کریں گے۔ یہ تمام واقعات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے اور میں تیار ہو گیا تھا کہ صبح ہونے سے پہلے اس منحوس عمارت سے باہر نکل جاؤں۔

میں نے ذہن کی تمام قوتیں مورالس کی لاش پر منتقل کر دیں۔ کاش! مجھے معلوم ہوتا کہ میرا یہ عمل آخر کار مجھے تباہ کر دے گا اور میں عمر بھر کے لئے مصیبت میں گرفتار ہو

جاؤں گا۔ کاش میں نے اشبھ بھاونا کرنے سے پہلے سادھانی کے کہے ہوئے الفاظ اچھی طرح یاد کر لئے ہوتے۔ اس لئے کہ جب وہ الفاظ مجھے یاد آئے تو قیامت گزر چکی تھی۔ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ میرا کردار، میری شخصیت، خاقان جمشیدی، اس کا ایمان، اس کا حسب نسب سب کچھ تباہ ہو گیا تھا۔ وہ ایمانی قوتیں جو مجھے سہارا دے سکتی تھیں، میرا ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ کیونکہ میں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور اس کی بجائے شیطان کی برتری قبول کر لی تھی۔ مجھے اس وقت وردان سادھانی کی وہ بات یاد آئی کہ اشبھ بھاونا آخری ریاضت ہے، اسے چاروں عملی ریاضتوں کی تعمیل کے بعد کرنا چاہئے ورنہ اس سفلی ریاضت کے بھیانک نتائج نکل سکتے ہیں۔ جبکہ میں نے ایک بھی عملی ریاضت نہیں کی تھی۔ میری ابتدا ہی غلط تھی۔ میں نے سب سے پہلے شیطان کی قربت سے آغاز کیا تھا اور شیطان بہرحال اس تاک میں رہتا ہے کہ انسانوں کو کس طرح نقصان پہنچائے۔

نجانے کتنی دیر تک میں لاش پر دھیان لگائے رہا۔ مجھے اس کا تو اندازہ نہیں ہے۔ بس اتنا احساس ہے کہ میرا بدن پسینے سے تر ہو گیا اور آنکھوں کے آگے مکمل اندھیرا چھا گیا۔ اس اندھیرے میں ننھے ننھے جگنو چمکنے لگے تھے۔ میں بت کی طرح دھیان سمادھی کے انداز میں آلتی پالتی مارے بیٹھا، دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے پلک جھپکائے بغیر اس لاش کو گھورے جا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی مجھے یوں لگا جیسے میری پیشانی پر دونوں بھنوؤں کے درمیان میں کوئی تیز نشتر اتر گیا ہے۔ اس شدید تکلیف سے ایک لمحے کے لئے دھیان بکھرنے لگا۔ مگر میں نے پوری قوت سے خود کو سنبھالا اور لاش پر توجہ جمائے رکھی۔

پھر میری یہ کوشش رنگ لائی اور میں نے دیکھا کہ اس لاش میں سے ایک دوسرا وجود رنگ لا رہا ہے۔ دوسرا وجود جو مورالس ہی کا تھا۔ وہ نہ تو زندہ تھا اور نہ مُردہ۔ یہ اجنبی وجود اس کی نیم دراز لاش سے نکل کر سیدھا کھڑا ہوا اور قدم قدم چلتا ہوا میری جانب بڑھنے لگا۔ پھر وہ میرے قریب پہنچا۔ یہ مورالس کا ہمزاد تھا یا سایہ جو کچھ بھی تھا، ایک لمحے تک وہ میرے قریب رُکا اور پھر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ میرے دونوں ہاتھ اسے پکڑنے کے لئے بڑھے لیکن خلا میں ناچ کر رہ گئے۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہوا کہ میں نے وردان سادھانی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمل نہیں کیا ہے۔ چنانچہ میں نے لاش پر دوبارہ دھیان لگا دیا۔ مورالس کو اشبھ بھاوناؤں کے تحت میرے وجود میں منتقل ہونا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور یہ ضروری تھا کہ میں اس شے کو جو لاش سے اتر کر میری طرف آ

رہی ہے، اپنے وجود میں منتقل کر لیتا۔ اپنے سراپا میں اتار لیتا۔ اس صورت میں اٹھ بھاونا مکمل ہوتی تھی۔ میں پھر یہ کام کرتا رہا اور میں نے اس بار سوچا کہ میں وہی کروں گا جو مجھے بتایا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے محسوس کیا کہ دوسری بار مورالس یا اس کا سایہ اپنی لاش سے نکل کر میری طرف بڑھا۔ میں نے اپنی توجہ برقرار رکھی۔ وہ پراسرار وجود میری طرف آیا اور میں نے اسے اچانک ہی اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اور جیسے ہی میں نے اسے اپنے سینے سے لگایا، میرا پورا بدن آگ کی طرح تپنے لگا۔ آہ...... اس قدر اذیت، اس قدر وحشت خیزی۔ اس آگ کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ سرد ہے یا گرم۔ بس میرے سارے وجود میں یوں لگتا تھا جیسے موٹی موٹی سوئیاں چبھ گئی ہوں۔ میرا سر چکرانے لگا تھا۔ اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ میں بلندی سے نیچے گرنے لگا۔ اس قدر گہرائیوں میں جن کا تصور بھی نہ کیا جا سکے۔ میرا بدن الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کبھی سر کے بل جاتا ہوں اور کبھی پیروں کے بل اور کبھی لیٹنے کے انداز میں گرنے لگتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں زمین پر گر پڑا۔ کیا عجیب کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ بہت دیر تک سر چکراتا رہا اور آخر کار میں نے آنکھیں کھول دیں۔ مورالس کی لاش تو جوں کی توں پڑی ہوئی تھی اور میں اس سے کچھ فاصلے پر پسینے میں شرابور چت پڑا ہوا تھا۔ آہ...... اس قدر کمزوری ہو گئی تھی میرے جسم میں کہ محسوس ہو رہا تھا کہ اپنی قوت سے میں اپنا ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتا۔

تھوڑی دیر تک میں اسی طرح بے سدھ پڑا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر میں کون ہوں؟ کیا صرف خاقان جمشیدی یا پھر این مورالس؟ ان دونوں میں سے کیا ہوں؟ لیکن مجھے لگ رہا تھا جیسے دونوں وجود میرے اندر یکجا ہو گئے ہوں۔ پھر میں خود کو کیا کہوں...... کیا کہوں؟ میں بمشکل تمام اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے گرد تیز ہوائیں چل رہی ہوں۔ میرے کان شدید سنسناہٹ محسوس کر رہے تھے۔ لیکن اب میرے ہاتھوں پیروں کی قوت بحال ہوتی جا رہی تھی۔ میرا ذہن اس طرح صاف ہوتا جا رہا تھا جیسے کوئی ذہن پر لگے ہوئے برسوں کے جالے اتار رہا ہو۔ مجھے اندر سے جھاڑ پونچھ کر صاف کر رہا ہو۔ میرا دماغ روشن ہوتا جا رہا تھا۔

میں سکیورٹی آفیسر خاقان جمشیدی ہوں...... نہیں، میں سکیورٹی افسر نہیں بلکہ آئی سی ایس کا ایک جونیئر ممبر ہوں...... یہ وائسرائے کا چیمبر ہے اور میں اس میں بند ہوں......

چھ بجے ایلس فیوری تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی آئے گی اور چیمبر کا دروازہ کھولے گی۔ پھر جیسے ہی اس کی نظر این مورالس کی لاش پر پڑے گی تو وہ چاروں طرف دیکھے گی اور اسے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ چیمبر میں اور کوئی بھی ہے۔ وہ دروازے کے فریم میں لگا ہوا خفیہ بٹن دبا دے گی جس سے گارڈ روم میں گھنٹی بجے گی اور پلک جھپکتے ہی مسلح گارڈز چیمبر کے دروازے پر گھیرا ڈال دیں گے۔

ان خیالات پر میں خود چونک پڑا۔ حیرانی کی بات تھی کہ ان حفاظتی اقدامات کا علم صرف وائسرائے کارل بروکس یا اس کی اسسٹنٹ ایلس فیوری کو تھا۔ مجھے یہ تمام باتیں کہاں سے معلوم ہو گئیں؟ کیا میں مورالس کے مُردہ ذہن میں جھانک سکتا ہوں؟ معلوم نہیں کیا اسرار تھا۔ لیکن اب مجھے معلوم تھا کہ ہنگامی صورتحال میں وائسرائے کی پرسنل سیکرٹری کو کیا کچھ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ چنانچہ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے فوری طور پر اپنے تحفظ کے اقدامات کرنے تھے۔

میں برق رفتاری سے دروازے کی جانب بڑھ گیا اور پھر میں نے بھاری مخمل کے پردے ہٹا کر انگوٹھے کے برابر سوراخ کو تلاش کیا جو عام حالات میں نظر نہیں آتا تھا۔ اس سوراخ میں اسی رنگ کا بٹن لگا نظر آ رہا تھا۔ خطرے کا الارم یہاں سے بجایا جاتا ہے۔ مجھے اس وقت اپنے تحفظ کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا تھا اور وہ کام یہ تھا کہ اسی وقت میں خطرے کا الارم بجا دوں۔ مورالس کے ریوالور میں ابھی چھ گولیاں ہیں۔ وہ لوگ دروازہ کھولیں گے تو میں اپنے سامنے اور دائیں بائیں گولیاں چلاتا ہوا نکل بھاگوں گا۔ کیا مجھے ایسا کرنا چاہئے؟ نہیں، یہ بہت ہی بچکانہ خیال ہے جبکہ محافظوں کے پاس تو زبردست آٹومیٹک ہتھیار ہوا کرتے ہیں۔ وہ مجھے بھون کر رکھ دیں گے۔ میرا یہ اقدام بالکل غیر مناسب ہے۔

چنانچہ سب سے پہلے کام میں نے یہ کیا کہ ہال میں ایک طرف جو خوبصورت اسکرین پڑا ہوا تھا میں نے اسے کھینچ کر میز کے ساتھ لگایا۔ اب الماری اور لاش اس کے پیچھے چھپ گئے تھے۔ دروازے سے اندر داخل ہونے والے کو فوری نظر نہیں آ سکتے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی، صبح ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔ گویا ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ایلس فیوری چیمبر میں آئے گی۔ اصولاً اسے اپنے ساتھ دو ملازم لانے چاہئیں جو فرش وغیرہ کی صفائی کرتے ہیں۔ لیکن ان سے کمرے کی صفائی کرانے سے پہلے وہ خود کمرے میں آتی

ہے اور کمرے کے ماحول پر ایک نگاہ ڈالتی ہے۔ تمام کاغذات ٹھیک کر کے وہ صف کرنے والے کو چیمبر میں بلاتی ہے۔ یہی اس کا روزانہ کا معمول ہے۔ لیکن نہیں، آ چونکہ وائسرائے موجود نہیں ہے، اس کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ کاغذات کی دیکھ بھا نہیں کرے گی اور براہِ راست صفائی کرنے والوں کو لے کر صفائی کرانے آ جائے گ ہاں، یقیناً ایسی صورت میں مورالس کے سائلنسر لگے ریوالور سے ایلس فیوری اور ا دونوں ملازموں کو ٹھکانے لگانا آسان کام ہو گا۔ اس کے بعد میں آرام سے ٹہلتا ہوا با جاؤں گا۔ لیکن تین آدمیوں کو اتنی آسانی سے گولی کا نشانہ بنانا کہ ان میں سے کوئی گا روم والوں کو ہوشیار نہ کر پائے، بڑا مشکل کام تھا۔ بہرحال جیسا بھی ہو گا، دیکھا جا گا۔ اور یہی فیصلہ مناسب تھا۔

آنے والے وقت کا ایک ایک لمحہ میری نگاہوں کے سامنے تھا اور ابھی تک میرا ذ اس طرف راغب نہیں ہوا تھا کہ میں یہ سمجھوں کہ جو کچھ ہونے والا ہے اس کا علم پہلے سے کیسے ہو گیا ہے۔

بہرحال میں نے آگے بڑھ کر لاش کے ہاتھ میں سے ریوالور لیا اور اپنی پتلون جیب میں ڈال لیا۔ صبح ہونے میں اب زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا۔ ہر رخنے سے روشنی آمد آمد کا اعلان ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ فیوری اگر تنہا آئے تو میرا کام بڑا آسان جائے گا۔ کیونکہ اس کے بعد میں اسے اتنا موقع نہیں دوں گا کہ وہ خطرے کا الارم سکے یا شور مچا سکے۔ آرام سے اسے ٹھکانے لگا کر میں چیمبر کا دروازہ بند کر دوں گا ا دوسری طرف سے ٹہلتا ہوا گارڈ روم میں پہنچوں گا اور باہر نکل جاؤں گا۔

پتہ نہیں کتنی دیر اسی طرح گزر گئی۔ اچانک میں نے ایک آہٹ سنی اور جھپٹ دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ برآمدے کے فرش پر کسی کے تیز قدموں کی آواز آ ر تھی۔ باہر درختوں پر چڑیوں نے بولنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ صبح ہو گئی میرے کان ان آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ اور ایک دم میرے ذہن میں روشنی ہوئی۔ مجھے پتہ چل گیا کہ وہ ایلس فیوری ہی ہے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال ریوالور نکال لیا اور دانت بھینچ کر ایلس فیوری کو ایک گندی سی گالی دی۔ عجیب بات تھی اس وقت مجھے گھٹیا اور بازاری باتیں سوجھ رہی تھیں۔ ایسی باتیں جو میرے مزاج مناسبت نہیں رکھتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ میں پردے کے پیچھے چھپ جاتا ہوں۔ ج

ہی وہ چیمبر میں داخل ہو گی، میں ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کروں گا اور اس کے سینے پر ریوالور رکھ کر اسے داغ دوں گا۔

قدموں کی چاپ دروازے کے قریب آ کر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد چابیاں بجنے کی آواز ابھری اور پھر بھاری دروازہ بے آواز کھلنا شروع ہو گیا۔ سینٹ کی خوشبو کا ایک جھونکا سا آیا اور پھر کسی کے حلق سے حیرت اور خوف کی دبی ہوئی سسکاری سی نکلی۔ ایلس فیوری کو شاید اسکرین کو غلط جگہ دیکھ کر کسی گڑبڑ کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ واقعی ایک خطرناک عورت تھی، اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ لیکن میں پردے کے پیچھے خطرے کے بٹن کو چھپائے کھڑا ہوا تھا۔ ایلس کا ہاتھ خود بخود خطرے کے بٹن کی جانب بڑھا اور میرے بدن سے ٹکرایا۔ وہ دہشت بھری آواز میں چیخ مارنے ہی والی تھی کہ میں نے پھرتی سے آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کر دیا۔ مارے خوف کے اس کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں۔ اس نے ایک زوردار جھٹکا مجھے دیا اور میری گرفت سے نکل جانا چاہا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے احساس ہوا کہ اس کے دُبلے پتلے بدن میں بلا کی قوت ہے۔ لیکن بہرحال وہ عورت تھی اور اس وقت میں ایک معمولی انسان نہیں تھا۔ میرے اندر دوہرے وجود کی طاقت تھی۔ ایک شیطانی طاقت۔ میں نے اسے جھٹکا دے کر قالین پر گرا لیا اور اس کے ہاتھ سے چابیوں کا گچھا ایک چھناکے سے دور جا گرا۔ ایک لمحے کے اندر آگے کا منصوبہ میرے ذہن نے سوچا کہ میں اسے قتل کر کے چیمبر کو مقفل کر دوں گا اور چابیاں لے کر یہاں سے فرار ہو جاؤں گا۔ وائسرائے تو موجود نہیں ہے۔ اگر ایلس فیوری اور چیمبر کی چابیاں شام تک بھی نہ ملیں تو کسی کو اتنی تشویش نہیں ہو گی۔ میں اس عرصے میں کہیں کا کہیں نکل چکا ہوں گا۔

میں نے بدن کا پورا بوجھ ڈال کر اسے فرش پر گرا رکھا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے منہ پر تھا اور دوسرا جس میں ریوالور تھا اس کے نیچے پھنسا ہوا تھا۔ میں نے ریوالور والا ہاتھ کھینچ کر سائلنسر لگا ریوالور اس کے سینے پر رکھا۔ وہ میری گرفت میں بری طرح مچل رہی تھی۔ اس کا چہرہ دہشت سے پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کا چشمہ اتر گیا تھا اور بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں سہمے ہوئے کبوتر کی طرح بے چین تھیں۔

نجانے کیوں میرے اندر ایک عجیب سی تبدیلی رونما ہوئی۔ میرا ریوالور والا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ فیوری بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ آہ، لیکن یہ سوچ

میری نہیں تھی۔ یہ سوچ تو این مورالس کی تھی۔ میں تو آج تک حسین سے حسین لڑکیوں کو خاطر میں نہیں لایا تھا۔ ایلس فیوری کے بارے میں، میں اس انداز میں نہیں سوچ سکتا تھا۔ لیکن اس وقت میرا وجود ایک نہیں بلکہ دو حصوں میں تقسیم تھا۔ مورالس کے وجود میں میں نے سوچا کہ یہ کمبخت عورت مجھ سے ہمیشہ اجتناب کرتی رہی ہے۔ میری لاکھ کوششوں کے باوجود وہ مجھ سے دور رہی ہے۔ آج یہ میرے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ چنانچہ اس وقت اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہے۔ میں اپنے اندر شدید کشمکش محسوس کرنے لگا۔ یہ سوچ میری نہیں، مورالس کی تھی جو بھرپور طریقے سے میرے اندر تھا۔ بہت شدید اُلجھن میں پڑ گیا تھا میں۔ میں نے تو اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس کے لئے کسی قسم کی پسندیدگی کا پیدا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ لیکن مورالس مجھ پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ میں نے ریوالور دور پھینک دیا اور اس کے بکھرے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ تبھی میرے حلق سے ایک آواز نکلی۔

"فیوری! تمہارے بال بہت خوبصورت ہیں۔" آہ، یہ آواز میری نہیں تھی۔ میں نے پھر کہا۔ "میں تمہیں چاہتا ہوں فیوری! تمہارے بدن سے آنے والی یہ خوشبو ہمیشہ مجھے پاگل کر دیتی ہے مگر تم نے کبھی میری پذیرائی نہیں کی۔"

میں نہیں بول رہا تھا، میرے کان میرے منہ سے نکلنے والی آوازیں سن رہے تھے۔ یہ میری نہیں، مورالس کی آواز تھی۔ مجھے اپنے آپ سے خوف محسوس ہونے لگا اور اسی کشمکش میں اس کے منہ پر رکھا ہوا میرا ہاتھ ذرا سا ڈھیلا پڑا تو فیوری نے ہسٹریائی انداز میں چیخ ماری۔ اس کے حلق سے وحشت زدہ آواز نکلی۔

"گارڈز...... گارڈز......" اور دوسرے لمحے میں سنبھل گیا۔ میں نے اپنی گرفت سخت کر دی اور لیٹے ہی لیٹے فرش پر ایک گھٹنا ٹیک کر دوسرا گھٹنا اس کے سینے پر رکھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"فیوری! تم نہیں جانتی کہ میں کب سے تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔ میں نے جب بھی اپنے جذبے کا اظہار کیا تم نے حقارت سے مجھے ٹھکرا دیا۔ اتنے دن گزر گئے پھر بھی میرے اور تمہارے درمیان بے کیف رسمی تعلقات سے آگے بات بڑھ ہی نہ سکی۔ آہ...... لیکن میں...... میں اب تمہیں اس طرح نہیں چھوڑوں گا۔" میرے اندر وحشت ابھر آئی مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی آدم خور ہوں اور اسے کھا جانا چاہتا ہوں۔ فیوری اپنے آپ

چھڑانے کے لئے بے پناہ مچل رہی تھی۔ میں نے اس کے ریشمی بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر دو تین جھٹکے دیئے۔ وہ نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑی تو میں نے کہا۔

"بہت حسین ہو تم فیوری! بہت حسین ہو۔"

میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں خوف، دہشت کی بجائے حیرت تھی۔

"میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ سمجھیں...... میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

میں وحشیوں کی طرح اسے بھنبھوڑنے لگا۔ اس کا لباس تار تار ہو گیا۔ اس نے زخمی شیرنی کی طرح پنجہ مار کر میرا منہ نوچنے کی کوشش کی لیکن اس وقت میرا زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔ میں کیا کر رہا تھا، ایک بار پھر میرے اندر ایک جنون سا ابھرا۔ میری نوجوانی بے داغ تھی۔ ایلس فیوری عمر میں مجھ سے بے حد بڑی تھی۔ میں ایک مہذب گھرانے کا پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ ذمہ دار سرکاری افسر تھا۔ میں نے آج سے پہلے فیوری کو اس نظر سے دیکھا تک نہ تھا تو پھر یہ سب کیا ہے؟ بڑا خوفناک ماحول ہو گیا تھا۔ اسکرین کے پیچھے سینئر آفیسر کی لاش خون میں تربتر پڑی تھی اور میں اس کی محبوبہ کو وحشیوں کی طرح بھنبھوڑ رہا تھا۔

بہر حال آہستہ آہستہ فیوری کی مزاحمت ختم ہو گئی اور میں نے محسوس کیا کہ اب وہ خوف و دہشت کے لمحات سے نکل آئی ہے۔ اس کے اندر ایک سکون سا پیدا ہو گیا ہے۔ ایک عجیب سا سکون۔ لیکن یہ ساری چیزیں اس وقت مجھے متاثر نہیں کر رہی تھیں۔ میں نے فیوری کے انداز میں خودسپردگی دیکھی اور پھر وہ لمحات گزر گئے جنہوں نے مجھ سے میری شخصیت چھین لی۔ سب سے پہلے میرا کردار قتل ہو گیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ فیوری میرا مکمل طور پر ساتھ دے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر عجیب سا سکون تھا۔ جیسے سوتے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ پھر اس کی آواز میرے کان میں ابھری۔

"خاقان! میری جان، میری روح!"

میں پھر چونکا۔ میں خاقان ہوں کیا؟ یہ جو کچھ ہوا ہے، خاقان کے ذریعے ہوا ہے؟ خاقان جمشیدی، ہمدان جمشیدی کا بیٹا۔ ایک بلند کردار اور صاحب عزت آدمی۔ میں درندہ کیسے بن گیا؟ نہیں، میں خاقان نہیں ہوں اور میں مورالس بھی نہیں ہوں۔ کیونکہ مورالس کا بدن تو الماری سے ٹیک لگائے کبھی کا اکڑ گیا ہو گا۔ یہ میرا بدن تھا ہی نہیں۔ یہ تو کوئی

اور تیسری ہی شخصیت تھی۔ اور جہاں تک ایلس فیوری کا تعلق تھا بے شک اس کے کر
کوئی حرف نہیں لایا جا سکتا تھا کیونکہ میں نے اسے اس برائی کی جانب آمادہ کیا تھا
پھر صورتحال ایک دم تبدیل ہوئی۔ ایلس فیوری کی نگاہ اس سٹینڈ کے دوسری جانب
اور اس نے بڑی آسانی سے مورالس کی لاش کو دیکھ لیا اور اس کے بعد میں اگر فیور
منہ نہ بند کر دیتا تو وہ یقیناً ایسی بھیانک چیخ مارتی جو چیمبر کی سنگیں دیواروں کے پا
روم تک سنی جاتی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے محبت
میری قربت کا جو احساس اسے نرم کرنے کا باعث بنا تھا، وہ مدھم پڑتا جا رہا تھا
پاگلوں کی طرح کبھی لاش کو دیکھتی کبھی میرا منہ تکتی۔

''آہ...... تم نے اسے کیوں قتل کر دیا؟ تم نے...... تم نے اوہو...... میرے خدا
میرے خدا تم نے این مورالس کو زندگی سے محروم کر دیا۔ آخر کیوں...... آخر کیوں؟''

میں نے اسے محبت سے صوفے پر بٹھا دیا اور دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''تم یقین
فیوری! میں نے اسے نہیں مارا۔ میں تو کسی کو قتل کر ہی نہیں سکتا۔ اس نے خودکشی کی

''بکواس کرتے ہو کتے...... ذلیل، کمینے، تم نے اسے قتل کیا ہے۔ تم نے اسے قت
ہے۔ تم اس کے قاتل ہو۔'' وہ مجھے دھکا دے کر اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازے کی جا
بھاگی۔ میں صوفے سے الجھ کر گرتے گرتے بچا تھا۔ مجھے اپنی موت سامنے نظر آ رہی
فیوری اگر دروازے تک پہنچ گئی تو پھر میرے بچنے کی آخری امید بھی ختم ہو جائے
چیمبر کا دروازہ جو مقفل نہیں تھا، یہ نازک اندام عورت آسانی سے نہیں کھول سکتی تھی
خطرے کا بٹن تو دبا سکتی ہے۔ میں نے ایک بار پھر آخری کوشش کی اور پھر چیخ کر کہا

''فیوری! خدا کے لئے رُک جاؤ...... پوری بات تو سن لو۔'' نجانے میرے لہجے
کیا اثر تھا کہ وہ رُکی، اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں خوف اور نفر
ملا جلا تاثر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

''وحشی، کمینے، تم قاتل ہو۔ تم کالی نسل کے لوگ کسی کے وفادار نہیں ہوتے۔ تم
نے...... تم نے مورالس کو مار ڈالا۔'' وہ لڑکھڑائی اور شیشم کے قد آدم لیمپ کا سہارا
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں دیکھتا رہا۔ اور اس وقت اس کے پیروں کے پاس
این مورالس کا ریوالور پڑا ہوا نظر آیا۔ وہ آنسو بہا رہی تھی اور نفرت بھری نگاہوں
مجھے دیکھتی جا رہی تھی۔ اور پھر شاید اس نے میری نگاہوں کے تعاقب میں ہی اس ر

کو دیکھا۔ بجلی کی طرح تڑپ کر اس نے ریوالور اٹھا لیا اور اس کا رخ میری جانب کر دیا۔
میں جو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا، ایک بار پھر اپنی کوشش میں ناکام ہو گیا۔ لیکن اس وقت
اگر مکاری سے کام نہ لیتا تو زندگی کے بچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ صورتحال ایسی ہی
ہو گئی تھی۔ ہر لمحہ میرے خلاف ایک مستحکم حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ چنانچہ میں نے
مصلحت سے کام لے کر انتہائی نرم لہجے میں کہا۔

''فیوری! تم یقین کر لو میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ پوری بات میں تمہیں اس وقت
نہیں بتا سکتا فیوری۔ کسی بھی طرح مجھے یہاں سے نکال دو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں
گا۔ ہم دونوں سازش کا شکار ہوئے ہیں فیوری! تم یقین کرو ایک ایسی سازش کا شکار
ہوئے ہیں ہم کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ لیکن جب تمہیں اس کے بارے میں
معلومات حاصل ہوں گی تو تم مجھے بالکل بے گناہ سمجھ لو گی۔''

''کتے...... کتے، وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ وہ تیری طرح جانور نہیں تھا۔ سمجھا؟ تیری
طرح جانور نہیں تھا وہ۔'' فیوری نے بدستور نفرت بھری آواز میں کہا۔

''اوہ...... فیوری، فیوری، تم میری بات تو سمجھو۔''

لیکن فیوری پر ایک دم دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ اس نے ریوالور سیدھا کیا اور میں نے
ایک دم پیچھے چھلانگ لگا دی۔ اس نے گولی چلا دی تھی لیکن پیچھے چھلانگ لگاتے ہوئے
میں مورالس کے بدن سے ٹکرایا۔ گولی مجھے نہیں لگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ مورالس کی
لاش ایک طرف لڑھک گئی۔ وہ اب بھی فرش پر اوندھی پڑی تھی اور اب اس کے پہلو میں
بھی ایک سوراخ بن گیا تھا۔ میں تیزی سے میز کے اندر سے ہو کر ایک جانب رینگ
گیا۔ لیکن جس جگہ میں نے پناہ لی تھی وہاں سے فیوری نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن ایک لمحے
کے اندر اندر میرا ذہن یہ کہہ رہا تھا کہ میرے بچنے کی صرف ایک ہی اُمید ہے اور وہ یہ
کہ کسی طرح فیوری سے ریوالور چھین لوں اور اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کروں۔
نرم قالین پر کسی طرح کی آواز پیدا ہونے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم
تھا کہ وہ اپنی جگہ کھڑی ہے یا میری جانب بڑھ رہی ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے
اندھیرے کمرے میں مجھے قابو کرنے کی کوشش کی ہو۔ لیکن میں بچ رہا تھا۔ میں سوچ رہا
تھا کہ اب کچھ ہی لمحے جا رہے ہیں جب فیوری مجھ پر مسلسل فائرنگ کرے گی اور کوئی نہ
کوئی گولی مجھے لگ جائے گی۔

بہرحال میں دیوار کے ساتھ رینگتا ہوا میز کے گرد چکر لگا کر دوسری طرف
فیوری میری طرف سے غافل نہیں تھی۔ جونہی میں نے سر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش ک
فولاد کی نال میری ٹھوڑی سے آ لگی اور فیوری کی غراہٹ ابھری۔

"اٹھو...... کتے، میں تجھے اپنے ہاتھ سے ہلاک نہیں کروں گی۔"

مجھے ایک بات پر شدید حیرت ہوئی۔ کچھ لمحے پہلے جو عورت میری بانہوں می
حال ہو رہی تھی اور ایک دم مجھ سے متاثر ہو گئی تھی، اب اس کے لفظ اور لہجہ انتقام
پکار رہا تھا۔ میں بزدل اور عیار نہیں تھا لیکن اشبھ بھاونا کے بعد مجھ پر کیا کیا قیامتیں
رہی تھیں۔ میں نے اپنی فطرت کے خلاف اپنی پاکیزگی داغدار کر لی تھی اور ا
چیونٹیوں کی طرح رینگتا ہوا موت سے چھپتا پھر رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ا
بھی ان حالات میں اس بات پر غور کر سکتا تھا کہ میری شخصیت داغدار ہوئی ہے ا
نادیدہ قوتوں کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ ورنہ میں اس طرح کا انسان نہیں تھا۔ میں نے
میں کہیں کسی عورت کو اپنے قرب کا ایک لمحہ نہیں بخشا تھا۔ میں نے اپنے بدن کو ک
بدن سے مس کرنے کی کوشش تک نہیں کی تھی۔ لیکن اس وقت...... اس وقت وہ کچھ
طاقتیں تھیں جو مجھے اس پر آمادہ کر رہی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہی میرے اند
عیار مجرم جنم لیتا جا رہا تھا۔

میں نے پلک جھپکتے میں طے کیا کہ عیاری اور مکاری سے کام لوں گا۔ یہ عور
ہے اور انتقام پر تلی ہوئی ہے۔ مجھے گارڈ روم لے جائے بغیر نہیں رہے گی۔ می
آنکھوں میں بے پناہ خواہشیں اور پیار بھر کر اسے دیکھا۔ لیکن اس کی آنکھیں چ
کے ٹکڑوں کی طرح تھیں۔ میز کا سہارا لئے ہوئے جھکی ہوئی تھی اور ریوالور اس ک
میں تھا۔ اس حالت میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آہستہ آہستہ بڑے پ
میں، میں نے کہنا شروع کیا۔

"سنو فیوری! یہ حقیقت ہے۔ میں تم سے اب بھی یہ کہوں گا کہ میں مورالس ک
نہیں ہوں بلکہ تم نے میری زندگی میں ایک عجیب و غریب تبدیلی پیدا کر دی ہے۔
یقین نہ کرو میری بات پر کہ تم میری زندگی میں پہلی لڑکی ہو فیوری۔ آج سے پ
نے کبھی بھی کسی لڑکی کو وجود کا شریک نہیں بنایا تھا۔"

"بکواس مت کر جاہل آدمی، بکواس مت کر۔" اس کا لہجہ اب بھی اتنا ہی کرخ

بدنما تھا۔

"تم بے شک یقین مت کرو فیوری! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔
میں بڑے سخت اصولوں کا آدمی تھا۔ لیکن تمہارے قرب نے نجانے مجھ پر کیا جادو کر دیا
کہ میں اپنا کردار، اپنی ریاضت سب کچھ بھول گیا۔ فیوری، تم جانتی ہو کہ میرا مذہب کیا
ہے۔ ہمارے مذہب میں یہ گناہ سب سے زیادہ تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن میں تمہیں دیکھ کر
نجانے کس کیفیت کا شکار ہو گیا۔ اب اگر تم مجھے مار بھی ڈالو تو مجھے پرواہ نہیں۔ میں اب
تمہارا ہوں۔"

"ٹھیک ہے فیوری، مجھے تمہارے ہاتھوں مر کر بھی خوشی ہو گی۔ چلو، گولی چلاؤ۔ مار دو
مجھے۔ لیکن مارنے سے پہلے اگر تم میری ایک بات سن لو، جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ سن لو تو
تمہاری مہربانی ہو گی۔"

مجھے یوں لگا جیسے میری اس وقت کی کوشش رنگ لائی ہے اور اس کے ہاتھ میں
لرزشیں ہونے لگیں۔ اس کا ہاتھ کانپنے لگا مگر اس نے دانتوں میں ہونٹ دبا کر ریوالور پر
گرفت مضبوط کر لی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری اداکاری کامیاب ہے۔ میں رُکے بغیر
بولتا چلا گیا۔

"فیوری! میں پہلے ہی دن سے تمہیں چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہاری
شخصیت اتنی جادوگر ہے کہ مجھ جیسے سخت اصول پسند کو دیوانہ بنا دے گی۔ فیوری! ہم
دونوں کے ساتھ وقت نے غداری کی ہے۔ اس میں تمہارا یا میرا قصور نہیں۔ خود کو ملامت
نہ کرو۔ تم تو وہی فیوری ہو جو اپنی چھوٹی سی دنیا میں......" یہ کہہ کر میں نے ایک لمحے کے
لئے سانس لی۔ میں غم آلود نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ فیوری کے
لب کانپنے لگے۔ اس کا ریوالور والا ہاتھ آہستہ آہستہ جھکنے لگا اور میرے اندر کے کمینے
انسان نے خوشی کا نعرہ لگایا کہ وہ مارا۔ میں نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کے شانے
کو انگلیوں سے چھونے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے میں نے اسے
اپنی طرف کھینچا۔ وہ کچی دیوار کی طرح ڈھے گئی اور میں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر
بڑی آہستگی سے ریوالور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ میرے ہی وجود میں سمٹ گئی تھی
اور اب اس کی آواز سسکیوں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ سات بجنے والے تھے۔ باہر اب پوری طرح روشنی ہو گئی

تھی۔ آٹھ بجے برآمدے اور لان پر عملے کی آمدورفت شروع ہو جائے گی۔ اگر یہ اس طرح ٹسوے بہاتی رہی تو میں مارا جاؤں گا۔ اب لمبی تقریریں کرنے کا وقت نہیں رہا تھا مجھے اب اس کتیا سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن میں اب اسے اپنی مدد پر کیسے آمادہ کروں میرا سب کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا۔ یہ اگر چاہے تو مجھے اس منحوس چیمبر سے نکال کر اپنے بنگلے میں پناہ دے سکتی ہے۔ میں نے دل سوزی سے کہا۔

”فیوری! میں نے تو تمہیں دعوت دی ہے کہ مجھے ہلاک کر دو۔ میری زندگی تمہارے رحم و کرم پر ہے۔ دیکھو، یہ ریوالور میرے ہاتھ میں ہے مگر یہ تمہاری ملکیت ہے۔ میں تمہارے ساتھ کوئی مکر و فریب نہیں کر رہا۔ تمہیں رونا نہیں چاہئے فیوری، تمہیں رونا نہیں چاہئے۔ اگر چاہو تو میری زندگی بچا لو جواب صرف اور صرف تمہارے لئے ہے۔“

میری مکالمہ بازی جاری ہی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ گھڑی کی ٹک ٹک میرے اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ مجھے سوا سات بجے تک ادھر سے نکل کر فیوری کے بنگلے میں پناہ لینی چاہئے۔ مجھے اس آتش فشاں کو جگانے اور سرد کرنے میں پندرہ بیس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگانا چاہئے ورنہ مارا جاؤں گا۔ میں وقت کے خلاف دوڑیں لگا رہا تھا آہستہ آہستہ اس کی ہچکیاں بند ہونے لگی۔ وہ میری گود میں کسی آسائش پسند بلی کی طرح کسمسائی۔ بازی اب میرے ہاتھ آنے لگی تھی۔ میں ایک لمحے تک سوچتا رہا۔ تھوڑے فاصلے پر مورالس کی خون میں لتھڑی لاش پڑی ہوئی تھی۔ بہرحال میں نے اسے دوبارہ اس طرف دیکھنے کا موقع نہیں دیا اور ایک بار پھر اسے جذباتی کیفیت کا شکار کر دیا۔ عورت اور گیلی مٹی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ میں نے اپنی رہائی کا معاملہ پکا کر لیا۔ پھر مجھے اس بات پر امید ہو گئی کہ اب صورتحال میرے حق میں ہو گئی ہے۔

آخر کار میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے فرش سے اٹھایا اور مختصر لفظوں میں اس سے درخواست کی کہ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ وہ سر جھکائے کھڑی سنتی رہی۔ پھر ہم نے سب سے پہلے اسکرین کو اس کی جگہ لگایا۔ فیوری نے ریوالور کو اپنے رومال سے اچھی طرح صاف کرنے کے بعد مورالس کی لاش کے قریب ڈال دیا۔ قالین پر تمام نشانات مٹانے کے بعد میں نے اپنا کوٹ فیوری کے شانوں پر ڈالا۔ اس لئے کہ اسے اس کی ضرورت تھی اور آخر کار چیمبر کی چابی لے کر ہم چلنے کو تیار ہو گئے۔ میں نے چیمبر کا بھاری دروازہ کھولا۔ فیوری نے باہر جھانک کر پہلے اپنا اطمینان کر لیا کہ برآمدے میں کوئی ہے

نہیں۔ اس کے بعد ہم باہر آ گئے۔ اس چیمبر کا دروازہ مقفل کیا اور برآمدے کے ستون کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ میں نے سوچا کہ ہم عمارت کے باہر ہی باہر اس راستے پر چلتے ہوئے جدھر سے میں مورالس کے ساتھ یہاں تک آیا تھا فیوری کے بنگلے کی طرف نکل جائیں۔ لیکن اب پوری طرح دن نکل آیا تھا۔ فیوری نے بتایا کہ کمپاؤنڈ کے وسیع سبزہ زاروں پر مالی کام کر رہے ہوں گے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

”آؤ...... اس طرف آؤ۔“

ہم دونوں ایک راہداری کی جانب مڑ گئے اور مختلف برآمدوں اور کمروں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ یہاں قیام کے دوران میں ہاؤس کیپر کے فرائض بھی انجام دیتا تھا اور فیوری تو تھی ہی ہاؤس کیپر۔ اسے معلوم تھا کہ عملے کے لوگ عمارت کے کس حصے میں کیا کام کر رہے ہوں گے۔ چنانچہ ایک کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہمیں کئی آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ فیوری نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ہم پنجوں کے بل چلتے ہوئے اس کمرے کے سامنے سے گزرے تو مارے خوف کے میرا پسینہ چھوٹ گیا۔ وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے ہمارے پاس آ رہے تھے۔ فیوری مجھے لے کر چوبی سیڑھیوں کے نیچے دبک گئی۔ آنے والے ہمارے سروں پر پہنچ گئے تھے۔ ہم جن سیڑھیوں کے نیچے چھپے ہوئے تھے، یہ دھم دھم کرتے ہوئے انہی سیڑھیوں پر چڑھ گئے۔ فیوری نے مجھے اشارہ کیا اور کہا۔

”آؤ چلو...... میدان صاف ہے۔“

ہم پھر اس عمارت کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ خدا خدا کر کے یہ سلسلہ ختم ہوا تھا۔ اس کے بعد ایک خالی کمرے کی کھلی کھڑکی سے فیوری کے اسٹاف کے بنگلے کا عقبی حصہ نظر آنے لگا۔ فیوری نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، دور ایک مالی کام کر رہا تھا لیکن ہماری طرف اس کی پیٹھ تھی۔ یہ فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ عمارت میں اب ایک منٹ بھی ٹھہرنا خطرناک تھا۔ ہم آس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئے۔

”سنو، سیڑھیوں سے اتر کر آرام سے ٹہلتے ہوئے میرے کمرے کی طرف جاؤ اور عقبی برآمدے کے ستون کی آڑ لے کر کھڑے ہو جاؤ۔ تمہارے پیچھے پیچھے میں بھی آتی ہوں۔“

”اوکے ڈارلنگ۔“ میں نے محبت بھرے لہجے میں کہا اور دائیں بائیں دیکھتا ہوا سیڑھیوں سے اترنے لگا۔ پھر میں پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دائیں بائیں دیکھتا ہوا

اس کے بنگلے کی طرف چل پڑا۔ یہ چہل قدمی میرے لئے قیامت سے کم نہیں تھی۔ لیکن جوں جوں بنگلے سے فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا، میرا خوف کم ہوتا جا رہا تھا۔ آخر کار میں بنگلے کے برآمدے میں پہنچ گیا اور ستون کی آڑ میں جا کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد فیوری بھی وہاں آ گئی۔ اس نے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور مجھے جلدی سے اندر دھکیل دیا۔ یہ اس کی خادمہ کا رہائشی کمرہ تھا۔ اس کمرے کو پار کر کے ہم ایک اندرونی ہال میں پہنچے اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے فیوری کی خواب گاہ میں پہنچ گئے۔ یہ کمرہ بہت آرام دہ تھا اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ تمام کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے ہیں۔

یہاں کا ماحول مجھے بے حد اچھا لگا۔ میں سیدھا جا کر اس کے بستر پر دراز ہو گیا۔ میں نے کئی گھنٹے عذاب میں گزارے تھے۔ زندگی اور موت ایک ایک لمحہ قریب آ رہی تھی۔ لیکن اب یہاں تک آنے کے بعد تھوڑا سا اطمینان ہو گیا تھا کیونکہ فی الحال میں بالکل محفوظ تھا۔ فیوری نے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کی کیفیت کا صحیح الفاظ میں تذکرہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مطمئن بھی تھی، مضطرب بھی تھی، غمزدہ بھی تھی، مسرور بھی تھی اور خوفزدہ بھی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ تھکی تھکی مسکراہٹ۔

"فیوری! تم نے مجھے بچا لیا ہے۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ تمہارے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔ تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔"

فیوری کے چہرے پر کرب کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"میں نہیں جانتی کہ میں نے یہ سب کچھ کیوں کیا ہے۔ مگر سنو..... تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ تم پوری بات مجھے بتاؤ گے۔ بولو، مجھے پوری بات بتاؤ۔ مگر نہیں، ابھی نہیں۔ میں کپڑے تبدیل کر کے چلی جاؤں گی۔ تم دروازہ اندر سے بند کر لو اور اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرو کہ میرے سامنے صرف سچ بولو۔ تمہارا سچ تمہیں زندگی دے گا ورنہ میں تم سے متاثر ضرور ہو گئی ہوں لیکن مورالس کو میں کبھی نہیں بھولوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں نے اس خوابگاہ کا دروازہ بند کر لیا۔ فیوری کو میں نے سمجھا دیا تھا کہ وہ روز کی طرح آج بھی وائسرائے چیمبر کی جانب نہ جائے بلکہ بل ویدا ہاؤس کے انتظامی شعبے میں پہنچ کر پہلے فراشوں کو ساتھ لے کر چیمبر کا دروازہ کھولے اور یہ ظاہر کرے کہ وائسرائے کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ دیر تک سوتی رہی ہے۔ اور اب فراشوں کو لے کر جلد صفائی کا کام بھی ختم کرا دینا چاہتی ہے۔ اس طرح

فراشوں کی موجودگی میں چیمبر کھول کر وہ مورالس کی لاش دریافت کرے گی اور سارے فراش اس کے گواہ ہوں گے۔ اصل میں، میں اس الجھن میں تھا کہ رات کو میں یہاں داخل ہوا تھا تو ابھی تک گارڈ روم میں میری واپسی درج نہیں ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنی موجودگی کہاں ثابت کروں گا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مورالس کی لاش ملے گی اور میری تلاش شروع ہو جائے گی۔ اس وقت تو میں محفوظ ہوں لیکن یہاں سے نکلنے کی کیا صورتحال ہو گی۔ کمپاؤنڈ کے کئی دروازے ہیں لیکن صرف دو دروازے استعمال ہوتے ہیں۔ ایک وہ جس سے ہم آئے تھے اور دوسرا پچھلا گیٹ جو صرف ملازموں کی آمدورفت اور سامان لانے لے جانے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس طرف چھوٹا گارڈ روم تھا۔ میں نے جو مہماتی کہانیاں پڑھی تھیں ان میں تو یہ تھا کہ سامان گاڑی میں یا کسی کار کی ڈگی میں بند ہو کر یا بھیس بدل کر لوگ ایسی جگہوں سے باہر نکل جایا کرتے ہیں۔ مگر کہانیاں صرف کہانیاں ہوتی ہیں۔ اصل مسئلہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ حفاظتی انتظامات اس قدر سخت تھے یہاں کہ گارڈز کی لاعلمی میں نکل جانا یا داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ دوسری بات یہ کہ اگر میں کسی طرح یہاں سے نکل بھی گیا تو پھر تفتیش کے وقت میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہو گا کہ میں مورالس کے ساتھ یہاں آیا تھا تو گارڈز کے علم میں آئے بغیر میں باہر کس طرح چلا گیا اور کیوں گیا؟ اس طرح تو مورالس کی موت کا الزام لازمی طور پر میرے ہی سر آئے گا۔

میں فیوری کے بستر پر بیٹھا انہی خیالات میں گم تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ آہ..... یہ کیا قصہ ہے؟ میرا خون خشک ہو گیا۔ فیوری کو گئے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ پھر اس کی خوابگاہ پر ٹیلی فون کیوں کیا گیا ہے؟

گھنٹی برابر بجے جا رہی تھی۔ میں اگر فون اٹھاتا ہوں تو میری یہاں موجودگی کا راز کھل جائے گا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے فیوری مجھے کہیں سے فون کر رہی ہو اور مجھے کوئی اہم بات بتانا چاہتی ہو۔ بہر حال آگے بڑھ کر میں نے ریسیور اٹھایا۔ لیکن یہ سوچ لیا تھا کہ میں صرف سنوں گا، بولوں گا نہیں۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ ٹیلی فون پر فیوری ہی تھی۔ اس نے بڑی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہیلو..... کیا یہ تم بول رہے ہو؟ خاقان! ایک المناک حادثہ ہو گیا ہے۔ فوراً وائسرائے چیمبر میں پہنچو۔" پھر کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔ "اور تم نے مجھے یہ نہیں

بتایا تھا کہ رات مورالس بھی تمہارے ساتھ ہی اندر آیا تھا۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ہڑبڑا کر کہا۔ "فیوری! یہ سب کیا ہے؟ تم چیمبر سے فون کر رہی ہو؟"

"ہاں، ہم لوگ چیمبر میں ہیں۔ تم فوراً آ جاؤ۔ اور سنو میری ملازمہ سے کہنا کہ میرے لئے لنچ تیار نہ کرے۔"

"فیوری! کیا تم نے سب کو بتا دیا ہے کہ میں بنگلے میں تمہارے ساتھ ہوں؟ اور یہ ملازمہ کا کیا قصہ ہے؟" اس نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ تم جلدی سے یہاں آ جاؤ" اور فون بند کر دیا۔ اس کا رویہ بے حد پراسرار تھا۔ کیا وہ مجھے پھنسوانا چاہتی ہے؟ لیکن نہیں۔ اگر وہ پھنسوانا چاہتی ہے تو ٹیلی فون پر اس طرح مکالمے بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے سب کے سامنے یہ کیوں تسلیم کر لیا کہ میں اس کے بنگلے پر موجود ہوں اور رات بھر وہیں رہا ہوں۔ یا تو یہ عورت مجھے بچانے کے لئے بہت بڑی قربانی دے رہی ہے یا پھر مجھ سے اپنی تباہی اور مورالس کی موت کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ میرے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں پھر وائسرائے چیمبر میں جاؤں اور جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کا سامنا کروں۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور خواب گاہ کا دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ بنگلے کے وسیع ہال میں ایلس فیوری کی عیسائی ملازمہ گلدان میں پھول سجا رہی تھی۔ اس کے بارے میں غالباً ایلس فیوری نے مجھ سے کہا تھا۔

میری آہٹ سن کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور گلدان اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "سس...... سر...... سس...... سر، آپ؟"

شاید اس نے مجھے ایلس فیوری کی خوابگاہ سے نکلتے دیکھا تھا۔ میں نے اس طرح گردن ہلائی جیسے میں اس کی بات کا جواب دے رہا ہوں اور اس کے بعد میں پُراعتماد قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل آیا۔ کئی برس کی ملازمت کے دوران نک چڑھی، کم آمیز اور کنواری ایلس فیوری کی جو شخصیت بنی تھی وہ اب اس گلدان کی طرح پارہ پارہ ہو چکی تھی جو ملازمہ کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹا تھا۔ اب یہ سارا عملہ قریب کی گنجان بستیوں سے لے کر کشادہ بنگلوں، کوٹھیوں اور بازاروں تک میں وائسرائے کی پرسنل سیکرٹری کے گھناؤنے کرتوت مزے لے لے کر دوہرائے گا اور بے چاری ایلس فیوری کی رنگین راتوں کے

قصے ہر زبان پر ہوں گے۔ مجھے اندازہ تھا کہ ایلس فیوری شدید نقصانات سے دوچار ہوئی ہے۔ وائسرائے چیمبر کی طرف جاتے ہوئے پوری صورتحال اب میرے سامنے تھی۔ فیوری نے مجھے بچانے کی غرض سے میری موجودگی کا جواز پیدا کرنے کے لئے اپنا بے داغ کردار اور اپنی پوری شخصیت بھینٹ چڑھا دی تھی۔ عورت جب قربانی دینے پر آتی ہے تو اسی طرح قربان ہو جاتی ہے چاہے اس کا تعلق دنیا کے کسی بھی خطے سے ہو، اس کی فطرت کہیں بھی تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ قربانیاں دیتی ہے۔ حالانکہ ایلس فیوری سے یہ قربانی میں نے زبردستی لی تھی۔

بہرحال چیمبر کے دروازے پر سکیورٹی گارڈ والوں کو دیکھا جو گھیرا ڈالے ہوئے کھڑے تھے۔ مجھے آتے دیکھ کر فیوری میری طرف بڑھی اور اس سے پہلے کہ کوئی سکیورٹی والا مجھے آ کر گھیرتا اس نے میرے سینے پر سر ٹکا کر رونا شروع کر دیا اور لرزتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"آہ، ڈیئر خاقان! کسی نے این مورالس کو قتل کر دیا۔ وہ مر گیا۔ پتہ نہیں اس نے خودکشی کی ہے یا...... یا......" پھر سر اٹھائے بغیر اس نے چپکے سے کہا۔

"اور تم یہ بیان دو گے کہ میں رات کو ایلس فیوری کے پاس آیا اور راستے میں این مورالس مل گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ معائنے کے لئے آیا ہے۔ اور...... اور کوئی اگر تم سے پوچھے تو کہہ دینا کہ وہ میرے اور تمہارے تعلقات کے بارے میں جانتا تھا۔"

یہ کہہ کر وہ سسکیاں لینے لگی۔ اتنے میں سکیورٹی کا ایک انگریز سارجنٹ ہمارے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے شانے تھپتھپا کر فیوری کو تسلی دی اور مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"سر! سکیورٹی کے ڈیوٹی چیف آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔"

فیوری نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ یوں لگا جیسے وہ اب اداکاری نہیں کر رہی تھی۔ اس کا تمتمایا ہوا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ لٹے ہوئے شہر کی طرح اس کی آنکھیں ویران تھیں۔ مگر پھر بھی ان آنکھوں نے مجھے حوصلہ دیا اور سارجنٹ کے ساتھ چیمبر سے ملے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا۔ سارجنٹ سابق انگریز فوجی تھا۔ اس نے مجھ سے سوالات کئے اور میں وہی جواب اسے دینے لگا جو فیوری نے مجھے بتائے تھے۔ یہ انگریز فوجی این مورالس کا ماتحت تھا۔ میرے اس بیان پر کہ فیوری میری محبوبہ ہے اور یہ رات میں نے

اس کے بنگلے پر گزاری ہے، اس کا سرخ چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اگر میں آئی سی ایس آفیسر ہوتا تو وہ اسی وقت مجھے ہتھکڑی ڈال دیتا۔ بھلا حاکم قوم کا ایک فرد ایک دیسی باشندے سے اپنی قوم کی رُسوائی کی داستان کیسے سن سکتا تھا؟ مگر وہ مجبور تھا۔ اس نے غرائی ہوئی آواز میں سارجنٹ کو کمرے سے نکل جانے کا کہا پھر مجھ سے بولا۔

"سنو، وائسرائے کے آنے تک تم اپنے بنگلے میں ہی رہو گے۔ نہ کسی سے ملاقات کرو گے نہ کسی سے کسی اور طرح کا رابطہ فون وغیرہ کے ذریعے کرو گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ تمہارے بنگلے کا ٹیلی فون عارضی طور پر کاٹ دیا جائے گا۔ باہر سکیورٹی کی گاڑی گئی ہے۔ وہ تمہیں تمہارے بنگلے پر چھوڑنے جائے گی۔ سمجھے؟" اس نے یہ تمام باتیں اس طرح سے کہی تھیں کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ چمڑے کے کوڑے مار مار کر یہ باتیں مجھ سے کہتا۔ لیکن ظاہر ہے ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پھر کہا۔

"آپ آرام کریں سر! اور میں نے جو گزارش کی ہے اس کا خیال رکھیں۔ تھینک یو۔"

گاڑی میں میرے ساتھ ایک شخص سادہ لباس میں آ بیٹھا جو مجھے بنگلے کے برآمدے تک پہنچانے کے بعد قریب ہی ایک کرسی ڈلوا کر بیٹھ گیا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ مجھے نظر بند کر دیا گیا ہے اور وائسرائے کے آنے پر میری قسمت کا فیصلہ ہو گا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچ کر نڈھال سا اپنے بستر پر پہنچ گیا اور اس کے بعد مجھ سدھ بدھ نہ رہی۔ کچھ اس طرح تھک گیا تھا میں کہ اب کچھ سوچنے کے لئے دماغ میں ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ این مورالس کی موت، ایلس فیوری کے ساتھ اچانک ہی میرا عشق۔ میں اپنے آپ کو اتنے سستے داموں فروخت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مرد کی بھی آبرو ہوتی ہے۔ صرف یہ نہیں کہ وہ ہر عورت کے سامنے زمین بوس ہو جائے۔

بہر حال دوپہر تک سوتا رہا اور دن میں بھی خواب دیکھتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ میں شو مندر کی دھار میں اپنے موروثی والے کمرے میں دھم سنگھاسن پر بیٹھا ہوا ہوں۔ ایک بھکشو عورت میری طرف ریوالور تانے آگے بڑھتی ہے۔ تب میں وہ بھوج پتر کھینچ مارتا ہوں اور وہ ریوالور پھینک کر میرے سامنے سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔ میں اس کے دلکش اور دلآویز وجود کو دیکھتا ہوں اور میری آنکھوں میں ایلس فیوری کا جسم آ جاتا ہے جو میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ میں اس کی جانب بڑھتا ہوں تو ایک طرف سے این مورالس گیرا لباس پہنے لاٹھی ٹیکتا ہوا آتا ہے۔ اس کی کنپٹی کے سوراخ سے خون بہہ رہا ہے۔ میں

ریوالور سے اس پر کئی فائر کرتا ہوں مگر وہ اسی طرف بڑھتا آ رہا ہے۔ پھر دوسری جانب سے اجے ورتنا گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالے قہقہے مارتا ہوا آ رہا ہے اور پھنسی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔

"کہا تھا نا میں نے تم سے...... کہا تھا نا میں نے تم سے کہ کاشر بھرم کی چوٹی پر مت جاؤ۔ جو نہیں مانتا وہ نقصان اٹھاتا ہے۔" یہ کہتا ہوا وہ دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ اسی وقت این مورالس اور وہ عورت غائب ہو چکے ہوتے ہیں۔ لیکن میرے گرد جیل کی دیواریں ہیں اور سامنے جنگل نظر آ رہا ہے۔ تھوڑے فاصلے پر بابا جان کا ملازم خاص سلاخوں میں سے کھانے کی ٹرے میری جانب بڑھا رہا ہے۔ عجیب وغریب خواب تھا۔ سارے ہی کردار بدلی ہوئی شکل میں میرے سامنے نظر آتے ہیں۔ پھر میں نے ہیگ کو دیکھا جو جیلر کی وردی پہنے ہوئے ادھر آ رہا ہے اور وہ بابا جان کے ملازم کے سر پر اپنی چھڑی سے ضرب لگاتا ہے اور بابا جان کا ملازم خاص اور میرا بچپن کا اطالیق مجھے پکارتے ہوئے بے ہوش ہو جاتا ہے۔ میں غصے میں کوٹھڑی کی سلاخیں پکڑ کر موڑنے لگتا ہوں کہ میرے پیچھے سے ماں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں۔

"لعنت ہو تجھ پر خاقان! لعنت ہو تجھ پر۔ تو نے اپنے باپ کو مار دیا۔"

میں گھبرا کر مڑتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ ماں کی بجائے ایلس فیوری براؤن غرارہ پہنے اور سر پر پلو ڈالے میرے پیچھے کھڑی ہے۔ وہ افسردگی سے مسکراتی ہے اور پھر وائسرائے کا کاغذ تراش چاقو لے کر مجھ پر حملہ کرتی ہے۔ میرا شانہ زخمی ہوتا ہے اور میں چیخ مار کر اٹھ کر بیٹھتا ہوں۔ میرا اردلی میری چیخ کی آواز سن کر میرے پاس آیا اور میرا شانہ ہلا ہلا کر مجھے جگانے لگا۔

"سر، جاگئے سر......"

"کیا بات ہے...... کیا بات ہے؟" میں نے ہڑبڑائی ہوئی آواز میں کہا۔

"سر! وائسرائے بہادر آ گئے ہیں اور آپ کو ویداہاؤس میں طلب کیا گیا ہے۔"

"اوہ......" میرا دل لرزشوں سے لرز رہا تھا۔ بہر حال وائسرائے کی طرف سے طلبی تھی، مجھے جانا تھا۔ میں نے ملازم سے کہا۔

"سنو، مجھے چائے بنا دو اور ہلکی پھلکی کوئی کھانے کی چیز۔ میں نہا کر آتا ہوں۔"

پھر چائے وغیرہ پی کر میں باہر نکلا تو سکیورٹی کی گاڑی میں سادہ لباس والا میرا انتظار

کر رہا تھا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور میں اندر بیٹھ گیا۔ پھر وائسرائے ہاؤس کی لائبریری میں میری تنہا پیشی ہوئی۔ میں نے وائسرائے کو اس درجے غضب ناک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''مسٹر خاقان! میں فوری طور پر تمہیں اور مس ایلس فیوری کو معطل کر رہا ہوں۔ مجھے تم لوگوں کی ذاتی زندگی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مگر سکیورٹی کی بے ضابطگیاں ہوئی ہیں جن کی تحقیقات ضروری ہیں۔ میں نے تمہیں صرف اس لئے بلایا ہے کہ مورالس جن حالات میں ہلاک ہوا ہے ان کے بارے میں اگر تم کوئی ایسی بات بتانا چاہو جس کا سرکاری ریکارڈ میں شامل ہونا حکومت کے مفاد میں ہو تو میں سننے کے لئے تیار ہوں۔ تحقیقات مکمل ہونے تک تمہاری نقل و حرکت صرف رہائش گاہ تک محدود رہے گی۔ اور اگر تمہیں کچھ نہیں کہنا تو تم جا سکتے ہو۔'' میں خاموش کھڑا رہا۔ وائسرائے نے کچھ دیر انتظار کیا، پھر اٹھ کر بولا۔ ''بس، اب تم جاؤ۔''

ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ میں ہیگ کی سازش کے بارے میں سب کچھ بتا دوں۔ مگر میں جانتا تھا کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میری مصیبت تو دور ہونے کی نہیں۔ بلکہ میں تو اور بھی پھنس جاؤں گا اور بیچاری فیوری جو میری وجہ سے پہلے ہی برباد ہو چکی ہے، بالکل ہی ماری جائے گی۔ پھر بھی میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''سر! این مورالس نے خودکشی کی ہے اور یہ بات میں پہلے سے جانتا تھا کہ وہ ایک دن خودکشی کرے گا۔''

''کیا مطلب؟'' وائسرائے نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کے لئے میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ کیا میں وائسرائے کو یہ بات بتاؤں کہ میں نے بھوج پتر پر اس کی لاش دیکھی تھی؟ احمقانہ بات ہے۔ وائسرائے سے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہئے۔ مگر میں نے فوراً ہی کہا۔

''سر! میں نے اس کے ہاتھ کی لکیروں میں دیکھ لیا تھا۔ ہم ہندوستانی لوگ ستاروں کے کھیل کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ ایک بار میں نے اس کا ہاتھ دیکھا تھا اور اسے بتایا تھا کہ وہ خودکشی کرے گا۔''

''تم لوگ آدھے پاگل ہوتے ہیں۔ ہم ان باتوں کو نہیں مانتے۔ گیٹ آؤٹ۔'' اس نے کہا اور میری طرف پشت کر لی۔ میں سلام کر کے لائبریری سے باہر آ گیا۔

اس کے بعد تحقیقاتی مشن ترتیب پایا گیا اور اس کے سامنے بیانات اور گواہیوں کا وہ سلسلہ چلا کہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ تفتیش کرنے والے جن سوالوں کے جواب دینے سے قاصر تھے ان میں سے ایک تو یہ تھا کہ مورالس چیمبر میں کیا کرنے گیا تھا؟ دوسرے اس کی لاش میں دو گولیاں پیوست تھیں۔ ایک سے تو وہ ہلاک ہوا تھا اور دوسری مرنے کے چند گھنٹے بعد چلائی گئی تھی۔ آخر کیوں؟ اگر اس نے خودکشی کی تھی اور تجزیئے سے یہ ثابت ہوا تھا کہ گولی ریوالور کنپٹی پر رکھ کر چلائی گئی ہے تو پھر دوسری گولی کس نے چلائی تھی؟ چیمبر میں جہاں دوسرے نشانات تھے وہاں میری انگلیوں کے تازہ نشانات کیوں تھے؟ جبکہ وہاں میرے داخلے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ غسل خانے میں بھی نشانات کا پایا جانا کیا معنی رکھتا ہے؟ پھر مورالس کے ریوالور پر سے انگلیوں کے نشانات بھی غائب تھے۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی انگلیوں کے نشانات بھی نہیں تھے۔ یہ چکر نجانے کب تک چلتا رہا۔ بہرحال میں نے اور ایلس فیوری نے جو پہلا بیان دیا تھا، ہم اس پر قائم رہے۔ یعنی یہ کہ ہم مختلف جگہ ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے اور جس دن شام کو وائسرائے پولو وغیرہ کھیلنے کے لئے جاتے تھے اس دن ان کے چیمبر میں ہم دونوں کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اور اسی لئے میری انگلیوں کے نشانات وہاں ملے تھے۔

بہرحال اعلیٰ تحقیقاتی بورڈ بھی یہ گتھیاں نہیں سلجھا سکا اور کافی عرصے تک نظر بندی کے بعد مجھے رہا کر دیا گیا۔ معطلی کے احکامات بھی واپس لے لئے گئے۔ اس لئے کہ تحقیقاتی بورڈ نے مجھے برخاست کرنے کی سفارش کی تھی اور مجھے برخاست کر دیا گیا تھا۔ ایلس فیوری کو بحال کر کے اس کا تبادلہ کر دیا گیا تھا۔ مگر اس نے دوسرے ہی دن استعفیٰ دے دیا۔ نوکری سے الگ ہونے کے بعد اس نے مجھ سے ملنے کی بہت کوشش کی مگر وہ میری نظر بندی کا زمانہ تھا۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ آخر غریب تنہائی اور بدنامی کی فصل کاٹ کر ایک روز انگلستان واپس چلی گئی۔ یہ بات بہت عرصے بعد مجھے معلوم ہوئی تھی کہ آخر اس نے کسی آسٹریلوی سے شادی کر لی ہے جس کا سبی میں بہت بڑا کاروبار تھا۔ لیکن بہرحال وہ عجیب عورت تھی۔ البتہ یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ اس نے میری زندگی بچانے کے لئے بڑی عظمت کا ثبوت دیا تھا۔ میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

بہرحال میں نوکری سے نکال دیا گیا اور اس کے بعد گھر واپس جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے بڑے عجیب و غریب حالات میں گھر کا رخ کیا۔

میرا دل لرز رہا تھا۔ نجانے کیا کیا سوچیں دامن گیر تھیں۔ یہاں تک کہ آخر کار میں گھر پہنچ گیا۔ لیکن یہاں بہت سی نئی خبریں میرا انتظار کر رہی تھیں۔ مجھے یہ پتہ چلا کہ گڑھی میں بڑی تبدیلیاں آ چکی ہیں اور میرے والد اور والدہ کو یہ دنیا چھوڑے ہو کافی وقت گزر چکا ہے۔

سیتا گڑھی آ کر میں نے تو اپنی دنیا ہی بدلی ہوئی پائی۔ ثمرستانِ جمشید کے در و کاٹنے کو دوڑتے تھے۔

آخر کار دوسری زمینوں اور جائیداد کا انتظام اپنے ملازمِ خاص کے سپرد کر کے نے مختصر سا سامان اپنے ساتھ لیا اور بمبئی روانہ ہو گیا۔ اب مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے کوشش کرنی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ ہیگ نے میری ہموار زندگی پر ایسی ضرب لگائی تھی اس نے مجھے تہہ و بالا کر دیا تھا۔ میں اب اپنے آپ کو بڑے شہروں کی ہنگامہ آرائی کھو دینا چاہتا تھا۔ جب میں سروس میں داخل ہوا تھا تو میری زندگی کچھ اصولوں رہنمائی میں چل رہی تھی اور اب میں ایک بے کردار آدمی تھا۔ نہ میرا باپ تھا نہ ماں۔ نہ کوئی ماضی تھا نہ مستقبل۔ میں تو بس ایک زندہ لاش تھا۔

بمبئی کے تاج ہوٹل میں، میں نے ایک کمرہ حاصل کیا اور ہوٹل کے پورٹر نے کمر میں سامان پہنچا کر میرے کپڑے وارڈ روب میں ٹانگ دیئے اور پھر ٹپ وغیرہ لے وہاں سے چلا گیا۔ یہاں آنے کے بعد میں اپنی اس نئی زندگی پر غور کرنے لگا۔ میرا کچھ تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ غسل کر کے نیچے ہال میں کھانا کھا لوں۔ چنانچہ میں نے تولیہ نکالنے کے لئے سوٹ کیس کھولا تو چمپا کی تیز بو نے مجھے چکرا کر دیا۔ ایک لمحے کے لئے میں سکتے میں رہ گیا۔ لیکن پھر میں نے اس کے بعد خود کو سنبھا یہ بو اسی بھوج پتر کی تھی۔ میں نے جھنجلا کر کپڑوں کی تہہ کھولی اور مجھے ایک بھوج پتر گیا۔ میں نے اسے اس طرح دیکھا جیسے کوئی صبح کا اخبار دیکھتا ہے اور حقیقت یہ ہے وہ اخبار ہی تھا۔ اس دفعہ اس پر ایک اجنبی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ شخص وردی ہوئے تھا اور شکل سے کوئی فوجی نظر آتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھائے شاید رقص کر رہا تھا۔

ایک بار پھر میرے سارے وجود میں گڑگڑاہٹ دوڑ گئی اور میں اس انوکھی تصویر بارے میں سوچنے لگا۔ کیا کروں۔ آخر کیا کروں؟ اس خشک اور منحوس پتے کو میں بڑی نفرت کے ساتھ ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور سگریٹ سلگا کر باتھ روم میں دا

ابھی غسل خانے کا دروازہ میں نے بند بھی نہیں کیا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہو گئی۔ چنانچہ میں باہر نکل آیا۔ پتہ نہیں کون مردود تھا۔ یہاں بھی مجھے پریشان کیا جا رہا ہے۔ بہرحال میں نے ٹیلی فون اٹھایا تو ہوٹل کے استقبالیہ سے کوئی کہہ رہا تھا۔

"خاقان جمشیدی صاحب! آپ سے ایک فوجی افسر ملنے آئے ہیں۔"

میرے ہاتھ پاؤں ایک لمحے کے لئے لرز کر رہ گئے۔ فوجی افسر کے نام سے ہی مجھے بھوج پتر کی تصویر نظر آ گئی۔ میں نے بیزاری سے کہا۔

"سنو، اس سے کہہ دو کہ وہ بھی جا کر خودکشی کر لے۔ مجھے اطلاع مل گئی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے ٹیلی فون کا ریسیور پٹخا اور ایک بار پھر باتھ روم کی جانب چل پڑا۔ ذہن شدید جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔ میں بہت دیر تک پانی میں پڑا رہا اور شاور کی تیز دھاریں میرے بدن سے کھیلتی رہیں۔ بدنامی اور ذلت و خواری بدن کا میل تو نہیں ہوتے کہ گرم پانی اور صابن سے دھوئے جا سکیں۔ بہت دیر تک میں پانی کے نیچے اپنے تپتے ہوئے وجود کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد میں غسل خانے سے برآمد ہوا تو جھلاہٹ میں کسی قدر کمی ہو گئی تھی۔ کچھ قدم آگے بڑھا تو مجھے دروازے کے قریب ایک کاغذ کا پُرزہ پڑا ہوا نظر آیا۔ سفید کاغذ گہرے رنگ کے قالین پر بہت نمایاں تھا۔ میں آگے بڑھا اور کاغذ کا پُرزہ اٹھا لیا۔ پھر میں نے اسے کھول کر دیکھا تو لکھا ہوا تھا۔

"خاقان!

یہ مت بھولو کہ بمبئی میرا شہر ہے۔ یہاں تمہیں لنگر سے باندھ کر عدم آباد بھی پہنچا سکتا ہوں۔ میں نیچے بیٹھا ہوا ہوں۔ فوراً آ جاؤ۔ کیا سمجھے؟ اگر مجھے پہچان سکتے ہو تو پہچانو کہ یہ تحریر کس کی ہو سکتی ہے۔ ویسے شناسائی کے طور پر میں ڈبلیو، ایچ لکھے دیتا ہوں۔"

یہ انوکھی تحریر تھی۔ ڈبلیو ایچ، ڈبلیو ایچ، ڈبلیو ایچ...... بمبئی، لنگر...... اوہ مائی گاڈ! اوہ میرے خدا، استقبالیہ پر جو افسر مجھے پوچھ رہا تھا وہی نامعقول تھا ڈبلیو ایچ یعنی ولیم ہاروے یعنی شاہی بحریہ کا لیفٹیننٹ۔ میرا طالب علمی کے زمانے کا دوست۔ ویری گڈ...... ویری گڈ۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے نجانے کیوں ولیم ہاروے کے تصور سے مجھے خوشی ہوئی تھی۔

بہر حال میں نیچے جانے کے لئے لفٹ کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ کمرہ میں نے مقفل کر دیا تھا۔ پچھلے دنوں میں نے جو اذیتیں جھیلی تھیں اور جن عذابوں سے گزرا تھا انہوں نے مجھے خود غرض، کمینہ اور چڑچڑا بنا دیا تھا۔ میں بمبئی یہ سوچ کر آیا تھا کہ یہاں کسی سے نہیں ملوں گا اور اگر کوئی شناسا ملنے آیا تو اسے پہچاننے سے انکار کر دوں گا۔ لیکن ہاروے کی بات ہی دوسری تھی۔ اگرچہ میں ہندوستانی اور مسلمان تھا اور وہ انگریز مگر دونوں ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔ ولیم کی تعلیم و تربیت ہندوستان میں ہوئی تھی اور اس کا مزاج مشرقی ہی تھا۔ اس کی گفتگو اور اس کا انداز عام انگریزوں سے بالکل مختلف تھا۔ چنانچہ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ اس کا باپ کپتان تھا اور 1914ء میں لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ ولیم ہاروے کی پرورش اس کے چچا نے کی تھی وہ کلکتے میں آرمی سپلائی کا بہت بڑا ٹھیکیدار تھا۔ حالانکہ ولیم کو پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن پھر بھی اس کا چچا اسے تعلیم دلانا چاہتا تھا۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ جیسے ولیم کو موقع ملا وہ تعلیم چھوڑ چھاڑ کر شاہی بحریہ میں چلا گیا۔ اس کا باپ چونکہ اعزازی کیپٹن تھا اس لئے ولیم کو کمیشن ملنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ کالج میں ہم دونوں کی دوستی کی مثال دی جاتی تھی اور سچ بات یہ تھی کہ پولو کے کھیل میں ولیم میرا سب سے بڑا حریف تھا۔ ہر سال ہم دونوں میں ٹیم کی کپتانی کے لئے رسہ کشی ہوتی تھی۔ مگر ہماری دوستی بھی اپنی جگہ ایک مثال تھی ہم دونوں نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔

میں اس تصور ہی سے بہت خوش تھا کہ اس وقت ولیم ہوٹل میں موجود ہے۔ میری طبیعت کی اُداسی دور ہونے لگی تھی۔ بہر حال ہوٹل کی راہداری ویران پڑی تھی اور میں پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لفٹ کے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ اگرچہ میں چوتھی منزل پر تھا لیکن میں نے سوچا کہ لفٹ پر لعنت بھیجی جائے اور سیڑھیوں کے راستے اترا جائے۔ ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ لفٹ آ گئی۔ جونہی دروازہ کھلا، میں نے جھپٹ کر اندر داخل ہونا چاہا۔ لیکن اچانک ہی میں کسی لڑکی سے ٹکرا گیا۔ گلابی ساڑھی والی حسین لڑکی گرتے گرتے بچی۔ وہ برق رفتاری سے لفٹ سے باہر آنا چاہتی تھی۔ ادھر میں برق رفتاری سے اندر جانے کا خواہش مند تھا۔ چنانچہ ہم دونوں ٹکرا گئے۔ میں معذرت کرنے ہی والا تھا کہ اس لڑکی کے عقب سے خاکی رنگ کی اعلیٰ تراش کی وردی پہنے ایک لمبے قد و قامت کا سیاہ فام نوجوان اسے نرمی سے ہٹاتا ہوا آگے بڑھا اور تقریباً میری ناک تک اپنی ناک

بڑھا کر کھڑا ہو گیا۔ دفعتہً ہی اس کی غرائی ہوئی آواز اُبھری۔

"پیچھے ہٹو" اُس کا لہجہ اس قدر خراب تھا کہ میرے پورے بدن میں آگ لگ گئی۔ میں اس لہجے سے مخاطب کئے جانے کا عادی نہیں تھا۔ میرے سارے وجود میں گرم گرم لہریں دوڑ گئیں۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ پہلی نظر میں وہ شخص مجھے فوجی عہدہ دار لگا تھا لیکن اب جو سر سے پاؤں تک اس پر نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ سیکرٹری یا باڈی گارڈ قسم کی کوئی چیز ہے۔ میں نے مڑ کر گلابی ساڑھی والی کو دیکھا وہ اس صورتحال سے کچھ پریشان سی لگتی تھی۔ وردی والا سیاہ فام پھر اسی سخت اور کرخت لہجے میں بولا۔

"سنا نہیں تم نے۔ ہٹو سامنے سے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے دھکا دینا چاہا کہ میں بھڑک اٹھا اور دوسرے لمحے میرا زوردار گھونسہ اس کی ٹھوڑی پر پڑا۔ وردی والا رُکی ہوئی لفٹ میں چت جا کر گرا تھا۔ ادھر لڑکی کی چیخ ابھری تھی۔ میں جانتا تھا کہ میرا یہ لیفٹ ہک کس نوعیت کا حامل ہے۔ اس بھرپور گھونسے کے بعد اٹھنے میں ذرا دیر لگتی ہے۔ چنانچہ میں نے گردن خم کر کے بڑی ملائمت سے لڑکی سے کہا۔

"سوری میڈم! میں اپنی اس بدتمیزی کی معافی چاہتا ہوں۔ یہ بالکل اتفاق تھا کہ میں جلدی اندر آنا چاہتا تھا اور آپ باہر نکلنا چاہتی تھیں۔ مگر میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔"

لڑکی نے غصیلی نگاہوں سے مجھے دیکھا لیکن کچھ نہیں کہا۔ البتہ وہ تشویش بھری نگاہوں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھنے لگی جو ایک ہاتھ سے اپنے جبڑے کو سنبھالے ہوئے کہنی کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن لمحہ بھر پہلے اس کے چہرے پر جو غیض و غضب تھا، اب وہ نہیں تھا بلکہ ایک شرمندگی اور کھسیاہٹ کا احساس اس کے چہرے سے نمایاں تھا۔ بلکہ اس کے عضلات میں کوئی تبدیلی نمایاں ہو گئی تھی اور اس کا منہ پوری طرح ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ لڑکی نے اس پر نگاہ ڈالی اور اچانک ہی اس کے منہ سے ہنسی نکل گئی۔ سیاہ فام کا ٹیڑھا منہ ایک مضحکہ خیز کیفیت کا حامل ہو گیا تھا۔ لیکن لڑکی کو ہنستے دیکھ کر اس کی غیرت جاگ اٹھی اور وہ اپنے چہرے کی تکلیف بھول کر جھرجھری لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے لمحے میری طرف بڑھنے لگا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں اس کے حملے کو روکوں۔ اسے خوفزدہ کرنا ضروری تھا چنانچہ میں نے باکسروں کی طرح پوزیشن لے لی اور میری آواز ابھری۔

"آؤ بیٹے آؤ...... اب کے میں تمہارے سارے دانت گرا دوں گا تا کہ زندگی بھ
مجھے یاد رکھو۔" اس سے پہلے کہ وہ میری طرف جھپٹتا اور پھر مار کھاتا، لڑکی کی غرائی ہ
آواز ابھری۔

"ڈیمٹ! ختم کرو یہ بے ہودگی۔ اور پٹنا چاہتے ہو کیا؟" لڑکی کی ڈانٹ سن کر
ایک دم رُک گیا۔ پھر مجھے گھورتے ہوئے اس نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور اسے جھاڑتا ہوا
طرف کھڑا ہو گیا۔ مگر اس کے پیروں میں لرزشیں تھیں اور وہ اس طرح جھول رہا تھا
زنجیروں میں بندھا ہوا ہاتھی۔ لڑکی نے میری طرف دیکھا اور کسی قدر ترش لہجے میں بو

"اور آپ مسٹر! آپ صورت سے تو ایک اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن
ملازم کو مارتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہئے تھی۔"

"اور مار کھاتے ہوئے؟" میں نے لڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"نان سینس۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے مڑی اور لفٹ سے باہر نکل گئی۔ وردی والا
وردی پر ہاتھ پھیرتا ہوا اس کے پیچھے چل پڑا تھا۔ وہ بیک وقت دو کیفیتوں سے گز
تھا۔ غصے میں بھی تھا اور میرے پٹائی کرنے سے لڑکی کے ہنسنے پر کھسیا بھی رہا تھ
دوسرے ہاتھ سے اپنا جبڑا بھی سیدھا کرتا جا رہا تھا۔ اس نے کئی بار مڑ کر مجھے د
مجھے اب اپنے رویے پر واقعی شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ اس
بدتمیزی کی تھی لیکن ایک باوقار آدمی کا یہ ردِعمل نہیں ہونا چاہئے تھا جس کا مظاہرہ میں
کیا تھا۔ البتہ یہ اور بات تھی کہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید وہ مجھے دھکا دے دیتا۔ بہ
اب اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں رُکی ہوئی لفٹ میں بیٹھ کر نیچے جا
لیکن لفٹ سے نیچے اترتے ہوئے میں برابر اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا
کی عمر بمشکل بیس بائیس سال ہو گی۔ ایک نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ کسی بڑے گ
کی لڑکی ہے۔ اس کے لباس کا رکھ رکھاؤ اور اس کے انگریزی بولنے کا لہجہ یہ بتا رہا
غیر ملکوں میں بھی رہ چکی ہے۔ بہرحال کچھ بھی تھا۔ لفٹ لابی میں رُکی۔

لابی سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ پورٹروں کی فوج بہت سا سامان ا
استقبالیہ کاؤنٹر پر موجود ہے اور بہت ہی عمدہ لباس میں ملبوس ایک مخصوص انداز
اوڑھے ہوئے ایک عمر رسیدہ شخص کاؤنٹر پر کھڑا ہے۔ ہوٹل کی انتظامیہ کے لوگ
گھیرے کھڑے ہیں اور اندازہ یہ ہو رہا ہے کہ وہ کوئی بہت ہی بڑی شخصیت ہے۔ کی

اور اتنے بڑے ہوٹل کا منیجر بھی اس کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے ہوٹل کا کوئی
پرانا سرپرست ہو۔ بہرحال میں کھڑا ہو گیا۔ نامعلوم کیوں مجھے ایک لمحے کے اندر یہ
احساس ہوا کہ اس بوڑھے آدمی کا تعلق اس گلابی ساڑھی والی سے ضرور ہے۔ اور پھر ایک
لمحے کے اندر پوری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اس آدمی کے دائیں بائیں دو لمبے تڑنگے
جوان جو ایسی ہی خاکی وردی پہنے کھڑے تھے جیسی گلابی ساڑھی والی کا ساتھی پہنے ہوئے
تھا۔ میں نے ایک لمحے تک ان کا جائزہ لیا اور پھر ایک ویٹر کو اشارہ کیا جو ادب سے
میرے قریب پہنچ گیا۔

"ویٹر! یہ کون ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"سر! یہ بہت بڑے سیٹھ ہیں۔ سیٹھ آدم زمان۔"

میرے ذہن کی چرخی نے حرکت کی اور مجھے سیٹھ آدم زمان کا خیال آ گیا۔ اس شخص
کی دولت مندی کی داستان پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ شراب کا سب سے
بڑا امپورٹر تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے بہت سے کاروبار تھے۔ اور شاید انگریز حکومت
کو سب سے زیادہ انکم ٹیکس یہی دیتا تھا۔ میں نے سوچا کہ گلابی ساڑھی والی اس کی بیٹی ہی
ہو سکتی ہے۔ بہرحال میں اب ولیم ہاروے کی تلاش میں نگاہیں دوڑانے لگا اور ولیم
ہاروے کی بحریہ کی وردی مجھے نظر آ گئی۔ اس کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ مجھے
دیکھ کر وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے ہوا میں ایک
گھونسا چلایا۔

"اگر تم ایک منٹ اور نہ آتے تو میں اوپر آ کر تمہاری ناک چپٹی کر دیتا ڈیئر!"

یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور میرے گلے لگ گیا۔ ولیم ہاروے کے
بارے میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بار میں بیکار نہیں بیٹھا رہا ہے۔ اس کے منہ سے شراب
کی ہلکی ہلکی بو آ رہی تھی۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی شیشیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تیری پرہیز گاری کا کیا حال ہے؟ سول سروس نے ابھی تجھے خراب کیا یا نہیں؟"

ایک لمحے کے لئے میرے دل کو دھچکا لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کالج کے زمانے
میں، میں ایک مسلمان لڑکا ہوا کرتا تھا اور میری پارسائی بہت سے لوگوں کی زبان پر تھی۔
ویسے مجھ پر جو گزری ہے، ظاہر ہے ولیم بیچارے کو اس کے بارے میں کیا معلوم۔
بہرحال ابھی میں اسے اس کے بارے میں بتاؤں گا بھی نہیں۔ ہم بہت عرصے کے بعد

ملے تھے اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ ناخوشگوار باتوں سے اس ملاقات کو آلودہ کروں۔
نے اس سے بہت ساری باتیں کیں اور وہ اپنے بارے میں سنانے لگا۔ اس کے
ساتھ ہی وہ پیتا بھی جا رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ کسی کام سے ہوٹل آیا تھا
سے گزرتے ہوئے یکایک اس نے مجھے لفٹ میں داخل ہوتے دیکھا اور میرے پیچھے
بھی تھا مگر لفٹ کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر آ کر میرے کمرے کا نمبر
کیا اور پھر اس نے وہیں سے مجھے ٹیلی فون کیا۔ مگر جب ٹیلی فون ملایا اور اسے
میں جو کچھ سننا پڑا اس سے ٹیلی فون آپریٹر حیران رہ گیا تھا۔

"یہ کیا قصہ تھا؟ تم نے مجھے خودکشی کرنے کا مشورہ کیوں دیا تھا؟"

"بس یار...... میں تھوڑا سا کھسک گیا ہوں۔" میں نے اس سے کہا۔ "تم سنا
حال ہے؟"

"آہ...... میری جان، تم نہیں سمجھتے۔ زندگی میں عیش ہی عیش ہیں۔ بحریہ کی ملا
دنیا کی سب سے اچھی ملازمت ہے۔ تقریباً دنیا گھوم لی ہے میں نے۔ پچھلے ہی سال
نے اپنے عزیزوں کے ساتھ لندن میں بہت سا وقت گزارا ہے۔ ویسے اس وقت
جہاز بحریہ کی گودی میں مرمت کے لئے کھڑا ہے۔"

"اوہ...... اس کا مطلب ہے کہ تم کافی وقت یہاں رہو گے۔"

"ہاں، ظاہر ہے میں اس مرمت کی نگرانی کر رہا ہوں۔ لیکن چوبیس چوبیس،
بائیس گھنٹے جہاز کی نگرانی کرنا پڑتی ہے۔ بس شام کو تھوڑی دیر کے لئے گھومنے پ
کے لئے نکل آتا ہوں۔ اوہو......" یہ کہہ کر اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں
دیکھا اور بولا۔

"سوری ڈیئر خاقان! جہاز پر اس وقت میں اکیلا ہی افسر ہوں۔ میرے تمام سینئ
جونیئر یا تو بحریہ کے ہیڈ کوارٹر میں مصروف ہیں یا چھٹی گزار رہے ہیں۔ مجھے بہت د
گئی ہے جہاز چھوڑے ہوئے۔ چنانچہ اس وقت مجھے چلنا ہے۔ تم جہاز سیزنو کا نام
کر سکتے ہو۔ سیزنو میرے جہاز کا نام ہے۔"

"یار! ابھی تو ہم لوگ تفصیل سے بیٹھ کر باتیں بھی نہیں کر سکے۔"

"پھر میری جان! ویسے جب تک میں بمبئی میں ہوں مجھے تم سے روزانہ ملنا
جہاں بھی مناسب سمجھو۔ یہاں بھی آ سکتا ہوں اور تمہیں بھی بلا سکتا ہوں۔"

ولیم کے جانے کے بعد پہلے تو میں نے سوچا کہ واپس اپنے کمرے میں جا کر روم سروس کو فون کروں کہ مجھے کھانے کو کچھ دو اور اس کے بعد کتاب لے کر بستر میں گھس جاؤں۔ پھر اچانک ہی وہ گلابی رنگ میری آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔ لڑکی بہت دلکش تھی۔ کیوں نہ میں اسے تلاش کروں۔ بہرحال جو کچھ ہوا تھا وہ ایک الگ بات تھی لیکن اس لڑکی کے غیر معمولی حسن کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اسے تلاش کرنا شروع کر دیا۔ مناسب الفاظ میں معذرت کے لئے لفظوں کی تلاش شروع کر دی۔ کچھ وقت اور گزرا۔ یہ ہوٹل کے مہمانوں کے ہال میں جمع ہونے کا وقت تھا۔ میں اپنے کمرے میں داخل ہوا اور بہت ہی خوبصورت سوٹ پہنا اور اس کے بعد اپنے آپ کو درست کر کے ٹہلتا ہوا ہال میں پہنچ گیا۔ ایک بات میں آپ کو بتاؤں جب سے ایلس فیوری سے میرے قربت کے تعلقات ہوئے تھے، میرے ذہن میں کچھ کچھ عورت جاگ اٹھی تھی۔

بہرحال میں نیچے ہال میں داخل ہو گیا۔ اس زمانے میں بمبئی کے اس ہوٹل کا نام پوری بمبئی میں مشہور تھا۔ یہاں راجہ، مہاراجہ، نواب اور کروڑ پتی سیٹھ، دولت مند غیر ملکی ہی آتے تھے۔ چھوٹے موٹے دیسی اور انگریز افسر ہوٹل کے ریستوران یا بار سے آگے جانے کی ہمت ذرا کم ہی کیا کرتے تھے۔ میں نے ہال میں نگاہیں دوڑائیں۔ حکمران قوم کے سول یا فوجی ملازمین جو اپنی اکڑی ہوئی گردن سے پہچان لئے جاتے تھے بہت کم نظر آ رہے تھے۔ غیر ملکی سیاحوں، تاجروں یا جوڑوں نے بیشتر میزوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ طرح طرح کے چہرے نظر آ رہے تھے۔ کانوں میں منڈلیاں اور کنٹھے پہنے، گلے میں انتہائی قیمتی اور سچے موتیوں کی مالائیں ڈالے رنگ برنگے ہیڈوں پر شتر مرغ کے پَر لگائے کچھ راجے، نواب ٹائپ کے لوگ، ڈھیلے ڈھالے ریشمی سوٹوں اور رنگ برنگی ٹائیوں میں ملبوس امریکی سیاح اور روایتی سیاہ رنگ کے سوٹوں میں ملبوس سیاح، رونی صورتیں بنائے کچھ انگریز بہادر۔ غرض عجب ملا جلا ہجوم تھا۔

مجھے جو میز ملی تھی وہاں سے ہال میں داخل ہونے والوں پر آسانی سے نظر رکھی جا سکتی تھی۔ بہرحال یہ اتفاق ہی تھا کہ میرے لئے اس کمرے کی مطابقت سے یہ میز مخصوص تھی۔ ہال اجنبی چہروں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے اس ایک مانوس چہرے کی تلاش میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں لیکن وہ گلابی ساڑھی والی نظر نہیں آئی۔ ویٹر نے میرے سامنے میری مطلوبہ چیزیں رکھ دی تھیں۔ میری بے کیفی بڑھتی جا رہی تھی اور میں سوچ رہا

تھا کہ سمندر کی طرف نکل جاؤں اور تھوڑی چہل قدمی کرنے کے بعد کمرے میں جا کر بند ہو جاؤں۔ گلابی ساڑھی والی تو نظر نہیں آئی تھی۔

بہر حال بمبئی میں میرا پہلا دن تباہ ہو گیا۔ میں کسی ویٹر کو اشارہ کر کے بلانے ہی والا تھا کہ میں نے دیکھا کہ دو وردی پوشوں کے ساتھ وہی معزز بزرگ یعنی آدم زمان صاحب لڑکی کے ساتھ اندر داخل ہو رہے ہیں۔ میرے ذہن کو ایک خوشگوار سی کیفیت کا احساس ہوا اور میں نے فوراً ہی ایک منصوبہ تیار کر لیا۔ میں نے دیکھا کہ ہال کے کیپٹن نے ایک ریزرو میز پر ان دونوں باپ بیٹی کو بھی بٹھا دیا۔ دونوں باڈی گارڈ ہال میں لگی کرسیوں پر جا بیٹھے لیکن ان میں وہ تیسرا باڈی گارڈ نہیں تھا جس کی میں نے مرمت کی تھی۔ لڑکی اس وقت جھلملاتے قیمتی کپڑے کا گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ موتیوں کی ایک سادہ سی لڑی اس کے گلے میں پڑی ہوئی تھی اور اس نے بہت ہلکا پھلکا سا خوبصورت میک اپ کیا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں شاید کوئی خوبصورت زیور تھا۔ وہ بڑے انہماک سے اپنے باپ سے باتیں کر رہی تھی۔ یہ میرا اندازہ تھا کہ وہ اس کا باپ ہی ہو سکتا ہے۔

بیرے کو بلا کر میں نے اپنے بل پر دستخط کئے۔ پرس نکال کر اس کو ٹپ دیا اور میزوں کے درمیان ٹہلتا ہوا میں ہال کے دروازے کی طرف اس طرح چلا جیسے باہر جانا چاہتا ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا راستہ اختیار کیا تھا کہ میں آدم زمان کی میز کے سامنے سے گزروں۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ لڑکی نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اس نے ایک دو بار سر اٹھا کر مجھے اپنی میز کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ کسی قدر بے چین سی ہو گئی۔ شاید اپنی اس بے چینی کو چھپانے کے لئے وہ بڑے میاں سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ اسی وقت سامنے سے ایک دیو قامت بڑھیا، اسٹیم انجن کی طرح ہانپتی ہوئی آنے لگی تو میں نے اسے راستہ دینے کے بہانے آدم زمان کی میز کے گرد ایک چکر سا لگایا اور پھر یکایک جیسے میں نے آدم زمان کو پہچانا اور رُک گیا۔ پھر میں دونوں ہاتھ پھیلا کر حیرت اور مسرت کے ساتھ اس کی جانب بڑھا اور میرے منہ سے آواز نکلی۔

"آہا...... سیٹھ آدم زمان۔"

آدم زمان نے گردن اٹھا کر چندھیائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کپکپاتی ہوئی آواز میں اسی تپاک سے بولا۔ "ہیلو...... ہیلو مسٹر...... مسٹر......" وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا اور میں بڑی بے تکلفی سے اسے دیکھ کر مسکرانے لگا جیسے مجھے معلوم تھا کہ آخر

کار وہ مجھے پہچان ہی لے گا۔ بڑے میاں میری بے مقصد مسکراہٹ دیکھ کر کچھ نہ کچھ کہنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔

"مائی ڈیئر! تم یہاں؟"

"بس، آج ہی پہنچا ہوں۔" میں نے بے تکلفی سے کہا اور پھر جلدی سے بولا۔ "آپ کو پتہ ہے مسٹر آدم زمان، کہ ہم کسٹم والے تو خانہ بدوش ہوتے ہیں۔"

"اوہو، اچھا...... ہاں، ہاں، ہاں۔" آدم زمان نے زبردستی اپنی مصنوعی بتیسی نمایاں کرتے ہوئے کہا پھر بولا۔ "مگر یہاں کیا آپ کا تبادلہ ہوا ہے؟"

"یہی بات ہے...... بالکل یہی بات ہے۔" میں نے گردن ہلا کر کہا اور اگلا فقرہ تیار کرنے لگا۔ میں نے خاص طور سے اس بات کو ذہن میں رکھا تھا کہ سیٹھ آدم زمان شراب کا امپورٹر تھا۔ اس کے علاوہ بھی اور بہت سی چیزیں امپورٹ کرتا تھا لیکن کسٹم والے سے دوستی تو اس کی خوش قسمتی تھی۔ اب چہرے اور نام کون یاد رکھتا ہے۔ پھر اس نے جلدی سے کہا۔

"اچھا اب آپ یہ بتایئے کہ کوئی پروموشن وغیرہ ہوا یا ویسے ہی تبادلہ ہو گیا ہے؟"

میں نے دل میں سوچا کہ اب اپنا پروموشن بھی کر لینا چاہئے ورنہ آدم زمان کو متاثر کرنا آسان نہ ہو گا۔ میں نے خوشخبری سنانے والے انداز میں کہا۔

"آپ کو نہیں پتہ، میں یہاں ایکسٹرا اسسٹنٹ کلکٹر ہو کر آیا ہوں۔" یہ ایکسٹرا مجھے بروقت سوجھ گیا تھا۔ کیونکہ ممکن ہے کل ہی سے بھائی آدم زمان بمبئی کے کسٹم میں مجھے تلاش کرنا شروع کر دیں۔

ایک لمحے کے لئے آدم زمان کے چہرے پر عجیب سی تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس نے جھرجھری لی اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"ارے، آپ کھڑے کیوں ہیں؟ اتنے دن کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ اب میں آپ کو جانے تھوڑی دوں گا۔ بیٹھئے بیٹھئے۔ ہاں، ان سے ملئے۔ یہ میری مسز ہیں عالیہ زمان۔"

"مسز...... مسز...... مسز......"

※☆※

میرا ذہن بھک سے اُڑ گیا۔ حالانکہ آدم زمان کا ڈھیلا ڈھالا لجلجی ہاتھ مصافحے کی غ
میں میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا لیکن میرا ہاتھ جیسے مُردہ ہو گیا تھا۔ یہ تروتازہ گلاب
پھول جیسی گلابی لڑکی اس پرانی لاش کی بیوی ہے۔ میں نے آدم زمان کے ہاتھ سے ا
چھڑایا اور عالیہ زمان کی طرف گھوم کر تعظیماً جھک جانا چاہا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑ
دیا۔ اس کا نرم و نازک ہاتھ جوان خون کی صحت مند گرمی سے جل رہا تھا۔ مصافحہ کر
ہوئے ہم دونوں کی نگاہیں ملیں تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ لفٹ کے واقعہ کو یاد کر کے
شرمندہ سی ہے۔ اب اپنا نام بتانا بھی ضروری تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ میرا نام شہریار ہے۔" نجانے کیوں میر
زبان سے میرا نام غلط نکلا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نام بتانے میں میری قوتِ ارادی کا د
نہیں تھا۔ لیکن نجانے کیوں میں نے اسے اپنا نام غلط بتایا تھا۔

"ہیلو...... اچھا، آپ یہ بتائیے آپ کیا پئیں گے؟" عالیہ زمان براہِ راست میر
جانب متوجہ ہو گئی۔ مگر میں نے ایک بات خاص طور سے محسوس کی تھی، اس کے انداز
ایک معنی خیز سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جسے میں فوری طور پر کوئی معنی نہیں دے سکا تھا
نجانے اس کے انداز میں ایسی کیا خاص بات تھی۔ کیا وہ میرا اصل نام جانتی ہے؟ اور ا
وقت اپنا غلط نام بتانے سے اس کی یہ کیفیت پیدا ہوئی ہے؟ بہر حال بڑی عجیب سی با
تھی یہ۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اسے ٹٹول کر کہا۔

"مسز آدم زمان! تھوڑی دیر پہلے آپ مجھے ڈانٹ پلا چکی ہیں۔ اس سے میرے منہ
مزا خراب ہو گیا ہے۔ اس وقت آپ کچھ بھی پلا دیں۔"

وہ ایک دم ہنس پڑی۔ آدم زمان احمقوں کی طرح ہم دونوں کی صورت دیکھ رہا تھا
پھر وہ بولی۔ "تو پھر اس کے لئے کولڈ کافی بہتر رہے گی۔ مجھے بھی پسند ہے اور مجھے یقی
ہے کہ آپ کو بھی پسند آئے گی۔ ویسے ہم دونوں کی پسند ایک جیسی ہے یعنی میری ا

میرے شوہر کی۔ وہ زمان! اصل میں شہریار صاحب جس ڈانٹ کا تذکرہ کر رہے ہیں اس کی تفصیل یوں ہے کہ لفٹ میں ان سے ملاقات ہو گئی تھی اور واقعی اب مجھے اس بات پر شرمندگی ہو رہی ہے کہ ان جیسے نفیس انسان سے میں بڑی بدتمیزی سے پیش آئی تھی۔"

"اوہو...... اوہو...... اوہو۔" آدم زمان احمقوں کی طرح ہنسنے لگا۔ "آپ نے میری مسز کی بات کا برا تو نہیں مانا مسٹر شہریار؟ ویسے عالیہ! تمہیں کس بات پر غصہ آیا تھا؟"

وہ جلدی سے بولی۔ "مسٹر شہریار صاحب سگریٹ پیتے ہوئے لفٹ میں داخل ہوئے تھے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ اگر مناسب ہو تو سگریٹ بجھا دیں۔ بس یہ بات ہوئی تھی۔"

ایک بار پھر میں حیران رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ عالیہ کیا کھیل، کھیل رہی ہے اور کیوں کھیل رہی ہے۔ بظاہر تو ایسی کوئی صورت نہیں تھی کہ وہ میرے لئے یا میرے سلسلے میں جھوٹ بولے۔ بہر حال مجھے اس کی لاج تو رکھنی ہی تھی اور یہ سب کچھ بھی میں بالکل غیر اختیاری طور پر کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"مگر محترمہ! آپ کے حکم پر میں نے سگریٹ تو بجھا لی تھی۔ وہ تو بس آپ کے باڈی گارڈ نے......" مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے اپنے جھوٹ میں شریک ہونے سے خوش ہوئی ہو۔ اب اس نے اور زیادہ بے تکلفی سے قہقہہ لگایا اور میری بات کاٹ کر بولی۔

"وہ باڈی گارڈ...... وہ بے ضرر آدمی ہے۔" میں نے ایک دم محسوس کیا کہ باڈی گارڈ کے ذکر پر آدم زمان نے کان کھڑے کر لئے تھے اور پھر انہوں نے جلدی سے کہا۔

"تو کیا اس نے شہریار صاحب کے ساتھ بدتمیزی کی تھی؟"

عالیہ نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر بڑی میٹھی آواز میں اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر بولی۔ "نہیں۔ وہ جیت سنگھ نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو رامیشر تھا۔ رامیشر نے شہریار صاحب کو لفٹ میں لگا ہوا نوٹس دکھایا تھا۔ بدتمیزی تو کوئی نہیں کی تھی۔"

آدم زمان جو پوری طرح اس وقت اپنی بیوی کی جانب متوجہ ہوا تھا اور ساری تفصیل جان لینا چاہتا تھا، بدستور جھکا ہوا بولا۔ "پھر کیا ہوا؟"

مجھے یوں لگا جیسے عالیہ اس سوال جواب سے کافی الجھ رہی ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ ڈرامہ میری بالکل سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن پھر بھی غیر فطری طور پر میں نے سوچا کہ اس خوبصورت لڑکی کی مدد کرنی چاہئے چنانچہ میں ہنس کر بولا۔

''نہیں جناب! چھوٹی سی بات تھی۔ وہ تو بس اتفاقیہ طور پر تذکرہ ہو گیا تھا۔ ہوا یہ کہ آپ کے ملازم نے مجھے لفٹ میں لگا ہوا نوٹس دکھایا۔ یہ بات مجھے کچھ اچھی نہیں لگی اگرچہ اصول کی بات تھی لیکن میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ اس پر عالیہ صاحبہ نے مجھے ہلکی ڈانٹ پلائی اور کہنے لگیں کہ ملازموں سے الجھنے کی بجائے مجھے ایک معقول آدمی کی حیثیت سے سگریٹ بجھا دینی چاہئے تھی۔ بس یہ تھی ساری بات۔''

''ارے اوہ...... بس اتنی سی بات؟'' آدم زمان پھر بیوقوفوں کی طرح ہنسنے لگا

بہرحال میں نے اس کی مدد کی تھی لیکن بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی کہ آخر ایک اجنبی کے سامنے عالیہ زمان اپنے بوڑھے شوہر سے کیوں جھوٹ بول رہی ہے؟ کیا رامیشر کو بچانا چاہتی تھی؟ یقیناً ایسی ہی بات تھی۔ اس بات کے امکانات تھے کہ آدم زمان رامیشر کو پسند نہیں کرتا ہوگا۔ اس کے انداز سے ہی ظاہر ہو گیا تھا۔

اس عرصے میں ویٹر آیا اور عالیہ نے اسے کولڈ کافی کا آرڈر دے دیا۔ ویٹر نے تھوڑی دیر کے بعد بہت ہی خوبصورت برتنوں میں یہ کافی سرو کر دی تھی۔ کچھ ہی لمحے گزرے آدم زمان نے دور بیٹھے ہوئے گارڈ کو اشارہ کیا اور ایک گارڈ پھرتی سے اپنی جگہ سے ا اور آدم زمان کے پاس آ گیا۔ آدم زمان نے ہم دونوں کی طرف رخ کر کے کہا۔

''بس ایک منٹ۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اٹھا دی اور دونوں سمجھ گئے کہ وہ واش روم جانا چاہتا ہے۔ لیکن پھر حیرت کا دوسرا لمحہ نمودار ہوا۔ سے پہلے عالیہ زمان ہنستی اور مسکراتی مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ لیکن آدم زمان کے قدم جاتے ہی اس نے کسی قدر خشک انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں سمجھتی کہ تم کس چکر میں ہو۔ اور سنو ایک بات میں اچھی طرح جانتی ہو کہ کسٹمز سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی میں دعویٰ سے کہتی ہوں کہ تم نام شہریار نہیں ہے۔''

میرے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہو کہا۔ ''میرا خیال ہے ہم دونوں ایک ہی کھیل، کھیل رہے ہیں میڈم! اور ہر لمحہ کم از میرے لئے تو حیرانی کا لمحہ ہے۔ اب دیکھئے نا، کتنی خوبصورتی سے مسلسل جھوٹ بول رہی ہیں آپ۔ یہ الگ بات ہے کہ میں آپ کے تمام جھوٹوں کی تصدیق کر رہا ہوں۔ باڈی گارڈ کا نام رامیشر نہیں، جیت سنگھ ہے۔ اگر اس کا نام رامیشر ہوتا تو آپ

بتایئے کہ کیا اسے نوکری سے نکال دیا جاتا؟''

اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ دبے اور بھنچے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''بکواس بند کرو۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ اور تم کیا سمجھتے ہو، بہت زیادہ چالاک ہو تم؟ جیت سنگھ نے تمہارا نام ریسپشن سے معلوم کر لیا تھا اور میں تمہیں تمہارا نام بتا سکتی ہوں مسٹر خاقان جمشیدی۔ مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ تم میرے شوہر کے ساتھ کوئی فراڈ کرنا چاہتے ہو۔''

میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ یہ عورت اب حد سے بڑھتی جا رہی تھی۔ چنانچہ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''محترمہ! میں بھلا اس کے ساتھ کیا فراڈ کروں گا۔ اس کے ساتھ تو مسلسل فراڈ ہو رہا ہے۔ اس فراڈ کے بارے میں معلوم کرنے میں مجھے بہت دلچسپی ہے۔ اور یہ دلچسپی کیوں ہے اس کی تفصیل میں کم از کم آپ کو نہیں بتا سکتا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' عالیہ ناگن کی طرح پھنکاری۔

''صرف اتنا کہ آدم زمان کے لئے ویسے ہی الجھنیں کچھ کم نہیں ہیں۔ اس عمر میں انہیں ذرا سا سکون مل جاتا تو کیا برا تھا۔ بہرحال بے چارے کی تقدیر میں یہی سب کچھ لکھا تھا۔ اب دیکھئے نا......'' میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ہم نے آدم زمان کو واپس آتے ہوئے دیکھا۔ وہ باڈی گارڈ کے ساتھ ہال میں داخل ہو رہا تھا۔ عالیہ نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

''آخر اب تم چاہتے کیا ہو؟''

میں نے آدم زمان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں جانتا۔ ویسے یہ بات میں جیت سنگھ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔''

نجانے کیوں عالیہ تلملا کر رہ گئی لیکن بولی کچھ نہیں۔ کیونکہ آدم زمان اپنی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ چند لمحات پہلے عالیہ کے چہرے پر خشک روی کے جو تاثرات پھیل گئے تھے وہ پھر شگفتگی میں تبدیل ہو گئے۔ آدم زمان گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ عالیہ کہنے لگی۔

''آدم جی! آپ کے دوست شہریار تو بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ ابھی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ آدم زمان جی مجھے بالکل نہیں پہچانے لیکن بہت ہی نفیس انسان ہیں۔ انہوں نے اپنے رویے سے محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ مجھے نہیں پہچانتے ہیں۔''

''ارے نہیں نہیں۔ اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔'' آدم زمان نے جلدی سے کہا اور

عالیہ زمان ہنس پڑی اور بولی۔

"آپ نے دیکھا مسٹر خاقان! آدم جی ابھی تک آپ کو نہیں پہچانے اور آپ کو شہریار ہی سمجھ رہے ہیں۔"

آدم زمان حیرت سے بولا۔ "خاقان...... خاقان...... کون خاقان؟" اس کے سوال میں بڑا تعجب تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"جی محترمہ صحیح فرما رہی ہیں۔ آپ مجھے خاقان بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ میرا پورا نام شہریار خاقان ہے۔"

"اوہو ہو...... اچھا اچھا، واہ۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شہریار کہہ لیا جائے یا شہریار خاقان۔"

ایک بار پھر عالیہ زمان نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ میں ان نگاہوں کا مفہوم نہیں سمجھ پایا تھا لیکن اس بار اس کے چہرے پر ناخوشگوار کیفیت نہیں تھی۔ غالباً اسے میری تیزی طراری پسند آ رہی تھی حالانکہ وہ کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح مجھے غلط ثابت کر دے لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا تھا۔ ادھر سیٹھ آدم زمان اس کوشش میں مصروف تھا کہ کسٹمز کے ایکسٹرا اسسٹنٹ کلکٹر سے اس کے تعلقات گہرے ہو جائیں۔ میں خود بھی حیران تھا۔ عام حالات میں کسی اجنبی جوڑے کو میں اس طرح اپنے قریب لانے کی کوشش نہ کرتا۔ لیکن نجانے کیوں میرے ذہن میں ایک عجیب سی کلبلاہٹ ہو رہی تھی۔ میں ہر قیمت پر اس مثلث کو سمجھنا چاہتا تھا کہ بوڑھا آدم زمان، اس کی نوخیز بیوی اور دیوقامت جیت سنگھ میں آخر کس قسم کی رسہ کشی ہو رہی ہے۔ پھر سب سے بڑی بات کہ عالیہ کی تیزی طراری نے مجھے بہت متاثر کیا تھا اور میں اپنے اندر ایک عجیب و غریب خواہش محسوس کر رہا تھا۔ میں گلاب کی اس کانٹوں بھری شاخ سے اپنا دامن تار تار کر لینا چاہتا تھا۔ اشبھ بھاونا کے بعد کا شکاری پھر بیدار ہو رہا تھا اور میری آنکھوں میں اس کے حصول کی خواہش بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اسے دیکھا تو وہ سرسری انداز میں بولی۔

"تو آپ کہیں اور سے تبدیل ہو کر یہاں آئے ہیں؟"

"جی جی......" میں نے سوچے سمجھے بغیر جواب دیا۔

"کہاں سے؟"

"بس جہاں جہاں سمندر ہوتا ہے ہم لوگوں کی ڈیوٹیاں وہاں لگتی رہتی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"گویا آپ یہ بتانا نہیں چاہتے کہ آپ کہاں سے تبدیل ہو کر آئے ہیں۔"

"بات اس قدر غیر دلچسپ ہے اور میں آپ کو بتاؤں مسز عالیہ زمان! کہ انسان اپنے مصروف لمحوں سے فرصت پا کر ایسی جگہوں پر سیر و تفریح کے لئے آتا ہے اور میں ایسی جگہوں پر کم از کم کاروباری گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا۔"

میں نے محسوس کیا کہ آدم زمان کے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں۔ میں نے اطمینان سے اپنا گلاس اٹھایا اور کہا۔ "ویسے اگر آپ اس بات پر بضد ہیں کہ میری ماضی کی پوسٹنگ کے بارے میں معلومات حاصل کریں تو میں آپ کو بتاؤں کہ میں کلکتے سے ٹرانسفر ہو کر یہاں آیا ہوں۔"

آدم زمان نے اس طرح گہری اور پُرسکون سانس لی کہ مجھے پھر ہنسی آنے لگی۔ اب وہ کرسی پر اس طرح پھیل کر بیٹھ گیا تھا جیسے کوئی بہت بڑی الجھن اس کے ذہن سے دور ہو گئی ہو۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا جیسے اسے اپنے تمام سوالوں کا جواب مل گیا ہو۔

"ہاں واقعی، یہی وجہ ہے کہ میری آپ سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ورنہ اور دوسری جگہوں پر یقیناً آپ سے کہیں نہ کہیں ٹکراؤ ہو جاتا۔ ویسے کلکتہ بڑی اعلیٰ جگہ ہے۔"

عالیہ کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے اپنی ناکامی پر افسوس ہوا ہو۔ اس کے چہرے کی حسین جلد کے نیچے ایک ہلکی سی نیلاہٹ کی تہہ نمودار ہونے لگی تھی جو اس کی دلکشی میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس کے بعد وہ کسی قدر خاموش ہوئی اور ہم دونوں کی باتیں سننے لگی۔ کم از کم اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کسی بھی طرح اس سے مات کھانے والوں میں سے نہیں ہوں لیکن پھر بھی اس نے ایک سوال کیا۔

"واقعی! کلکتے کے بہت سے افراد کے بارے میں، میں جانتی ہوں۔ آپ اپنے ان شناساؤں کا تذکرہ کریں گے؟"

یہ کام میرے لئے کون سا مشکل تھا۔ میں نے کلکتے کے جم خانے کے تقریباً تمام ہی ممبروں کے نام گنوا دیئے اور جو جو نام میں لے رہا تھا ان کو سن کر آدم زمان بار بار اچھل رہا تھا کیونکہ ان میں سے وہ بہت سوں کو جانتا تھا۔ اس نے بتایا کہ پچھلے چند برسوں میں وہ کلب کے ماحول سے الگ سا ہو گیا ہے اور کلکتے میں بھی وہ ایک دو ہفتے سے زیادہ نہیں

ٹھہرتا۔ ہم دونوں کلکتے کی باتیں کرتے رہے اور عالیہ اپنا گلاس سامنے رکھے بیزاری ہال میں نگاہیں دوڑاتی رہی۔

آدم زمان کو بہت زیادہ باتیں کرنے کی عادت تھی۔ اس نے مجھے اپنی جوانی بہت سے واقعات سنائے اور میں نے ان میں پوری پوری دلچسپی لی۔ اصل میں عالیہ کو تپانے میں لطف آ رہا تھا۔ پھر جب آدم زمان کی رفتار سست ہونے لگتی تو میں کوئی ا بات کہہ دیتا جس سے اس بے چارے کی سنہری یادوں کے زمانے میں ایک دریچہ کھل جاتا۔ اب صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ عالیہ زمان اپنی کرسی پر بیٹھی بار بار پہلو بد رہی تھی۔ مجھ سے نگاہ ملتی تو اس طرح گھور کر دیکھتی جیسے اس کا بس نہیں چلتا ورنہ مجھے گو سے اڑا دے۔

گھنٹے بھر کے بعد جب میں نے دیکھا کہ اب آدم زمان کو بھوک ستانے لگی ہے اور ہال کیپٹن کو بلا کر کھانا منگوانے ہی لگا ہے تو میں نے کرسی پیچھے کھسکائی اور اجازت لے کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے ارے...... کیا مطلب؟"

"میں جانتا ہوں کہ آپ کھانا طلب کرنے والے ہیں۔"

"تو کیا فرق پڑتا ہے؟ آپ کھانا ہمارے ساتھ کھا لیجیے۔"

"نہیں، پہلی ملاقات میں کسی کو اتنی تکلیف دینا ایک ناخوشگوار عمل ہے۔"

"آپ کون سے کمرے میں مقیم ہیں؟"

میں نے اپنے کمرے کا نمبر بتایا تو اس نے بھی مجھے اپنے کمرے کا نمبر بتا دیا اور بولا۔ "آپ ضرور میرے پاس آئیے۔"

میں نے ایک بار پھر عالیہ زمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کہا۔ "ہاں، یقیناً۔ بھلا آپ کے پاس آئے بغیر میں کیسے رہ سکوں گا۔ آپ سے مل کر تو کلکتے کی یادیں تازہ ہو گئی ہیں۔"

عالیہ شاید میری زبان سے کچھ اور سننا چاہتی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ خون کے گھونٹ پی رہی ہو۔ بہرحال میں وہاں سے واپس چل پڑا۔ پتہ نہیں کیوں اس ملاقات سے ایک خوشگوار تاثر دل و دماغ پر پیدا ہوا تھا۔ لیکن اس بات کو میں پورے وثوق اور دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ یہ جوڑا بے حد پراسرار ہے۔ خاص طور سے عالیہ زمان۔ پہلی

بات تو یہ کہ اس طرح اس سے میری ملاقات ہوئی اور دوبارہ بھی اس سے ملنے کی خواہش میں نے اپنے دل میں محسوس کی۔ جبکہ میں کوئی اوباش طبع انسان نہیں تھا۔ ہزاروں خواتین اور لڑکیاں میری زندگی میں آئی تھیں۔ بس ایک فیوری ایسی تھی جو میری مجبوری بن گئی تھی۔ لیکن اب یہ بار بار مجبوری بن رہی تھی۔

کمرے میں آ کر میں نے لباس تبدیل کیا اور بستر میں آ کر گھس گیا لیکن ان دونوں کے تصور نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ خاص طور سے عالیہ میرے ذہن پر سوار تھی۔ کیا لڑکی ہے اور کس عیاری سے اس بوڑھے کو انگلیوں پر نچا رہی ہے۔ پہلے تو مجھے افسوس ہوا تھا کہ اتنی خوبصورت اور دلکش لڑکی اس بوڑھے گدھ کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔ لیکن اب یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ پھر باڈی گارڈ جیت سنگھ کا مسئلہ بھی تھا۔ باڈی گارڈ اگر اس کا محبوب نہیں ہے تو کم از کم عالیہ کا رازدار ضرور ہے اور ہو سکتا ہے وہ اس کو اپنے کسی آشنا سے ملنے میں مدد دیتا ہو۔

بہرحال اس سلسلے میں، میں کوئی اور دلچسپی نہیں رکھتا تھا کیونکہ مجھے یہ اندازہ تھا کہ آدم زمان قابل ہمدردی انسان نہیں ہے اور نہ ہی مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی تھی کہ جیت سنگھ عالیہ کا ساتھی بنا ہوا ہے یا عالیہ کتنے لوگوں سے اپنی دلچسپیاں وابستہ کئے ہوئے ہے۔ میں تو بس یہ جانتا تھا کہ یہ شکل مجھے بھا گئی تھی اور مجھے ہر قیمت پر اس کا قرب اختیار کرنا ہے۔ آرام دہ مسہری پر کروٹیں بدلتے ہوئے میرے ذہن میں خیالات کا چرخہ چلتا رہا اور مجھے بدھ بھکشو کے وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے گیارہ برس کے خاقان جمشیدی سے کہے تھے۔ اس نے کہا تھا۔

"آپ آتماؤں کے شکاری ہیں اور جنم جنم کی آتمائیں آپ کا شکار ہیں۔"

بڑا ناقابل فہم جملہ تھا۔ آتماؤں کے شکاری یعنی روحوں کا شکار کرنے والے۔ لیکن اب اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اب شکاری بن چکا تھا اور اس وقت ایک خوبصورت آتما میری زد پر تھی۔ بالکل صحیح کہہ رہا تھا وہ شخص وردان سادھانی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ دھن راج، آج سے دھیان کے راستے پر آپ کی یاترا شروع ہوتی ہے۔ بات اس کے عقیدے کی تھی لیکن سچ ہی تو تھا۔ یہ دھیان ہی کا تو راستہ تھا جس پر میں اس وقت رواں دواں تھا۔

اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ لفٹ والے واقعے سے پہلے میں نے باڈی گارڈ جیت

سنگھ کو کہیں دیکھا ہے۔ یہ اچانک ہی تبدیلی میرے اندر پیدا ہوئی تھی مگر یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں۔ بس خیالات تھے جو ذہن کے پردے پر ضربیں لگا رہے تھے۔ حالانکہ اس وقت جب لفٹ میں، میں نے اس کے جبڑے پر گھونسہ مارا تھا اور ایک باکسر کی حیثیت سے اسے چیلنج کر دیا تھا اور نیچے گرا دیا تھا تو اس وقت سے لے کر اب تک میرے دل و دماغ پر اس کی کوئی قدیم تصویر نہیں تھی۔ لیکن بس یوں لگتا تھا جیسے میرے دماغ کے پردوں کی آزادی بھی کسی کے قبضے میں ہو۔ پھر اچانک ہی میرے ذہن میں بجلی سی کوند گئی۔ میرے ذہن میں خیال آیا اور میں بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آج ہی مجھے بھوج پتر ملا تھا اور اس پر میں نے ایک شخص کو وردی پہنے ہاتھ اٹھائے رقص کرتے دیکھا تھا۔ اور پھر اس کے نقوش میرے ذہن میں نمایاں ہوتے چلے گئے۔ رقص کرنے والا یہ شخص میرا پرانا دوست نہیں تھا بلکہ یہ جیت سنگھ تھا۔ سو فیصدی جیت سنگھ...... واقعی...... بھوج پتر پر نظر آنے والی تصویر مجھے اپنی تمام تفصیل کے ساتھ یاد آ گئی اور اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ جیت سنگھ ہی تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایک اور احساس ہوا وہ یہ کہ اس تصویر میں جیت سنگھ رقص ضرور کر رہا تھا مگر اس کے چہرے پر انتہا درجے کا خوف و ہراس تھا۔ میں بے چینی سے اٹھ کر اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ واقعی...... واقعی...... کیا ہو رہا ہے یہ؟ آخر یہ سب کیا تھا...... کیا؟

میں نے کچھ دیر تک سوچا اور اس کے بعد اچانک ہی مجھے ردی کی وہ ٹوکری یاد آ گئی جس میں، میں نے بھوج پتر ڈال دیا تھا۔ میں پھرتی سے اٹھ کر ٹوکری کی جانب دوڑا لیکن ٹوکری خالی تھی۔ بھوج پتر پتہ نہیں کب اور کیسے غائب ہو گیا تھا۔ بے خیالی کے سے انداز میں، میں نے اپنے کمرے کے ایک ایک گوشے پر نگاہ ڈالی لیکن کمرہ صاف شفاف تھا۔ بھوج پتر یہاں کہاں سے آ سکتا تھا؟ وہ غائب ہو چکا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ میرے خدا...... میرے خدا...... اس کا مطلب ہے کہ اب کسی نہ کسی شکل میں اس بے چارے جیت سنگھ کی باری ہے۔ آدم زمان، اس کی بیوی عالیہ، جیت سنگھ، آدم زمان کا باڈی گارڈ۔ خدا کی پناہ...... خدا کی پناہ...... نجانے وقت مجھے کون کون سے راستوں پر لے جا رہا ہے۔

✲✫✲

اس خوبصورت اور بمبئی کے سب سے بڑے ہوٹل میں میرے اگلے چار پانچ دن اس

طرح گزرے کہ جونہی صبح ہوتی، آدم زمان کا فون آ جاتا۔ اسے مجھ سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ ہو گیا تھا۔ وہ کہتا۔

”جاگ گئے ہو۔ میں نے جلدی تو نہیں جگا دیا؟“

”نہیں سیٹھ صاحب۔“

”تو پھر آ جاؤ۔ ناشتہ ساتھ ہی کریں گے۔“

اور جب میں وہاں پہنچتا تو باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور یہ سلسلہ لنچ کے وقت تک جاری رہتا۔ مجھے بھی اس شخص سے اچھی خاصی دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ یہ خاصا دلچسپ آدمی تھا۔ وہ مجھ سے کہتا۔

”بہت جلد میں دنیا کے دورے پر جانا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ بمبئی میں، میں نے جو کاروبار پھیلا رکھا ہے بمبئی سے جانے سے پہلے اس کے حالات ٹھیک ٹھاک کر دوں تاکہ میری غیر حاضری میں بھی یہ کام معمول کے مطابق ہوتا رہے۔“

”کیوں نہیں مسٹر آدم زمان!“ میں اسے جواب دیتا۔

تقریباً ہر شام کو وہ اپنے منیجروں کے ساتھ اپنے مختلف گوداموں اور دفاتر کے دورے پر نکل جاتا۔ شام کو البتہ میری جان اس سے چھوٹ جاتی تھی اور میں جس طرح چاہتا وقت گزارتا۔ ویسے تھوڑے ہی وقفے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ اپنی بیوی کی حرکتوں سے کسی حد تک واقف ہے کیونکہ ہر وقت اس کی یہی کوشش رہتی کہ عالیہ زمان اس کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ میں نے جب یہ بات محسوس کی تو خود بھی بہت محتاط ہو گیا اور اس کی موجودگی میں بڑی پرہیزگاری کا مظاہرہ کرتا رہا۔ حالانکہ عالیہ فطرتاً دل پھینک محسوس ہوتی تھی اور یہ اندازہ ہوتا تھا اس کے بارے میں کہ خاصی شوقین فطرت کی مالک ہے۔ لیکن آدم زمان کی لاکھ کوششوں کے باوجود میں نے ایک بار بھی ایسے شبے کا موقع نہیں دیا اور عالیہ کی طرف سے مسلسل لاپرواہ رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ باہر جاتا تو عالیہ کو باڈی گارڈوں کے سپرد کرنے کی بجائے مجھ سے الجھا کر چلا جاتا اور اس کے بعد اس کے آنے تک میں اور عالیہ اس کا انتظار کرتے رہتے۔

ایسے موقعوں پر عالیہ کا ایک دلچسپ مشغلہ ہمارے کام آتا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لگا لیتی اور اس کے بے شمار ٹکٹوں کو البموں میں لگانے کا بیزار کن فرض مجھے بھی ادا کرنا پڑتا۔ کبھی آدم زمان اپنے کھاتے نکال کر ٹیبل پر پھیلا جاتا اور ہم سے کہہ جاتا کہ ہم کھاتوں پر ایک

نظر ڈالیں کہ کہیں اکاؤنٹنٹ نے کوئی غلطی تو نہیں کی ہے۔

مجھے اکاؤنٹس کا تو کوئی خاص تجربہ نہیں تھا لیکن عالیہ اس سلسلے میں زبردست ماہر تھی ممکن ہے وہ طویل عرصے سے آدم زمان کا یہ کام کرتی رہی ہو چنانچہ وہ میرے ساتھ شامل ہو کر یہ حساب چیک کرتی رہتی۔ ویسے جو پارسائی کا مظاہرہ میں نے آدم زمان کے سامنے کیا تھا اس نے عالیہ کو میری طرف سے کسی حد تک بددل کر دیا تھا اور وہ حقیقت میں یہ سمجھنے لگی تھی کہ میں عورت پسند انسان نہیں ہوں۔ اس بات سے وہ اپنی توہین بھی محسوس کرنے لگی تھی اور مجھ سے بہت کم بات کرتی تھی۔

پھر کچھ دن کے بعد ایک نئی بات ہونے لگی۔ وہ یہ کہ آدم زمان عالیہ کو ہوٹل پر چھوڑ کر جاتا تو جیت سنگھ کو اپنے ساتھ ہی لے جاتا۔ ویسے بھی وہ اسے شہر کے دور دراز کاموں میں الجھائے رکھتا۔ ہفتے بھر سے زیادہ ہو گیا تھا مگر مجھے کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جس سے جیت سنگھ اور عالیہ کے درمیان کسی گڑبڑ کے ثبوت ملتے۔ جیت سنگھ کا اور میرا کئی بار سامنا بھی ہوا تھا۔ آدم زمان کے سامنے تو وہ مجھ سے ادب سے پیش آتا لیکن جب وہ مجھے تنہا دیکھتا اس کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی۔ ظاہر ہے پہلے دن کا گھونسہ وہ نہیں بھول سکتا تھا جس سے اس کا جبڑا کئی دن ٹیڑھا رہا تھا۔ ادھر اپنے دوست ولیم ہاروے سے اس پہلی ملاقات کے بعد بھی کئی بار ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے اپنے جہاز پر لے گیا اور اس نے مجھے وہاں کا ماحول دکھاتے ہوئے کہا۔

"اب ذرا دیکھو، جہاز مرمت ہو رہا ہے۔ یہ لوگ کتنا شور مچاتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی اجنبی انسان ان کے درمیان ایک مہینہ رہ جائے تو بہرہ ہو جائے۔"

میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن میں اسے ہوٹل میں لا کر عالیہ سے متعارف کرانا پسند نہیں کرتا تھا۔ البتہ اس نے کئی بار حیرانی سے پوچھا کہ آخر میں دن بھر ہوٹل میں پڑا کیا کرتا رہتا ہوں۔

"بس یہ ہوٹل مجھے ضرورت سے زیادہ ہی پسند ہے۔ یہاں کچھ شناسائیاں بھی حاصل کر لی ہیں میں نے۔" میں نے جواب دیا۔ عالیہ اور آدم زمان سے اس قدر قریب ہونے کا کوئی پس منظر نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں عالیہ کے حسن سے متاثر تھا جب پہلی بار گلابی ساڑھی میں میری اس کی ملاقات ہوئی تھی تو بہت دیر تک وہ میرے ذہن پر سوار رہی تھی۔ اور اب جبکہ مجھے اس کی اس قدر قربت حاصل ہو گئی تھی اور میں

جانتا تھا کہ اگر میں عالیہ کی تھوڑی سی پذیرائی کروں تو وہ پکے ہوئے پھل کی طرح میری آغوش میں آ کر گر سکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں بہت کچھ کھو چکا تھا، بہت کچھ۔ گھر بار، ماں باپ اس طرح میری زندگی سے دور ہو گئے تھے کہ مجھے حیرت ہوتی تھی۔ انسان چند ہی ایسے کرداروں سے تو منسلک ہوتا ہے جو اس کی پوری زندگی پر محیط ہوتے ہیں۔ مگر میں نادانستہ طور پر باپ کو بھی کھو چکا تھا۔ اس باپ کو جس نے انگلی پکڑ کر مجھے دنیا سے شناسا کیا تھا۔ جو باپ سے زیادہ میرا دوست تھا۔ ایک ماہر اور جنگجو شکاری جسے دیکھ کر کئی بار میں نے شیر کو دُم دبا کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ جو مجھے بھی اتنا ہی بڑا شکاری بنانا چاہتا تھا۔ کتنی امنگیں اور آرزوئیں تھیں اس کے دل میں میرے لئے۔ لیکن اس کے بعد انسان کس طرح ایک دوسرے کو بھول جاتا ہے۔ اس نے بھی یہی کیا تھا، سب کچھ چھوڑ کر مجھے دنیا کے حوالے کر کے اپنی منزل کی طرف راہی ہو گیا تھا۔ ادھر والدہ تھیں کہ انہوں نے مجھ سے جیتے جی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ ممتا اور محبت کے سارے قصے ہوا ہو گئے تھے اور میرے اور ان کے درمیان اتنا فاصلہ ہو گیا تھا کہ میں سوچتا تھا کہ شاید کبھی زندگی میں میری ان سے ملاقات نہ ہو سکے۔

بہرحال اور کوئی خاص بات نہیں تھی۔ عالیہ کا مسئلہ مسلسل جاری تھا۔ میں نے بے شک آدم زمان کے سامنے اس سے انحراف کیا تھا لیکن جب آدم زمان کو پورا اطمینان ہو گیا تھا اور وہ جب مکمل طور پر عالیہ کو میرے سپرد کر کے چلا جاتا تھا تو میرے پاس بہترین ذرائع تھے کہ میں عالیہ پر ڈورے ڈال سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اشبھ بھاوناؤں نے مجھے مکمل طور سے اپنے جال میں جکڑا ہوا تھا اور میں ایک خالص برا آدمی تھا۔ پکا برا جس کی برائی میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا۔ اب سارے اقدار، سارے معیار الیس فیوری کے ساتھ ہونے والے واقعہ کے بعد ختم ہو گئے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ایسا انسان اس دوران اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے ان الہام کا سہارا لے لیتا ہے جو کسی نہ کسی طرح اس کی زندگی میں شامل ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو معصوم اور پوتر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہی سب کچھ میں بھی کر رہا تھا۔ البتہ ذرا سی جھنجھلاہٹ ہونے لگتی تھی۔ چونکہ عالیہ کو یہ بات سمجھنی چاہئے تھی کہ میں اس کے گھاگ اور زمانہ شناس شوہر کے سامنے اگر اس سے رغبت کا اظہار کروں گا تو مصیبت نازل ہو جائے گی۔ لیکن وہ مجھ سے مسلسل بددل نظر آتی تھی۔ غالباً اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں اس کی توہین کئے جا

رہا ہوں۔

کافی وقت تک میں اس کے سلسلے میں رفتہ رفتہ کوشش کرتا رہا۔ اصل میں مکمل طور تو میں اس پر پانسہ نہیں پھینک سکتا تھا کیونکہ اگر بھڑک جاتی تو آدم زمان کو ساری حقیق سے آگاہ کر دیتی۔ کیا کرنا چاہیے؟ اور میرے ذہن میں خود ہی ایک تجویز آ گئی۔ میں سوچا کہ اب میں اس کی جانب سے لاپرواہی برتوں۔ عورت کی سب سے بڑی کمز یہی ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے یہی طریقہ اختیار کیا اور اسے یہ تاثر دیا کہ وہ ایک وقتی ہے، میری دلچسپیوں کا مرکز کچھ اور ہے۔

انہی دنوں دکن کا ایک نواب ٹائپ کا خاندان کچھ دن سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں نے ان کی جانب قدم بڑھائے اور ان سے سلام دعا پیدا کر لی۔ اصل میں اس کی وجہ ان کی تیز وطرار لڑکیوں کا حسن و جمال تھا۔ یہ لڑکیاں بہت ہی ماڈرن تھیں اور بمبئی کے بہت ہی شاندار سوئمنگ پول پر اکثر وقت گزارتی تھیں۔ چنانچہ میں نے بھی انہی کی جانب رخ کیا اور سوئمنگ پول پر زیادہ وقت گزارنے لگا۔

ادھر آدم زمان سے اسی طرح ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ فرصت میں اپنی سیاحتوں کے قصے سناتا رہتا اور عالیہ کو بھی بحالت مجبوری اس کے ساتھ ہونا پڑتا تھا۔ لیکن میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ رفتہ رفتہ عالیہ کے اندر کچھ تبدیلیاں رونما ہوتی جا رہی تھیں۔ غالباً یہ ان لڑکیوں کی مہربانی تھی جو اب مجھ سے بہت زیادہ بے تکلف ہو گئی تھیں۔ پھر آدم زمان نے ایک دن صبح ہی صبح دورے پر جاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"بھئی تم لوگ اپنے لئے کوئی مشغلہ تلاش کر لو۔ میں تو آج دن بھر ہی مصروف رہوں گا۔ حالانکہ گرمی بہت زیادہ ہے اور مجھے گرمی سے بچنا چاہیے۔ لیکن کچھ کام بھی ہوا کرتے ہیں۔ عالیہ، تم نے وہ نیا البم تیار کر لیا؟ میں نے تمہیں کچھ غیر ملکی ٹکٹ لا کر دیئے تھے۔"

"نہیں۔"

"واہ...... تو پھر تم باہر کی گرمی سے بچنے کے لئے یہ مشغلہ اختیار کر لو۔" عالیہ نے گردن جھکا دی۔ بہرحال آدم زمان کے ان احکامات کی پابندی وہ بڑی دلچسپی سے کرتی تھی۔ ہم لوگ البم تیار کرنے لگے۔ پھر اس سے جی اکتایا تو عالیہ نے کہا۔

"میں بیئر پیوں گی۔"

"ویٹر کو بلاؤں؟"

"ہاں۔ روم سروس کو فون کر دو۔"

برف میں لگی ہوئی یخ بیئر آ گئی تو عالیہ نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم کب تک انسان بن جاؤ گے؟"

میں نے سنجیدہ نگاہوں سے عالیہ کو دیکھا اور بولا۔ "جب تک مجھے یہ احساس نہ ہو جائے کہ میں انسان نہیں ہوں۔"

"بیئر پیو میرے ساتھ۔"

"میں نے کہا نا کہ ابھی مجھے اپنی غیر انسانی صفت کا احساس نہیں ہے۔ تم پیو، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"اوکے...... اوکے، کچھ تو منگوا لو اپنے لئے۔"

"ہاں، ویٹر میری پسند کا مشروب لینے گیا ہوا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ عالیہ کا موڈ کچھ خراب ہو گیا تھا۔ وہ اپنے پیرس، لندن اور روم کے واقعات مزے لے لے کر سنانے لگی۔ اس نے کہا۔

"بڑا دلچسپ واقعہ ہے۔ روم میں ایک غریب سا آدمی جس کا نام بیرن تھا مجھ پر عاشق ہو گیا تھا اور عموماً مجھ سے عشق بگھارتا رہتا تھا۔ ایک بار میں نے اس کی پٹائی کر دی۔" وہ تفصیل سے مجھے یہ قصہ سناتی رہی۔ پتہ نہیں ان واقعات کو مزے لے لے کر بیان کرنے سے وہ کیا چاہتی تھی۔ پھر اچانک ہی اس نے میری طرف جھک کر پوچھا۔

"ایک بات بتاؤ گے...... بتاؤ گے، بولو؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔ پوچھو کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

"کیا تم ڈبل گیم نہیں کھیل رہے؟"

"ڈبل گیم؟" میں نے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں، مجھ سے لاپرواہی کا اظہار بھی کرتے ہو ایک طرف اور دوسری طرف مجھے پھانسنے کے چکر میں بھی ہو۔"

میں ایک دم چونک پڑا۔ بہرحال عالیہ چالاک تو تھی لیکن وہ یہ بات اتنی آسانی سے محسوس کرے گی اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا، بیئر کی جھاگ سے اس کے بالائی ہونٹوں پر مونچھیں سی بن گئی تھیں۔ میں نے ایک دم اپنا موڈ تبدیل کیا اور ہاتھ بڑھا کر وہ مونچھیں صاف کر دیں پھر کسی قدر مطمئن لہجے میں کہا۔

"ہوسکتا ہے تمہارا خیال درست ہو۔ مگر تم میری پٹائی نہیں کر سکو گی۔ کیونکہ تم مجھے صحیح طور پر نہیں جانتیں۔ میں مار کھانے والوں میں سے نہیں بلکہ مارنے والوں میں سے ہوں۔ سمجھ رہی ہو نا تم؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، پھر بولی۔ "کسی کی پٹائی کی ہے آج تک؟"

"ہاں، کئی ایسی لڑکیوں کی جو میری محبوبائیں تھیں اور انہوں نے ناز و ادا کے مظاہرے کئے تھے۔"

"ایک فرمائش کروں تم سے؟"

"بولو۔"

"اب اگر کسی محبوبہ کی پٹائی کرو تو مجھے ضرور بلا لینا۔ میں یہ منظر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"ابھی......؟" میں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا اور وہ ایک دم چونک پڑی۔

"کیا مطلب؟"

"نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اگر فوری طور پر یہ منظر دیکھنا چاہتی ہو تو آؤ میرے ساتھ میرے کمرے میں چلو۔"

وہ جھنجلا گئی۔ اس نے اپنا بازو میرے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کیا اور بولی۔ "میں تمہارا مطلب سمجھنا چاہتی ہوں۔"

لیکن اچانک ہی اس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو نارمل کیا، اور ریسیور اٹھا کر کچھ دیر سنتی رہی۔ پھر اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور اس نے چہک کر کہا۔

"اوہو......تم، کوشل تم...... میں تو تمہاری آواز بھی نہیں پہچان سکی تھی۔ کیا کر رہی ہو بھئی؟ کہاں ہو؟ فرصت میں ہو نا؟ ویری گڈ...... ویری گڈ...... بالکل، بالکل...... ہاں ہاں، کیوں نہیں...... بالکل ٹھیک ہے، اوکے...... ہاں ہاں بالکل ٹھیک......اوکے۔"

اس نے یہ کہہ کر فون کا ریسیور رکھ دیا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ فون کسی کوشل ووشل کا نہیں ہے اس لئے کہ ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے وہ غیر ضروری طور پر یہ ظاہر کر رہی تھی کہ دوسری جانب کوئی عورت ہے۔ ٹیلی فون آنے کے بعد اس کا رویہ اچانک بدل گیا اور وہ مجھے گھورتی ہوئی بولی۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ تم یہ کہنا چاہتے تھے کہ تم میری بھی پٹائی کر سکتے ہو۔ اس

غلط فہمی کو دل سے نکال دو۔ سمجھ رہے ہو نا؟ اس غلط فہمی کو دل سے نکال دو۔ تم اگر اب چاہو تو جا سکتے ہو۔ میں کچھ مصروف ہو گئی ہوں۔"

"اوکے۔" میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ لیکن میں نے دل میں ایک فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کی اس تبدیلی کا راز معلوم کروں گا اور چھپ کر اس کا تعاقب کروں گا۔ آدم زمان کے بارے میں مجھے اس بات کا علم تھا کہ وہ تین چار گھنٹے سے پہلے تو واپس نہیں آئے گا۔ اگر کوئی عالیہ سے ملنے آیا تو میں دیکھ لوں گا۔ اندازہ یہ تھا کہ وہ باہر نہیں جائے گی کیونکہ اس کے لئے پھر اسے آدم زمانے کے لئے جواب دہی کرنا پڑے گی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا ہو گا۔

بہرحال وقت گزرنے لگا۔ اگر کوئی عالیہ سے ملنے آنے والا ہے تو وہ کون ہو سکتا ہے؟ کم از کم جیت سنگھ تو نہیں کیونکہ وہ آدم زمان کے ساتھ باہر گیا ہے۔ خیر یہ تو پتہ کسی نہ کسی شکل میں چل ہی جائے گا کہ عالیہ کو اس وقت ٹیلی فون کرنے والا کون تھا۔ میں نے اپنے اندر کا جائزہ لیا تو ایک لمحے میں مجھے یہ احساس ہوا کہ میں عالیہ کی طرف ضرورت سے زیادہ ہی مائل ہوں اور دوسروں سے رقابت محسوس کرنے لگا ہوں۔ بہرحال اپنی خواہش یا اسے پاگل پن کہہ لیا جائے کہ میں نے آج طے کر لیا تھا کہ اس شاطر عورت کے نامعلوم محبوب کے بارے میں معلوم کر کے رہوں گا۔

میں باہر نکل آیا اور خیالوں میں ڈوبا ہوا آگے نکل آیا۔ پھر اچانک ہی میں نے دیکھا کہ کوریڈور میں جیت سنگھ صوفے پر بڑا مزے سے سگریٹ پی رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے سگریٹ ڈسٹ بن میں ڈالی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"سر، آپ کہیں جا رہے ہیں؟"

جیت سنگھ کو دیکھ کر میں چونکا تو تھا لیکن پھر بھی میں نے اسے اتنی اہمیت نہیں دی اور کہا۔ "ہاں...... میں کسی کام سے جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا اور میں نے ایک ایسی جگہ منتخب کر لی جہاں سے لفٹ کا دروازہ نظر آتا تھا۔ ویٹر جو میرے لئے مشروب لینے گیا تھا میرے پاس پہنچ گیا اور بولا۔

"سر! آپ کا مشروب آپ کے کمرے میں پہنچا دوں یا میڈم کے کمرے میں؟"

"نہیں، مجھے یہیں دے دو۔" میں نے اس سے کہا اور ویٹر نے ادب سے ایک میز میرے سامنے لگائی اور مشروب اس پر رکھ دیا۔ میں مشروب کے چھوٹے چھوٹے سپ

لینے لگا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ میں نے جیت سنگھ کو دیکھا، وہ لا[illegible] سے باہر آرہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں کینوس کا وہ تھیلا اٹھایا ہوا تھا جو ایک دو بار [illegible] نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ عام طور سے وہ اس تھیلے میں میلے کپڑے بھر کر ڈرائی کلینر [illegible] ہاں لے جاتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ عالیہ ہوٹل کی لانڈری سروس سے اپنے کپڑے [illegible] دھلواتی بلکہ مارکیٹ کے سامنے کوئی اور ڈرائی کلین فیکٹری تھی جہاں اس کے کپڑے ڈ[illegible] کلین ہونے جاتے تھے۔ گویا اس وقت جیت سنگھ لانڈری جا رہا ہے۔ یہ تو بڑی عج[illegible] بات تھی۔ اس نے جیت سنگھ کو بھی چلتا کر دیا تھا۔ اس کا مطلب ہے جیت سنگھ نہیں [illegible] اور شخصیت ہے جو اس سے ملنے آنے والی ہے۔ میں نے بل سائن کئے اور باہر نکل آ[illegible] اچانک میں نے دیکھا کہ ایک اور باڈی گارڈ جس کا نام کریم خان تھا، باہر نکل رہا [illegible] وہ لفٹ کی جانب ہی جا رہا تھا۔ میں ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ لیکن میرا منہ حیر[illegible] سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ اس شاطر عورت نے کیا جال پھیلا رکھے ہیں۔ کریم خان تو بالکل ہی دبا ڈھکا سا آدمی تھا لیکن درپردہ اس [illegible] عالیہ سے تعلقات تھے۔ یہ بات اس وقت مجھے پتہ چلی تھی۔

میں نے تیزی سے لابی عبور کی اور بڑھ کر دیکھا کہ لفٹ اوپر نہیں نیچے کی طرف [illegible] رہی ہے جہاں سوئمنگ پول کا زمین دوز استقبالیہ تھا۔ میرا سر چکرا کر رہ گیا۔ خداوند، یہ [illegible] پراسرار کہانی ہے۔ ویسے مجھے اس بات کا اندازہ تھا کہ ہوٹل کی لابی سے بھی سوئمنگ پو[illegible] پر جا سکتے ہیں لیکن اس کے لئے ریستوران سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ ہوٹل والوں [illegible] خاص طور سے غیر ملکیوں کے لئے زمین دوز راستے کی آسانی رکھی تھی تاکہ یہ لوگ نہا[illegible] کے لباس میں بھی اپنے کمروں سے نکل کر لفٹ کے ذریعے براہِ راست سوئمنگ پول پ[illegible] سکیں اور انہیں لابی اور ریستوران سے نہ گزرنا پڑے۔

ایک لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے ریستوران کا رخ کیا اور ریستوران سے گزرتا [illegible] میں سوئمنگ پول کے احاطے میں جا پہنچا۔ پول اس وقت بالکل ویران پڑا ہوا تھا کیونکہ [illegible] گرمی اور سخت دھوپ تھی۔ اس لئے نہانے والے بھی ابھی اپنے کمروں کے عافیت بخ[illegible] سائے میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ میں باہر آیا تو دھوپ کی چمک سے آنکھیں چکا چ[illegible] ہونے لگیں۔ پول کے آس پاس رنگ برنگی چھتریاں مختلف زاویوں سے نصب تھیں۔ م[illegible] نے سوچا کسی چھتری کے سائے میں بیٹھ کر چھپ جاؤں اور دیکھوں کہ یہ کریم خان آ[illegible]

یہاں کیا کرنے آیا ہے۔ اس وقت میں قمیض ٹائی اور پتلون میں تھا اور ظاہر ہے پول کے پاس چھتری کے کنارے اس لباس میں بیٹھنا بہت عجیب لگتا تھا۔ میں نے ابھی تک کریم خان کو زمین دوز راستے سے نکل کر آتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پول کے استقبالیہ سے نہانے کا لباس لے رہا ہوگا۔ میں ریستوران کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ یہ بڑے موقع کی جگہ تھی اور یہاں سے پورا سوئمنگ پول بھی نظر آتا تھا اور زمین دوز راستے کی نگرانی بھی ہو سکتی تھی۔

اچانک ہی مجھے اس تمام بھاگ دوڑ میں بڑا لطف آنے لگا تھا۔ کم از کم پتہ تو چلے کہ اس عورت نے کیا کیا کھیل، کھیل رکھے ہیں۔ کتنی حیرانی کی بات تھی۔ ایک نگاہ میں انسانوں کو متاثر کر کے انہیں اپنا دیوانہ بنا لینے والی اس عورت کے اندر جسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ بہت ہی معصوم فطرت اور شریف سی بچی ہے، اتنے چھل فریب بھرے ہوئے تھے کہ تجربے کار سے تجربے کار انسان بھی اس کا جائزہ نہ لے سکے۔ اب تک میرا خیال یہی تھا کہ جیت سنگھ جو ایک لمبا تڑنگا آدمی ہے اور اگر اس کے چہرے اور اس کی حیثیت کو نظرانداز کر دیا جائے تو مرد پسند عورتوں کے لئے وہ ایک پُرکشش شخصیت کا مالک ثابت ہو سکتا ہے خاص طور سے ایسی کسی عورت کے لئے جس کا شوہر اس کی عمر سے تین گنا زیادہ ہو۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ لیکن ایک نوعمر لڑکی پہلی بار میں نے غور کیا کہ عالیہ زمان کی عمر کیا ہو سکتی ہے اور اس بات میں کوئی شبہ نہ پایا کہ بہرحال وہ مکمل طور سے نوخیزیت کی منزل میں ہے۔

پول کے احاطے میں میرے دائیں ہاتھ پر لباس تبدیل کرنے کے دس چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے تھے۔ بالکل اتفاق تھا کہ ابھی میری نظر اس وقت انہی کیبنوں کی جانب تھی کہ میں نے زمین دوز راستے کی سیڑھیوں سے عالیہ زمان کو دیکھا جو سیڑھیاں طے کر کے پول پر آئی اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر لباس تبدیل کرنے کے کیبنوں کی جانب بڑھ گئی۔ اس کے بازو پر سوئمنگ کا لباس پڑا ہوا تھا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ رکی اور اس نے کیبنوں کی قطار پر نظر ڈالی، جیسے وہ کسی مخصوص کیبن میں جانا چاہتی ہو۔ پھر پانچویں کیبن کا دروازہ کھول کر وہ اندر چلی گئی۔ میں دروازے کی آڑ میں کھڑا ہوا یہ انتظار کرنے لگا کہ اب کیا ہوتا ہے۔ لیکن مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ عالیہ کو کیبن میں گئے ابھی دو منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ زمین دوز راستے سے ویسا ہی

تیرنے والا لباس پہنے ہوئے کریم خان برآمد ہوا۔ دوپہر کی چمکیلی دھوپ میں اس کا ت جیسا بدن چمک رہا تھا اور پہلی بار اسے وردی سے بے نیاز دیکھ کر مجھے یہ احساس ہو کتنا شاندار اور فولادی جوان ہے۔ چلتے ہوئے اس کے بازوؤں اور رانوں کی مچھ تڑپ رہی تھیں۔ کاندھے پر تولیہ ڈالے وہ بڑی بے نیازی سے پول کے کنارے کنا چلتا ہوا کیبنوں کی طرف بڑھا اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اس پانچویں کیبن میں داخل جس میں تھوڑی دیر پہلے عالیہ زمان گئی تھی۔ میرے پورے بدن میں شدید اینٹھن ہو لگی۔ گویا میرا اندازہ بالکل درست ہے۔ بظاہر بھولی بھالی شکل کی نظر آنے والی یہ بد عورت، اب میں اسے لڑکی نہیں کہہ سکتا تھا، یہ کھیل، کھیل رہی ہے اور بوڑھا بیو صرف اپنے کاروبار کر رہا ہے۔

میں ایک لمحے تک سوچتا رہا۔ فیصلہ کر رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اگر مو ان دونوں کو جا پکڑوں اور ہنگامہ کھڑا کر دوں تو اس سے مجھے کیا حاصل ہوگا۔ بہرطور میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں رقابت کی آگ میں جل رہا تھا اور اس سے پہلے اس آ کا کوئی تصور میرے ذہن میں نہیں تھا۔ میں ان تمام خرافات سے بچا ہوا تھا۔ لیکن لو ہوسیوک سندھورتی اور وردان سادھانی پر جنہوں نے مجھے برائیوں کے راستے پر لگا دیا اور اب برائی یوں لگتا تھا جیسے میرے وجود میں بس گئی ہوں۔

میں تھوڑی دیر تک وہاں کھڑا رہا اور پھر چونک پڑا۔ کیونکہ کریم خان باہر نکلا تھا اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ وہ تولیے سے اپنا بدن صاف ک ہوا زمین دوز راستے میں غائب ہو گیا جبکہ عالیہ ابھی تک کیبن سے باہر نہیں آئی تھی۔ ا میرے لئے ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ میں پانچ نمبر کیبن کے دروازے پر پہنچا اور پلائی کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر میں نے دھکا دیا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ میں پلک جھپکتے کیبن کے اندر داخل ہو گیا۔ جس تیزی سے میں داخل ہوا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا تھا۔ یع میں عالیہ سے ٹکرا گیا۔ میں نے اسے جس عالم میں دیکھا اسے دیکھ کر خود میری پلکیں جھپک گئیں۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی اور سامنے کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ دوسرے اس نے دبی ہوئی چیخ ماری اور سر گھما کر میری طرف دیکھا پھر اس کے حلق سے آواز نکلی

''گیٹ آؤٹ...... گیٹ آؤٹ یو باسٹرڈ۔'' اس کی آواز شدید غصے سے کانپ رہ تھی۔ میں تو اس وقت دوسری کیفیت کا شکار تھا۔ میں اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

دوسرے لمحے اس نے مجھے پہچان لیا۔ اس کا رنگ دہشت سے فق ہو گیا۔

''نکلو...... نکلو یہاں سے...... کمینے، غنڈے، حرام زادے۔ میں شور مچا دوں گی۔''

''تم جانتی ہو تم شور نہیں مچاؤ گی عالیہ زمان! اس لئے کہ ابھی تو تمہارے عاشق نے لباس بھی نہیں تبدیل کیا ہوگا۔''

''میں کہہ رہی ہوں کیا بکواس کر رہے ہو؟ نکلو یہاں سے۔'' اس کی آواز پھسپھسی تھی۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کے سنہرے بدن کو لرزتے ہوئے دیکھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت خود میری ذہنی حالت بے انتہا خراب ہو رہی تھی۔ وہ اس قدر خوبصورت تھی کہ اس کے حسین جسم کی تفصیل بیان نہیں کی جا سکتی۔ بے داغ گندم کے پکے ہوئے خوشے کی طرح موسموں کی خوشبو میں بسا ہوا یہ سنگ مرمر کا جسم، یقین نہیں آتا تھا کہ کسی انسان کا جسم ہو سکتا ہے۔ مجھے اس طرح گھورتے دیکھ کر وہ شرم اور غصے سے سرخ ہو گئی اور خود کو چھپانے کی ناکام کوشش میں چھوئی موئی کی طرح سمٹ کر بیٹھ گئی۔ پھر میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھے۔ اب اس کے انداز میں نمایاں تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

''خاقان! خدا کے لئے چلے جاؤ۔ کوئی آ جائے گا۔''

''یہ لو......'' میں نے کیبن کی کھونٹی پر ٹنگا بڑا تولیہ اتار کر اسے دیتے ہوئے کہا اور اس نے جلدی سے تولیہ اپنے بدن پر لپیٹ لیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

''مسز آدم زمان! میں تو اس وقت صرف ایک بات پوچھنے آیا تھا آپ سے۔''

''چلے جاؤ اس وقت۔ خدا کے واسطے چلے جاؤ۔ کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟''

''کمال کرتی ہو۔ تھوڑی دیر پہلے بھی تو کوئی دیکھ سکتا تھا جیسے میں نے تم کو دیکھ لیا۔''

''جاؤ، پلیز جاؤ'' اس نے ایک ہاتھ سے مجھے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

اس کے انداز میں لجاجت تھی۔ وہ سخت دکھی نظر آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

''میں بعد میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گی۔ ابھی چلے جاؤ۔ خدا کے لئے......'' وہ بدستور گڑگڑا رہی تھی۔ لیکن میں اس کی اداکاری سے متاثر نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔

''ہاں تو عالیہ! میں صرف یہ پوچھنے آیا تھا کہ آدم زمان نے اگر پوچھ لیا کہ اس کیبن میں کریم خان آیا تھا یا جیت سنگھ تو مجھے کیا کہنا چاہئے؟''

''کمینے، کتے! تم بلیک میلر اور بے غیرت ہو۔'' اس نے الٹے ہاتھ سے بھرپور طمانچہ

مارا جسے میں نے اپنے بازو پر روکا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیا۔ وہ تکلیف سے دُہری ہو گئی تو میں نے بڑے پیار سے کہا۔

”نہیں ڈارلنگ! نہ میں کمینہ ہوں نہ بے غیرت۔ ہاں بلیک میلر ضرور ہوں۔ تم اگر مجھے کتا کہنا بھی چاہتی ہو تو کہو، لیکن اعلیٰ نسل کا۔ اور ایک بات اور سنو، جھوٹے برتنوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ میں تم سے صرف اپنے سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ خیر کوئی بات نہیں، یہ بھی پھر سہی۔“

عالیہ نے مجھے نگاہیں بھر کر یوں دیکھا جیسے وہ مجھے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے پہلی بار میری شخصیت پر غور کیا ہو۔ اب تک میں ایک ایسے ضدی آدمی کا رول کر رہا تھا جو اس پر بری طرح ریجھ گیا ہو اور ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتا ہو۔ وہ اس کی بدتمیزی برداشت کر رہا ہو اور ڈھٹائی کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کئے جا رہا ہو۔ مگر اس واقعے کے بعد اس کا نظریہ تبدیل ہوا اور اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ میں اس کا کوئی نیاز مند عاشق نہیں ہوں اور نہ ہی اس سے پہلے تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہی ہو گی کہ میں اس کے تلخ جملے بھی ہنس کر ٹال جاتا تھا حالانکہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس وقت وہ بری طرح میرے شکنجے میں ہے۔ لیکن ابھی جو چند لمحے گزرے تھے اس میں یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان آئندہ کیا تعلقات ہوں گے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اس کی اداکاری سے متاثر ہونے والا نہیں ہوں۔ وہ غصہ بھی کر کے دیکھ چکی تھی اور اس کی منت وسماجت بھی کام نہیں آئی تھی۔ سارے ہتھیار آزما چکی تھی وہ۔ اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ میرے سامنے نرم ہو جائے اور سیدھی سیدھی باتیں کرے۔ اب تک وہ ایک آزاد خیال لیکن وفادار بیوی کے رُوپ میں آئی تھی۔ ایسی بیوی جو اپنے شوہر کے ساتھ وفادار ہو اور اس کی امانتوں کی حفاظت کرتی ہو اور اسے ہر نقصان سے بچانا چاہتی ہو۔ مگر یہ بھرم ٹوٹ چکا تھا۔ وہ جہاں تھی اور اس وقت جس حال میں، میں نے اسے پکڑا تھا اس سے اس کی شخصیت کا بھرم کھل جاتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، مس عالیہ! ہمیں سیدھا سیدھا کھیل کھیلنا چاہئے۔ کم از کم اب تمہیں اس بات کا اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں تمہارے بارے میں سمجھ چکا ہوں۔ کیا سمجھیں؟ بات وہی آ جاتی ہے۔ میں تم سے اپنے کچھ سوالات کے جواب چاہتا ہوں۔“

”دیکھو میں تمہارے ہر سوال کا جواب دے دوں گی۔ مگر اس وقت تم یہاں سے جاؤ۔“

میں نے ایک نگاہ اسے دیکھا اور اس کے بعد ایک جھٹکے سے پلٹ کر کیبن سے باہر نکل گیا۔ میری نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پول اسی طرح ویران تھا۔ ریستوران سے گزرتا ہوا میں لابی میں پہنچا اور اپنے کمرے کی پُرسکون تنہائی تک پہنچنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ لیکن ایک عجیب سی بے کلی اور بے چینی میرے سارے وجود میں تھی۔ یہ آخر کیا ہو رہا ہے؟ ایلس فیوری کے واقعے کے بعد پہلی بار مجھے اپنے آپ سے گھن آ رہی تھی۔ اگر وردان سادھانی نے میرے لئے یہ پیش گوئی نہ کی ہوتی کہ مجھے کس قسم کی روحانی بادشاہت ملنے والی ہے، اگر لنکا کے ان منحوس پہاڑوں میں مجھے یہ وہم نہ ہوا ہوتا کہ میں بعض غیر معمولی قوتوں کا مالک ہوں، اگر سینکڑوں بھکشوؤں نے مجھے عقیدت اور محبت سے سجدے نہ کئے ہوتے تو میں یہ سمجھتا کہ میں بیسویں صدی کا ایک عام سا نوجوان ہوں۔ مالدار گھرانے کا بگڑا ہوا نوجوان جس نے اپنے باپ کی عیاشیاں دیکھی تھیں۔ میرے باپ مرحوم جن کے بارے میں بہت سی باتیں سوچتے ہوئے مجھے شرم آتی تھی، جو بہت سی بیویوں کے شوہر تھے۔ اگر انہی کے نقش قدم پر چل رہا ہوں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ واقعی ایک عام آدمی کی حیثیت سے مجھے اپنے باپ ہی کے نقش قدم پر چلنا چاہئے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ باپ پر پوت، پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ بے شک میں تھوڑا تھوڑا تھا لیکن تھا پتا پر۔ البتہ ایک بات میں اپنی ذات سے منسلک پاتا تھا وہ یہ کہ ایلس فیوری کے واقعے تک میں نے اپنے آپ کو بچا بچا کر رکھا تھا حالانکہ بہت سی حسین مورتیاں میرے اردگرد چکراتی تھیں لیکن اس وقت میرا نظریہ زندگی بالکل مختلف تھا۔ ہو سکتا ہے اس وقت میرے ذہن میں بدھی ستو کی وہ مقدس تصویر بھی موجود ہو جو شِو جی کے مندر میں دیو استھان پر مجھے نظر آئی تھی۔ یہ تصویر جو سیوک سندھورتی اور وردان سادھانی نے کہیں برسوں میں جا کر بنائی تھی۔ میں نے کتنی ہی بار رات کی تنہائیوں میں خود سے یہ عہد کیا تھا کہ میں گناہوں سے دور رہوں گا۔ اس لئے کہ مقدس ہوں۔ لیکن اب میں ایک مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ایلس فیوری نے تو زاویہ ہی بگاڑ دیا تھا۔ وہیں سے مجھے اس لذت سے آشنائی ہوئی تھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ یہ تھا انہی منحوس اشبھ بھاوناؤں کا ورثہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عالیہ زمان بہت خوبصورت لڑکی تھی اور آوارہ مزاج لیکن کیا میرے مقدر میں یہی لکھا ہے کہ دنیا کی تمام خوبصورت اور آوارہ لڑکیوں کے مارا مارا پھرتا رہوں جس طرح سے چند دنوں سے اس عورت کے پیچھے خوار ہو رہا ہوں میں نے اپنے اعمال کا جائزہ لیا تو مجھے احساس ہوا کہ کس طرح ایک نیک نفس ا برائیوں کے ہاتھوں بھٹک جاتا ہے۔ میں ابھی تک اس درجے پر نہیں پہنچا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت عالیہ زمان میرے لئے ناقابل حصول نہیں تھی جب میں خان کے فوراً بعد کیبن میں اس کے پاس پہنچا تھا۔ ویسے ایک بات کا مجھے اندازہ تھا میرے پاس ضرور آئے گی۔ کیونکہ مکھی جالے میں پھنس چکی ہے۔ وہ یقینی طور پر اپنے کو راز رکھنے کے لئے سب کچھ لٹا دے گی اور اس کے بعد...... اس کے بعد اچانک میرے ذہن میں ایک اور تصور آیا۔ کیا مجھے اتنا زیادہ گر جانا چاہئے؟ مناسب تو نہیں یہ۔ پھر کیا کروں، کیسے اپنے ذہن کو اپنے قابو میں کروں؟ اتنا کمزور ہوں میں، اتنا اور کم ہمت ہوں کہ ایک عورت سے بچنے کے لئے بھاگا بھاگا پھروں۔ نہیں، اپنے کردا خود سنبھالنا ہوگا۔

آخر کار میں نے طے کر لیا کہ یہ رات میں ہوٹل میں ہی گزاروں گا۔ کہیں جا کہیں بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ تو میرے اپنے ہاتھ کی با ہے۔ ٹھکرا دوں گا اگر وہ آئے گی میرے پاس۔ یہ تمام باتیں سوچ کر بالکل ٹھکرا دو اسے۔ اگر مجھ سے ایک گناہ سرزد ہوا ہے تو اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ اب غلاظت میں ہی دوڑ لگاتا رہوں۔ ان لوگوں سے تعلق رکھنے کی وجہ بھی صرف عالیہ ز ہی تھی۔ میں اب ان سے ملنا جلنا بھی کم کر دوں گا۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ وردان سادھانی اور سیوک سندھورتی نے مجھے کا نہیں چھوڑا تھا۔ بھوج پتر کی تمام تصویریں اور جو جو ہو چکا تھا سب کچھ ایک برا خواب کی مانند میرے وجود میں بسا ہوا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ ان کے حساب سے میں کا بدھ اور قابل احترام ہستی ہوں۔ لیکن میں اب تک اپنے آپ کو کسی احمقانہ حیثیت تسلیم نہیں کر سکا تھا۔ کچھ بھی ہے، بہر صورت میں ایک نیک ماں کا بیٹا ضرور ہوں۔ لکھا آدمی ہوں۔ اپنے برے بھلے کو خوب سمجھتا ہوں۔ یہ زندگی بڑی طویل ہے۔ سے اپنے آپ کو توہمات کے حوالے کر دینا تو بڑی حماقت ہے۔ جو ہو چکا ہے اس

انحراف کرنا چاہئے۔ ابھی تو میرے سفر کی ابتدا ہے۔ میں نے اگر ابھی سے اپنے آپ کو غلط راستوں پر ڈال دیا تو آگے چل کر میں پورا شیطان بن جاؤں گا۔

نجانے کتنی دیر یہی تمام باتیں سوچتا رہا اور پھر بستر پر نیند آ گئی۔ نجانے کب تک میں گہری نیند سوتا رہا کہ اچانک میرے کانوں میں ٹرن ٹرن ٹرن کی منحوس آواز ابھرنے لگی۔ میں نے بے چینی سے گردن اِدھر اُدھر پٹخی اور آہستہ آہستہ اندازہ ہوا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ میں نے کاہلی سے آنکھیں کھول کر دیکھا، کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ آٹھ بج رہے ہیں۔ میں نے کاہلی کے انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کر پہلے لیمپ جلایا اور پھر فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے معمول کے مطابق آدم زمان کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو...... کیا ہو گیا، خیریت سے تو ہو؟"

"کون؟"

"ارے میری جان، میری زندگی، تمہارے بغیر تو اب زندگی ادھوری محسوس ہوتی ہے۔ آ جاؤ، انتظار کر رہا ہوں۔"

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ انکار کر دوں لیکن پھر خود ہی اپنے اس خیال کی تردید کر دی اگر میں اس وقت وہاں نہیں جاتا تو ممکن ہے عالیہ اس کا غلط مطلب نکالے۔ وہ یہ سمجھے گی کہ شاید میں اپنے مطالبے پر زور دینے کے لئے اتنا کچھ کر رہا ہوں۔ اور اگر میں اس وقت چلا جاؤں اور اپنے رویے سے یا ایک آدھ فقرے سے یہ ظاہر کر دوں کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ میرے کمرے پر ہی نہ آئے اور میں بہت سی الجھنوں سے بچ جاؤں۔"

"کیا ہوا بھئی...... کیا کر رہے ہو؟"

"نہیں، کچھ نہیں۔ میں ابھی آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔"

"میں انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

میں تھکے تھکے انداز میں اٹھا اور غسل خانے میں گیا۔ شیو وغیرہ کیا اور نجانے کیوں میرے دل میں خیال آیا کہ میں اپنا بہترین لباس زیب تن کروں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ عمدہ سا سوٹ پہن کر میں آدم زمان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ کوریڈور میں کریم خان تازہ استری کیا ہوا سوٹ پہنے ٹہل رہا تھا اور اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان اور آنکھوں میں

چمک تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے بہت ادب سے سلام کیا۔ یہ غیر معمولی بات تھی۔ عام طور پر تو وہ اِدھر اُدھر ہو جایا کرتا تھا۔

اندر داخل ہوا تو آدم زمان کو بہت خوش پایا۔ وہ اور عالیہ ایک ہی صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے اور آدم زمان نے بڑی محبت سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا ہوا تھا۔ مجھے بڑا لطف آیا اور یہی احساس میں نے عالیہ کے چہرے پر دیکھا۔ وہ محبت کو دست شفقت محسوس کر رہی تھی۔ ویسے اس وقت وہ بہت حسین نظر آ رہی تھی۔ کمبخت نے قیامت ڈھا رکھی تھی۔ گہرے نیلے رنگ کا گاؤن اور اس کے بعد خوبصورت ترین میک اپ۔

میں کمرے میں داخل ہوا۔ آدم زمان نے پہلے سے زیادہ گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ عالیہ بھی شریک تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ تروتازگی میں بے مثال تھی۔ دوپہر کے واقعہ سے وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں تھی بلکہ اس کے انداز میں بڑی بے باکی تھی۔ میں بیٹھ گیا تو آدم زمان نے اپنی دن بھر کی مصروفیات کی داستان سنانا شروع کر دی کہ کس طرح وہ ایک گودام سے دوسرے گودام اور ایک دفتر سے دوسرے دفتر گیا۔ یہاں کا کام پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہاں سے ٹیلی فون آ گیا۔ اس نے جیت سنگھ کو وہاں دیکھ بھال کے لئے بھیج دیا اور خود تیسری جگہ چلا گیا۔ یہ ساری باتیں وہ سنائے جا رہا تھا۔ کریم خان کا ذکر بھی کئی بار آیا اور اس ذکر پر میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی عالیہ کی طرف دیکھا۔ وہ مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ پُرسکون بیٹھی ہوئی تھی۔

دفعتہً ہی میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ ادھر آدم زمان مزے سے صوفے پر پڑا اپنی نام نہاد بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈالے بولے جا رہا تھا۔ میں جب ایک دم کھڑا ہوا تو اس کی باتوں کو بریک سا لگا۔ وہ بولا۔

”کیوں خیریت، کیا بات ہے؟ کیوں اٹھ گئے؟ اصل میں، میں اور عالیہ پروگرام بنا رہے تھے کہ سمندر پر چلیں گے۔ آج پورن ماشی ہے، آسمان پر پورا چاند نکلا ہو گا۔ سمندر کے کنارے ذرا مزا رہے گا۔“

”وہ بس کچھ نہیں۔ اصل میں، میں نے کھانا نہیں کھایا۔“ اس وقت نجانے کیوں اتنی احمقانہ بات میرے منہ سے نکلی تھی۔ اصل میں، میں اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ عالیہ زمان کا اس وقت کا حسن دیکھ کر، اس کے بدن کی دلکشی اور لطافت دیکھ کر میرے ہوش و حواس

گم ہوئے جا رہے تھے۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنا چاہتا تھا۔

”تو پھر کھڑے ہو جانے کی کیا ضرورت ہے۔ کھانا منگوائے لیتے ہیں۔ یہیں ساتھ مل کر کھائیں گے۔“

میں نے ایک گہری سانس لی۔ بہانہ بھی ایسا بے تکا کیا تھا کہ اس کے نتیجے میں یہی کچھ ہونا چاہئے تھا۔ بہت ہی پُرتکلف کھانا آ گیا اور کھانے کے دوران عالیہ زمان غیر معمولی طور پر میری مدارات کرتی رہی۔ آدم زمان اس وقت اپنی بیوی کی محبت میں گم تھا۔ اس وقت کی خاص ڈش مچھلی کے تلے ہوئے کباب تھے جو آلو کے ٹکڑوں کے ساتھ مزا دے رہے تھے۔ ان میں آدم زمان کو یہ سہولت تھی کہ وہ آسانی سے انہیں چبا کر کھا سکتا تھا۔ محبت میں سرشار ہو کر اس نے اپنی پلیٹ سے کباب کا ایک ٹکڑا اپنے کانٹے میں لیا اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس پر ٹماٹر کی چٹنی لگا کر عالیہ کو اپنے ہاتھ سے کھلا دیا۔ عالیہ اس کھیل میں برابر کی شریک تھی۔ تب ایک آدھ لقمہ وہ بھی اپنے بڈھے کو کھلا دیتی۔ اور کبھی وہ دونوں بچوں کی طرح ایک دوسرے سے چھین جھپٹ کرنے لگتے۔ یہ بڑا مضحکہ خیز منظر تھا۔ کھانے کے دوران میاں بیوی نئے شادی شدہ جوڑے کی مانند چہلیں کرتے رہے۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ کاش یہ دونوں ہی جوان ہوتے یا پھر دونوں بوڑھے ہوتے تو اس منظر میں کتنی پاکیزگی اور معصومیت آ جاتی۔

کھانے کے بعد ہم ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ اب میں نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ باہر آدم زمان کی چوڑی چکلی ڈارٹ کھڑی تھی۔ جس میں بیٹھ کر ہم جوہو چل پڑے۔ اس وقت ڈارٹ جیت سنگھ چلا رہا تھا اور ہم تینوں پچھلی سیٹ پر اس طرح بیٹھے تھے کہ عالیہ درمیان میں تھی۔ بظاہر وہ اپنے شوہر کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی مگر بار بار اس کی پنڈلی میری پنڈلیوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور لاپرواہی سے باہر کی روشنیاں دیکھتا رہا۔ آدم زمان کی قیمتی کار گیلی ریت پر دور تک دوڑتی رہی۔ جوہو پر بہت ہی خوبصورت سماں تھا۔ پورے چاند کی یہ رات بڑی پُرکیف تھی۔ اور آدم زمان تو جیسے بھرپور نشے میں تھا۔ ویسے کھانے کے دوران اس نے ہلکی پھلکی شراب بھی پی تھی۔

عالیہ زمان نے بڑے میاں کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں ہاتھ میں ہاتھ لئے ساحل سمندر پر دور تک چلے گئے۔ میں وہیں رک گیا تھا۔ لیکن جب وہ واپس آئے تو آدم زمان کی

سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ چاندنی میں گاڑی کی طرف آتے ہوئے وہ دونوں مجھے یوں لگے جیسے کوئی خدا ترس لڑکی کسی اندھے کو سڑک پار کرا رہی ہو۔ ادھر جیت سنگھ نے ریت پر چادر بچھا دی تھی۔ آدم زمان چادر پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ عالیہ بچوں کی طرح ہنس رہی تھی۔ آدم زمان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ جب وہ دونوں یہاں بیٹھ کر رنگ رلیاں منانے لگے تو میں ساحل پر ٹہلنے کے ارادے سے وہاں سے دور چلا گیا اور کافی دور نکل گیا۔ جب خاصی دیر کے بعد میں لوٹا تو میں نے دیکھا کہ زمان، عالیہ کے کاندھے ہاتھ رکھے اپنی بجھی ہوئی آنکھوں سے چاند کو تکے جا رہا تھا۔ یہ رومانی منظر ابھی تک جاری تھا۔ مجھے الجھن ہونے لگی۔ آدم زمان کی گدی پر اُگی ہوئی سفید جھالر میں عالیہ انگلیاں دوڑانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ آدم زمان نے اس کا ہاتھ کھینچ کر چوم لیا اور عالیہ کھنکتی ہنسی فضا میں گونجنے لگی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آدم زمان جیسا سنجیدہ آدمی اس وقت یہ تماشا مجھے کیوں دکھا رہا ہے؟ ممکن ہے کسی تیسرے فرد کی موجودگی میں وہ اپنی نوجوان بیوی کی طرف رجوع ہو کر اپنے اندر کے انسان کو سکون دے رہا ہو۔ اس کی عمر اس کے ساتھ عجیب کھیل کھیل رہی تھی۔

تقریباً کوئی ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ آدم زمان کو بتائے بغیر ہوٹل چلا جاؤں۔ کوئی ٹیکسی تو مل ہی جائے گی۔ میں اس انوکھے رومانی جوڑے سے دور ٹہلتا ہوا آم کے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف نکل گیا۔ یہاں کا منظر اس قدر خوبصورت تھا کہ میں ایک درخت سے ٹک کر چاند اور سمندر کو دیکھنے لگا۔ مگر یہاں بھی مجھے تنہائی نصیب نہ ہو سکی۔ کچھ ہی لمحوں بعد میری نگاہیں اپنے بائیں طرف اٹھی تھیں۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک جوڑا چاندنی میں چمکتی ریت پر پڑا اینٹھ رہا تھا۔ یہ اپنے آپ میں اس قدر گم تھے کہ میں ان کے اوپر پیر رکھ کر بھی گزر جاتا تو انہیں خبر نہ ہوتی۔ جھنجھلاہٹ میں، میں نے ریت پر ٹھوکر ماری۔ بہت سی ریت اُڑ کر مرد کی برہنہ پیٹھ پر گری۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا، پھر اسی طرح عورت کے بالوں میں منہ چھپا کر سرگوشیاں کرنے لگا۔ میری کنپٹیوں پر خون ٹھوکریں مار رہا تھا۔ بہرحال میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ یہ میرے لئے کتنے عذاب بچھائے جا رہے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنے اندر چھپے ہوئے اس حیوان کو جس نے اشبھ بھاؤناؤں کے بعد میری جڑیں تک ہلا کر رکھ دی تھیں، آج

رات قابو میں کر لوں گا۔ مگر آدم زمان اور عالیہ زمان اور وہ نامعلوم جوڑا جو ریت پر گڈمڈ ہو رہا تھا اور اس بھرے پرے شہر کے ہزاروں نیم روشن کمروں میں ہزاروں جوڑے جو اس وقت خواہش کی بھٹیوں میں سلگ رہے ہوں گے اور جن کے دھواں دیتے ہوئے بدن آسودگی کی آخری حدوں میں پہنچنے کے لئے پسینہ پسینہ ہوں گے، یہ سارے کے سارے میرے ہی خلاف سازش تو کر رہے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ میں تنہا ہوں اور اس وقت خود سے لڑ رہا ہوں۔ انہیں معلوم ہے کہ آج رات عالیہ زمان میرے کمرے میں آئے گی۔ انہیں معلوم تھا کہ میں اسے دروازے سے ہی لوٹا دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ میرے اچھے ارادوں کو، میرے مضبوط حصاروں کو ریزہ ریزہ کر دینا چاہتے ہیں اور عالیہ ان میں سب سے آگے ہے۔

شاید میں جذباتی ہو رہا ہوں اور جذباتی ہونے کے ساتھ میرے الفاظ عجیب وغریب شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس وقت کوئی اور میرے جسم کو کھول کر دیکھتا تو میرے مسامات سے ہلکا ہلکا دھواں نکلتا ہوا نظر آ جاتا۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا بے دھیانی میں ایک بار پھر واپس پلٹا اور آدم زمان تک پہنچ گیا۔ آدم زمان نے شاید مجھے دیکھا تھا یا نہیں دیکھا، اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ لیکن وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے عالیہ زمان کا سمٹا ہوا گاؤن ٹھیک کر رہا تھا اور وہ ہنس ہنس کر اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ آواز بھی کمبخت کی بڑی دلکش تھی۔

میں ایک جھٹکے سے اس کی گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ میں اس کمبخت کے ساتھ جہنم کی یہ رات گزاروں گا۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد جب یہ میرے دروازے پر دستک دے گی تو میں اسے بالوں سے گھسیٹتا ہوا اپنے بستر پر لے جاؤں گا اور پنی ہزار ہیجان انگیز راتوں کی آگ میں اسے جھلسا کر راکھ کر دوں گا، اسے پارہ پارہ کر دوں گا۔ پھر جب یہ مویشیوں سے روندی ہوئی فصل کی طرح پڑی ہو گی اور چھت کے پنکھے کو خالی خالی آنکھوں سے تک رہی ہو گی تو میں پوچھوں گا کہ بتا، کبھی کریم خان تجھے یا تیرے دوسرے عاشقوں میں جن میں جیت سنگھ یا اور جو کوئی بھی ہو وہ تجھے اس حد تک لے جا سکتا ہے؟ بول کبھی جیت سنگھ...... جیت سنگھ...... یہ الفاظ میرے منہ سے شاید زور سے نکل گئے تھے۔ کیونکہ دوسرے لمحے جیت سنگھ گاڑی کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گیا۔

"یس سر!" اس نے باادب لہجے میں گردن جھکاتے ہوئے کہا اور میں ایک دم چونک

پڑا۔ مجھے احساس ہوا کہ کیا حماقتیں کر رہا ہوں میں۔ چنانچہ میں نے فوراً اپنے
قابو پایا اور مدھم لہجے میں بولا۔

"جیت سنگھ! کیا یہاں ٹیکسی مل جائے گی؟"

"ٹیکسی سر؟" جیت سنگھ کو اس بات پر حیرت ہوئی تھی۔ اس نے اپنی کلائی کی
اپنی آنکھوں سے لگا کر اس پر دوسرے ہاتھ سے دور بین سی بنائی اور دور بین سے جھ
ہوئے گھڑی کے ڈائل پر وقت دیکھا پھر بولا۔ "سر! پونے گیارہ بجے ہیں۔ اس وق
ٹیکسی ملنا مشکل ہے۔" پھر کچھ تحمل کے بعد وہ دھیرے سے بولا۔

"سر، سیٹھ کو گیارہ بجے ہوٹل واپس پہنچنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ چلنے وال
ہوں گے۔ لیجئے، وہ آ رہے ہیں۔" اس نے اشارہ کیا اور میری گردن گھوم گئی۔ میں
دیکھا کہ عالیہ زمان گاڑی کی طرف آ رہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں وہ چادر تھی جو
سنگھ نے ریت پر بچھائی تھی۔ چاند کی روشنی میں عالیہ مسکراتی ہوئی میرے قریب آئی
آہستہ سے بولی۔

"میں آؤں گی۔ مگر دیر سے۔" پھر وہ مڑی اور بدمست شرابی کی طرح لڑکھڑاتی
اپنے بڈھے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور ٹھنک کر بولی۔

"آؤ نا آدم! نیند آ رہی ہے۔"

اس کے انداز میں بڑی عجیب سی کیفیت تھی۔ پتہ نہیں وہ مجھے رجھا رہی تھی یا
بوڑھے شوہر کو۔ واپسی بھی بڑی عجیب تھی۔ دونوں ہی بدمستیاں کرتے رہے تھے۔
جان بوجھ کر جیت سنگھ کے برابر بیٹھا تھا اور اس پر انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں
تھی۔ میں جانتا تھا کہ عالیہ تو صرف اداکاری کر رہی ہے، اس گدھے کو بالکل ہی
پٹھا بنا رہی ہے۔ مگر وہ اُلو کا پٹھا اپنے آپ میں کیوں نہیں ہے؟ آخر بہرحال یہ ط
رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ دیکھو اس کے علاوہ میرے ا
گزرتی ہے۔

***

عارضی طور پر یہ مشکل لمحات ٹل گئے تھے۔ اس وقت عالیہ اور آدم زمان کی کیفیت تو جو کچھ بھی ہو گی لیکن مجھ پر جو بیت رہی تھی میں جانتا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے پاؤں زمین سے کئی فٹ اوپر اٹھے ہوئے ہیں۔ میرا سارا وجود بے وزن ہو گیا ہے۔ اسی بے وزنی کے عالم میں، میں نے کمرے میں پہنچ کر کپڑے اچھالے اور ایک طرف پھینک دیئے۔ پھر لائٹ آن کئے بغیر بستر میں لیٹ گیا۔ درد کے مارے سر پھٹ رہا تھا۔ کنپٹیوں پر جیسے ہتھوڑے برس رہے تھے۔ کافی دیر تک میں اسی طرح بے سدھ پڑا رہا۔ جب سر کے درد میں کوئی کمی نہ ہوئی تو لیمپ جلا کر میز کی دراز سے درد کی گولیاں نکالیں اور دو گلاس پانی سے یہ گولیاں نگل کر شب خوابی کا لباس پہنے بغیر صرف انڈرویئر اور بنیان میں بستر پر جا لیٹا اور لیمپ بجھا دیا۔ سونے سے پہلے مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں کیا۔ پھر وہ شاید تھرماس ٹوٹنے کا دھماکہ تھا جس سے میری آنکھ کھلی۔ میں نے جھپٹ کر سرہانے کا ٹیبل لیمپ جلایا تو مجھے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"لائٹ بجھا دو بے وقوف!"

میں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تو وہ میز کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے سلیپنگ گاؤن کے کالر بند کر رکھے تھے اور دوسرے ہاتھ سے اپنی آنکھوں پر سایہ کر لیا تھا۔ میں نے دروازے پر نگاہ ڈالی تو نظر آیا کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔ میں نے لیمپ بجھانے سے پہلے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے بال بے ترتیب تھے اور آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ اندھیرے میں، میں نے کپڑوں کی سرسراہٹ کی۔ وہ شاید گاؤن اتار رہی تھی۔

پھر وہ بستر پر آ بیٹھی اور میرا پورا بدن تپنے لگا۔ لیکن جب میرے ہاتھ تاریکی میں رینگے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ سنگ مرمر کی چٹانوں پر پھسل رہے ہیں۔ وہ آگے بڑھ

کر میرے بستر میں گھس گئی تھی۔ پھر اس نے مدھم سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

''بڑے عجیب آدمی ہو تم۔ بہت ہی عجیب آدمی ہو۔ دوپہر میں تو تمہاری زبان خوب چل رہی تھی۔ اب سانپ کیوں سونگھ گیا ہے؟ میں کہتی ہوں کچھ منہ سے پھوٹو۔ اب کہو بڑی بڑی باتیں اس وقت کر رہے تھے۔ بولو گے نہیں؟''

میرے ہوش و حواس پر تو بجلیاں گر رہی تھیں۔ میں کہاں ہوں، کیا کر رہا ہوں، سوچ رہا ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی میرے منہ سے ایک احمقانہ آواز نکلی۔

''کیا وقت ہوا ہے؟''

وہ ایک لمحے تک خاموش رہی جیسے اپنے حواس سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر غصیلے لہجے میں بولی۔ ''اب تمہارے چہرے پر کیا بجا ہے اس کا تو مجھے پتہ نہیں اور گھڑی میں کیا بجا ہے وہ ابھی میں تمہیں دیکھ کر بتاتی ہوں۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے دو کہا۔ ''بارہ بج کر دس منٹ۔''

''اوہو...... اس کا مطلب ہے کہ میں زیادہ دیر نہیں سویا۔''

''کیا تم مجھے ذلیل کرنا چاہتے ہو؟'' وہ غرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''کیا مطلب...... اس میں ذلیل کرنے کی کیا بات ہے؟''

''میں تو سمجھتی ہوں کہ مجھے جو ایک نگاہ دیکھ لیتا ہے اس کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ اور اگر کبھی اس کے دل میں یہ خیال آ جائے کہ میرا حصول اس کے لئے ممکن ہے تو پھر وہ سو ہی نہیں سکتا۔''

اس کے ان الفاظ پر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کن لوگوں کی بات کر رہی ہو ڈیئر؟ رامیشر، کریم خان، جیت سنگھ۔ ان کے لئے تو تم لاٹری ہو، میرے لئے نہیں۔''

''ٹھیک۔ اصل میں بات یہ ہے کہ اس وقت تمہاری پتنگ چڑھی ہوئی ہے۔ اس لہجے میں بات نہیں کرو گے تو اور کس لہجے میں کرو گے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ میں پتنگوں کی ڈور درمیان سے توڑ دیتی ہوں۔''

''گڈ...... بڑی بات ہے۔'' میں نے اب اپنے حواس سنبھال لئے تھے۔

وہ بولی۔ ''اب فضول باتوں میں وقت گزارو گے یا مجھے بتاؤ گے کہ تم نے مجھے کیوں

بلایا تھا؟''

یہ ایک کھلی دعوت تھی۔ بہرحال مجھے زیادہ تجربہ تو نہیں تھا لیکن اتنا میں جان چکا تھا کہ اس قسم کی عورتیں جب بگڑتی ہیں تو اتنی بگڑ جاتی ہیں کہ پھر انہیں سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ وہ کچھ ایسی ہی تھی۔ بظاہر اس نے اداکاری کی تھی لیکن پھر اس کی یہی کیفیت ابھر آئی تھی جو اسے وحشی بنا دیتی تھی۔ میں اس وقت اپنے اندر کے انسان سے لڑ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میں اسے کمرے سے باہر نکال دوں یا پھر اشبھ بھاوناؤں کے تحت اسے بھی ایلس فیوری سمجھ کر اس کے ساتھ وہی سلوک کروں۔ بہرحال ابھی میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ تھوڑی سی سنبھل گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر بولی۔

''اندھیرا بھی اپنی جگہ ایک الگ نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ میں سگریٹ پینا چاہتی ہوں۔''

''مگر میں سگریٹ نہیں پیتا۔''

''پیو۔'' وہ بولی اور شاید اس نے اپنے پرس سے سگریٹ نکال لئے۔ پھر اس نے دو سگریٹ جلائے۔ سگریٹ اندھیرے میں چمک رہے تھے اور اس نے ایک سگریٹ میری طرف بڑھا دیا تھا۔

''میں نے کہا نا میں سگریٹ نہیں پیتا۔''

''جلو۔ جلنے میں بڑا مزا آتا ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

''اور جلانے میں؟''

''اگر سگریٹ نہیں لو گے تو میں اس کا جلتا ہوا سرا تمہارے بازو سے لگا دوں گی۔ سمجھے؟''

''تم مجھے بیوقوف سمجھتی ہو کیا؟''

''بالکل نہیں۔ تم تو صورت سے ہی ایک عیار آدمی لگتے ہو۔ شیطان کی طرح۔'' وہ آہستہ سے ہنسی۔ پھر بولی۔ ''میں پیاسی ہوں۔ سمجھے؟ میں پیاسی ہوں۔''

میں پھر ہنس پڑا اور بولا۔ ''مجھے معاف کرنا، میں تمہیں پانی نہیں پلا سکتا۔ جگ تو تم نے شاید گرا کر توڑ دیا ہے۔ اندھیرے میں سارا پانی بکھر گیا ہوگا۔''

''تمہارا وجود جو پانی پانی ہے۔''

''غلط۔''

"کیا مطلب؟"

"فولاد کو پانی کہتی ہو۔ یہ تمہاری بے وقوفی ہے۔"

"ہائے، فولاد......" اس نے ایک سسکاری سی لی اور میرے بازو پر ہاتھ پھیرنے لگی، پھر بولی۔ "واقعی فولاد ہو...... اور بلاشبہ خوبصورت بھی ہو۔"

"سیٹھ آدم زمان کے بارے میں کیا کہتی ہو؟"

"وہ ایک ایسی لاش ہے جو ابھی اکڑی نہیں ہے مگر بے جان اور سرد ہے۔"

"وہ بہت شریف آدمی ہے۔"

"تم کچھ نہیں جانتے بیوقوف آدمی، کچھ نہیں جانتے۔ کبھی جہنم کا تصور کیا ہے؟"

"جہنم؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں جہنم۔ اور اس جہنم کا نام آدم زمان ہے۔"

"ارے نہیں، کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ وہ تو بے چارہ بالکل ہی......"

"بس دیکھو، مجھے غصہ مت دلاؤ۔ یہ بتاؤ آخر تم پول کے کنارے کیبن تک کیسے گئے تھے؟"

"بس اتفاق تھا، تم نظر آ گئیں۔"

"جھوٹ۔"

"کیوں؟"

"تم نے میرا پیچھا کیا تھا۔"

"میں کہتا ہوں آخر یہ تصور بار بار تمہارے ذہن میں کیوں ابھرتا ہے؟"

"جانتے ہو یہ تصور کب سے میرے ذہن میں ہے؟"

"نہیں جانتا۔ بتا دو۔"

"اس وقت سے جب تم لفٹ میں مجھ سے ٹکرائے تھے۔"

"ارے واہ، کمال کرتی ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے میں جان بوجھ کر تم سے لفٹ میں ٹکرایا تھا؟ کیا مجھے یہ بات معلوم تھی کہ لفٹ میں تم موجود ہو؟ میں تو جلد بازی میں جانا چاہتا تھا۔"

"چلو یہ بات مان لیتی ہوں۔ لیکن اس کے بعد تمہاری جو کیفیت تھی کیا تم سمجھتے مجھے اس کا اندازہ نہیں؟"

"اب تم زبردستی کر رہی ہو تو میں تم سے کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"نہیں، میں چاہتی ہوں کہ تم سچ بولو۔"

"سچ؟"

"ہاں۔"

"کیا واقعی ہم دونوں ایک دوسرے سے سچ بول سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ مگر پہلے تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ گے۔"

"میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ایک بات تو بالکل طے ہے۔"

"کیا؟"

"تمہارا تعلق کسٹم سے نہیں ہے۔"

"اچھا...... آگے بولو۔"

"اور یقینی طور پر تم کوئی بگڑے ہوئے رئیس زادے ہو۔"

"رئیس زادے کی بات تم نے کیوں کہی؟"

"وجہ ہے اس کی۔"

"کیا؟"

"تمہارے ہاتھ۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ میرا تجربہ ہے۔ زندگی بھر کا تجربہ۔ تم نے ان ہاتھوں سے مشقت کبھی نہیں کی۔ میرا مطلب ہے وہ مشقت جو عام لوگ کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ تمہارا بدن انتہائی سڈول اور بہت خوبصورت ہے، اس بات کو میں دل سے تسلیم کرتی ہوں۔" اس کے ہاتھ مسلسل اپنی بات کی تصدیق کر رہے تھے۔

"کیبن میں تو تم بہت پارسا بن رہی تھیں۔"

"گالیاں دینا چاہتے ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"میں پارسا ہوں لیکن انسان بھی تو ہوں۔"

"یہ کس طرح کی پارسائی ہے جو انسانیت سے ہم آغوش ہو گئی ہے۔"

''بوڑھی لاش کو دیکھا ہے تم نے؟''

''آدم زمان؟''

''کیوں بار بار اس کا نام لیتے ہو اس وقت۔''

''اس وقت سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''یہ لمحات سمندر کے چڑھاؤ کے لمحات ہیں۔ مدوجزر ہو رہا ہے۔ چاند چڑھ چکا ہے۔ لہریں آسمان کی جانب لپک رہی ہیں اور تم ایسی سرد گفتگو کر رہے ہو۔ آخر تمہاری گفتگو میں گرمی کیوں نہیں آتی؟''

''بات آدم زمان کی ہو رہی تھی۔''

''بکتے رہو...... بہت ہی مردود انسان ہو۔ مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ ضدی، خودسر۔ بڑی خوبصورتی سے تم اپنی بات چھپا گئے۔ تمہارا کیا خیال ہے کیا واقعی تم ایک بگڑے ہوئے رئیس زادے نہیں ہو؟''

''فرض کرو ہوں۔''

''مگر ایک تجربے کی بات اور کہوں؟''

''کہو۔''

''ناتجربے کار ہو۔''

''کس سلسلے میں؟''

''عورت کے سلسلے میں۔ کیا تمہاری زندگی میں بہت سی عورتیں آئی ہیں؟''

اس کے اس سوال پر میرا ذہن ایک لمحے کے لئے بھٹک گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس سوال نے مجھ پر ایک عجیب سی نشہ آور بارش کر دی ہو۔ اور پھر میں ریورس ہونے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا پورا بدن ہوا میں بلند ہو رہا ہے۔ وہ کچھ کہہ رہی ہے اور میں کچھ سن رہا ہوں لیکن اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ میں تو فضا میں بلند ہوتا جا رہا تھا۔ ایک کمرہ نظر آیا جس میں ایلس فیوری میرے سامنے تھی اور میں زندگی کے وہ راستے طے کر رہا تھا جن سے میں نے ہمیشہ گریز کیا تھا...... ان ویرانوں میں سیاہ رنگ کا ایک مندر چمک رہا تھا اور کچھ آوازیں بھی ابھر رہی تھیں میرے اردگرد۔ میں نے سامنے نگاہ ڈالی تو مجھے بہت سے لوگ اپنے سامنے سجدہ ریز نظر آئے۔ ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ وہ سب کے سب سجدے میں گرے ہوئے تھے اور میں ایک اونچے پتھر پر کھڑا

ہوا تھا۔ میں نے ان پر نگاہ ڈالی، پھر میری نظر ایک جانب اٹھ گئی۔ صرف ایک شخصیت ایسی تھی جو ان سجدہ ریز لوگوں سے الگ ہٹ کر نظر آ رہی تھی۔ اس کی پشت اس طرف تھی اور منہ دوسری طرف۔ تھوڑی سی حیرت ہوئی، یہ کون ہے؟ کیا ہے یہ؟ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

آہستہ آہستہ اس شخصیت کا رخ بدلا۔ چاندنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی بلکہ یوں لگتا تھا جیسے چاند سے ایک شعاع نکل کر اس کے چہرے کو منور کر رہی ہو۔ اور یہ چہرہ...... غیض و غضب میں ڈوبا ہوا یہ چہرہ، میں نے اسے ایک لمحے کے اندر پہچان لیا تھا۔ یہ چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میرے خدا...... میرے خدا، یہ کلاڈیا تھی۔ کرنل صغیر کی بیٹی کلاڈیا جس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

آہستہ آہستہ اس نے اپنے جسم کا بھی رخ تبدیل کیا اور اٹھ کر ان سجدہ ریز لوگوں کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ بدستور سجدے میں تھے۔ وہ ان کے درمیان سے ہوتی ہوئی چند قدم آگے بڑھی لیکن پیچھے کسی اور وجود نے اسے آواز دی اور پھر ایک سفید جسم نمودار ہوا۔ سفید میں اسے اس لئے کہہ سکتا تھا کہ وہ بہت ہی براق قسم کی چادر اوڑھے ہوئے تھا جس سے ہلکی ہلکی نیلی روشنی جھلک رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس نے کلاڈیا کا بازو پکڑ لیا۔ کلاڈیا نے گھوم کر اسے دیکھا تو مجھے دوسرا چہرہ نظر آیا اور یہ دوسرا چہرہ میری ماں کا تھا۔ میری ماں جو میری جانب متوجہ نہیں تھی۔ اس نے کلاڈیا کا بازو پکڑا اور اسے گھسیٹتی ہوئی وہاں سے لے گئی۔

دفعتہً ہی مجھے یوں لگا جیسے میں خوابوں کی دنیا سے باہر نکل آیا ہوں۔ اس بدبخت عورت نے ایک ایسا ہی عمل کیا تھا کہ مجھے چونکنا پڑا اور میں ہوش و حواس میں واپس آ گیا۔ وہ ہنس رہی تھی اور اس کی سسکیاں بلند ہو رہی تھیں۔ ایک عجیب و غریب کیفیت تھی اس کی۔ اور اس کیفیت نے مجھے بھی اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ آہ...... میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ ایک عورت کو میں نے اتنا بے باک کس طرح دیکھا۔ کیا بتاؤں میں۔

بہرحال جو کچھ ہوا اس میں اس وقت میری قوتِ ارادی کو دخل نہیں تھا۔ بس وقت مجھے اپنے دھارے پر بہا رہا تھا۔ وہ بدبختی اور بدنصیبی جس نے میرے وجود کے گرد احاطہ کر لیا تھا، مجھے برائیوں کے غار میں گہرے سے گہرا پھینکتی جا رہی تھی۔ اور نجانے کتنا وقت اس طرح گزر گیا۔ میں جب ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آیا تو بدبخت عالیہ

زمان کا چہرہ میرے بالوں بھرے سینے پر ٹکا ہوا تھا اور وہ گہری گہری بدمست سانسیں لے رہی تھی۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ عالیہ کی جذبات میں ڈوبی سانسیں آہستہ آہستہ معتدل ہوتی چلی گئیں۔ پھر وہ ایک دم ہنس پڑی۔ میں نے اس سے اس کی ہنسی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ وہ خود ہی بولی۔

”تم واقعی محبوب نہیں محبوبہ ہو۔“

اس کے ان الفاظ میں کتنا طنز چھپا ہوا تھا، میں نے اسے محسوس کیا۔ وہ شاید میرے جواب کا انتظار کرتی رہی، پھر بولی۔ ”لیکن میں تمہیں محبوب بنا کر چھوڑوں گی سمجھے۔ سیٹھ آدم زمان کے بارے میں پوچھ رہے تھے، میں تمہیں بتاؤں، میں زندگی کو حسین دیکھنا چاہتی ہوں۔ حسین سے حسین تر۔ کیونکہ میں خود حسن و جمال کی دیوی ہوں۔ تم اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکو گے اگر ان لمحات کا ایک ہزارواں حصہ بھی تمہارے ہوش سے گزرتا ہے۔ مگر میرے پاس ایسے وسائل نہیں تھے۔ پہلی محبت میں نے اس سے کی تھی جو ایک سرکس میں ملازمت کرتا تھا۔ شیروں کو کنٹرول کرتا تھا وہ۔ سرکس دیکھنے گئی تھی میں۔ اتنی کمسن تھی کہ سرکس میں شیروں کو سدھانے والے کی گرویدہ ہو گئی۔ حالانکہ جانتی تھی کہ وہ معمولی سا آدمی ہے۔ مگر میں نے اسے حاصل کرنا چاہا اور دیوانوں کے انداز میں اسے حاصل کر لیا۔ اس کے بعد جب مجھے اس کا احساس ہوا کہ زندگی اس قدر گھٹیا چیز نہیں ہے کہ اسے صرف اپنی خواہشوں پر قربان کر دیا جائے۔ زندگی کے لئے کچھ ایسا چاہئے جو خوبصورت ہو اور تجربے نے یہ بات بتائی کہ زیادہ عمر کے لوگ بہت اچھے شوہر ثابت ہوتے ہیں۔ کم از کم مالی حد تک۔ اور اس کے لئے میں نے آدم زمان کی جانب قدم بڑھائے اور آخر کار میں اس کی بیوی بن گئی۔ سیدھا سادھا کاروباری جوا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ آدم زمان ایک عمر رسیدہ آدمی ہے اور ابتدا بھی میں نے اسی لئے کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ دو چار سال میں وہ چل بسے گا اور میں کروڑوں کی مالک بن جاؤں گی۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے آدم زمان زندگی سے بری طرح چپکا ہوا ہے۔ وہ بہت بڑا کاروباری ہے اور ہمیشہ کاروبار کے بارے میں سوچتا ہے۔ کیا تم اس بات پر یقین کر سکتے ہو کہ وہ بس ایک بھرپور زندگی گزارنا چاہتا ہے اور اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ میرے اپنے معمولات کیا ہیں۔ تم میری بات سمجھ گئے؟ وہ صرف دولت چاہتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ۔ زیادہ سے زیادہ۔ اور اس پر اگر میں اس کے کام آ جاؤں تو وہ اسے اچھا

سمجھتا ہے۔ برا نہیں سمجھتا۔ اب چلتی ہوں۔ تم بھی سمجھ گئے ہو گے اور میں بھی تمہیں سمجھ گئی ہوں۔ لیکن ایک بات ذہن نشین کر لو، اب تمہارے بغیر میں بالکل ناکارہ ہو جاؤں گی۔ وجہ جانتے ہو؟ وجہ بس یہ ہے کہ تم سب سے منفرد ہو۔“

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں برائیوں سے بچنا چاہتا تھا لیکن میرے وجود میں کوئی ایسا منحوس وجود حلول کر گیا تھا جو مجھے ان برائیوں سے بچنے نہیں دیتا تھا۔

آخر کار ایک دن اس کہانی کا بھی ڈراپ سین ہو ہی گیا۔ اس دوران عالیہ اکثر میرے کمرے میں آ جاتی تھی۔ ایک دن کے بعد وہ لوگ یورپ کے سفر پر روانہ ہونے والے تھے اور انہوں نے مجھے بہت پہلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ میاں بیوی بھرپور طریقے سے تیاریاں کر رہے تھے۔ اس دن بھی وہ کافی دیر سے ہوٹل پہنچے کیونکہ رات کو جس وقت عالیہ میرے کمرے کے کھلے دروازے کو بند کرتی ہوئی میرے قریب آئی تو اس وقت ایک بج رہا تھا۔ اس دن وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ اب یہ تو میں پورے اعتماد سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ واقعی میرے لئے جذباتی تھی یا پھر مجھے بے وقوف بنا رہی تھی۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

”اس کے بعد ہم دونوں جدا ہو جائیں گے۔ آہ، کاش میں کوئی بڑی جادوگرنی ہوتی تو تمہیں مکھی بنا کر اپنے ساتھ رکھ لیتی اور پھر جادو منتر پڑھ کر تم پر پھونکتی اور تم انسان بن جاتے۔ کچھ بولو گے نہیں؟“

”کیا بولوں؟“

”کچھ تو کہو۔“

”یورپ کتنے عرصے قیام رہے گا؟“

”میں کیا جانوں؟ ویسے میں یورپ، امریکہ، مشرق وسطیٰ نجانے کہاں کہاں گھوم آئی ہوں، سب کچھ دیکھا ہے میں نے۔ کیا تمہیں کمرے میں گھٹن نہیں محسوس ہو رہی؟“

”نہیں، کیوں خیریت؟“

”آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ کوئی ایسی انوکھی یادگار اپنے ساتھ لے جاؤں جو مجھے تمہاری یاد دلاتی رہے۔ آؤ، چھت پر چلتے ہیں۔“

”ارے اس میں کیا انوکھا پن ہو گا؟“

”ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔ ضد مت کرو۔“

''مگر میری بات تو سنو۔''

''کمال ہے، کل میں تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاؤں گی اور تم میری بات بھی نہیں مانتے۔ میں تمہاری بے شمار قربتیں حاصل کر چکی ہوں۔ کچھ تبدیلی چا ہوں۔ آؤ، چھت پر بالکل سناٹا ہو گا۔ باہر ہوا بھی بہت اچھی چل رہی ہے۔ بہت ا لگے گا۔''

''سنو تو سہی عالیہ! کسی نے ہمیں سیڑھیوں پر یا کوریڈور میں دیکھ لیا تو کیا مصیب نہیں آجائے گی؟''

''کوئی نہیں دیکھے گا۔ بس جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔''

''دیکھو...... ایسا کوئی عمل مت کرو جو سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دے۔ کسی ہمارے تعلقات کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ تم آخری وقت میں کیوں بھانڈا پھوڑ چاہتی ہو؟''

اس نے غصیلی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اس بات کا تو مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ ٹھیک ٹھاک نشے میں ہے لیکن کمبخت نشے کے عالم میں ایسی کوئی حرکت کر ڈالے گ اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ وہ حلق پھاڑ کر چلائی۔

''بزدل ہو تم...... بزدل ہو۔ بیوقوف تو تم خیر ہو ہی، لیکن اس قدر بزدلی مجھے ناپسند ہے۔ میں نے اب تک تمہاری ہر طرح سے تعریفیں کی ہیں۔ لیکن میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں بزدل نہیں ہوں اور مجھے بزدلی پسند نہیں ہے۔''

''خدا کے واسطے آہستہ بولو۔ آخر تم چاہتی کیا ہو؟''

''بس یہ کہ اوپر چلو۔''

''او کے...... او کے...... چلو۔'' میں نے انتظام کیا اور ہم اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ سیڑھیوں پر ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ جب ہم دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر کی منزل پر پہنچے تو دیکھا چھت پر جانے والے دروازے پر لوہے کا جنگلا لگا ہوا ہے اور اس میں تالا لگا ہوا ہے۔ میں نے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس ضدی عورت کے کہنے پر میں یہاں تک آ تو گیا تھا لیکن ظاہر ہے تالہ توڑ کر ہم چھت پر جانے سے رہے۔ میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تو وہ بولی۔

''سنو، ہم چھت پر ضرور جائیں گے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

''ارے بابا مگر کیسے؟ یہاں تو تالہ پڑا ہوا ہے۔''

''ہم فائر اسکیپ سے جائیں گے۔'' عالیہ نے ضدی لہجے میں کہا۔ بلڈنگ کے پیچھے کی سمت ہنگامی صورت میں استعمال کے لئے لوہے کی جو چکردار سیڑھیاں بنائی گئی تھیں وہ ان کے ذریعے چھت پر جانے کا تہیہ کر چکی تھی۔

''تم میری بات تو سنو۔ کیوں یہ خطرہ مول لے رہی ہو؟''

''خطرات ہی تو زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں کیا سمجھے؟ ارے میں کہتی ہوں تم کیوں میرے جذبات کو زخمی کر رہے ہو۔ آؤ...... چلتے ہیں۔''

میں کافی الجھ گیا تھا۔ بزدلی تو خیر کیا تھی، مجھے یہ ڈر تھا کہ اگر عمارت کے پیچھے سے کسی نے ہمیں ان چکردار سیڑھیوں سے چھت پر جاتے دیکھ لیا تو ہنگامہ ہو جائے گا۔ دیکھنے والا پتہ نہیں کیا سمجھے۔ ہو سکتا ہے کہ چور ہی سمجھ لے۔ لیکن وہ کمبخت میری کوئی بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔ یہاں تک کہ مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اور جو شخص عورت کی کسی نامعقول خواہش کے آگے ہتھیار ڈال دے اسے بہت کچھ بھگتنا پڑتا ہے۔''

''آؤ بابا، آؤ۔ نیچے چلتے ہیں۔ ظاہر ہے کمرے میں جا کر ہمیں اپنے کمرے کے پچھلے دروازے سے باہر جانا ہو گا اور یہیں سے ہم فائر اسکیپ کے ذریعے چھت پر پہنچ سکتے ہیں۔''

''آؤ'' اس نے کہا اور ہم واپس کمرے میں آ گئے۔ پھر وہی ہوا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر میں پچھلے حصے سے فائر اسکیپ کے ذریعے اس کے ساتھ چھت پر پہنچ گیا۔ عالیہ زمان کی ضد سے میں اس وقت خاصا بیزار ہو رہا تھا مگر اس کو دل نوازی کا فن آتا تھا اور اس نے خوب دل نوازیاں کیں۔ وہ ایک دہکتا ہوا الاؤ بنی ہوئی تھی۔ عجب نہیں تھا کہ اس رات سمندر کی بھیگی ہواؤں میں ہم ستاروں کے غائب ہونے تک جلتے رہتے کہ وقت نے کروٹ بدلی۔ میں نے چکر دار زینے سے ایک سایہ ابھرتے دیکھا اور میں تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ عالیہ نے جیسے آگ کی لپیٹوں میں راستہ ڈھونڈتے ہوئے مجھے آواز دی۔ اس کی نشے میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

''خاقان! کہاں چلے گئے؟''

''خاموش رہو۔ کوئی آ رہا ہے۔'' میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا مگر اس پر دیوانگی طاری تھی۔ کہنے لگی۔

"آنے دو...... ہمیں کیا؟"

"خاموش رہو پلیز۔" میں نے پھر کہا۔ چونکہ قدموں کی آواز تیز ہوگئی تھی۔ چھت ہم پانی کی ٹینکی کے قریب تھے۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور ٹینکی کی آڑ میں دیا۔ وہ بیٹھے بیٹھے جھول رہی تھی۔ ایک بار پھر اس نے نیم وا سی آواز میں کہا۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔ پلیز۔" وہ اپنے بالوں کو سنوارتے ہوئے بولی۔

"میں کہتا ہوں خاموش رہو۔ وہ اوپر آچکا ہے اور ہمیں ڈھونڈ رہا ہے۔" میں نے بات غلط نہیں کی تھی۔ آنے والا ہوٹل کی وسیع و عریض چھت پر واقعی ہمیں ہی تلاش کر رہا تھا۔ عالیہ اپنی پشت پر چپکے ہوئے کنکر چھڑانے لگی۔ میں نے اس کا گاؤن اس کی طرف پھینکا۔ اچانک ہی ایک سردی کی لہر میرے سارے وجود میں پھیل گئی تھی۔ ہم دونوں ٹینکی کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے مگر اس قسم کے بے شمار نشانات موجود تھے جو کسی بھی آنے والے کو ہماری یہاں موجودگی کا پتہ دے سکتے تھے۔ ابھی تک آنے والے نے ان نشانات پر نگاہ نہیں کی تھی۔ وہ چھت پر بنی چمنیوں اور ٹینکیوں کی آڑ لیتا ہوا ہم سے قریب ہوتا جارہا تھا۔ اور جب اس کے پاؤں نظر آنے لگے تو عالیہ کو بھی شاید خطرے کا احساس ہوا۔ وہ گٹھڑی سی بنی بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھا ہوا تھا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کی چیخ نہ نکل جائے۔

پھر آنے والے کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور اس کے منہ سے ایک گندی سی گالی نکل گئی۔ میں نے ہلکی سی روشنی میں دیکھا، اس کے ہاتھ میں موٹر کا لمبا پانا دبا ہوا تھا۔ پالش کی ہوئی دھات چاندنی میں چمک رہی تھی اور مجھے ایک لمحے کے اندر یہ اندازہ ہوگیا کہ اب کام ہونے ہی والا ہے۔ وہ اور دو چار قدم آگے آتا تو ہم اسے نظر آجاتے۔ چنانچہ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ اس سے جنگ کا آغاز کر دیا جائے۔ چنانچہ میں نے بجلی کی سی تیزی سے یہ فیصلہ کر لیا کہ پہلا وار مجھے کرنا چاہئے۔ کیونکہ میں نہتا ہوں۔ میں ٹینکی کی آڑ سے نکلا اور جھپٹ کر اس کے چہرے پر بھرپور گھونسا مارا۔ اس کے حلق سے چیخ کی آواز نکلی اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی جانب جا پڑا۔ ابھی تک اس نے عالیہ کو نہیں دیکھا تھا۔ مگر ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ یہ کریم خان ہی تھا۔ وہ اس وقت پوری وردی میں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آدم زمان کے تین باڈی گارڈوں میں سے ایک ہر وقت ان کی کار پر ڈیوٹی دیتا رہتا ہے اور اس کی کار ہوٹل کے عقبی حصے میں ہر وقت تیار ہوتی

ہے۔ ہو سکتا ہے کریم خان نے مجھے اور عالیہ کو فائر اسکیپ پر چڑھتے دیکھ لیا ہو۔ اتنے فاصلے سے ہمیں پہچاننا تو ممکن نہیں تھا مگر اس کو چہرے کے رخ کا علم تھا۔ پھر لڑکی کے کھلے ہوئے بال ہوا میں لہراتے دیکھ کر پوری بات سمجھ لینا کوئی ایسی مشکل بات نہیں تھی۔

بہرحال گھونسا کھا کر وہ گر پڑا تھا۔ لیکن جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ بھی فولادی جسم کا مالک اور شاندار جنگجو تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے بدن کی پوری قوت استعمال کی اور پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے فولادی پانا تولتے ہوئے میری طرف قدم بڑھائے اور اس کے حلق سے غرائی ہوئی آواز نکلی۔

"عالیہ زمان کہاں ہے...... بتا وہ کہاں ہے؟"

میں نے دیکھا کہ اس کے منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ اگر میں پیچھے ہٹتا ہوں تو شاید وہ عالیہ کو دیکھ لے۔ اس لئے میں اس کے دائیں ہاتھ کھلی چھت پر آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ میں نے سوچا کہ کاش عالیہ کی سمجھ میں یہ بات آجائے اور وہ فائر اسکیپ سے خاموشی کے ساتھ نیچے اتر جائے تو پھر اس حرام زادے سے میں اچھی طرح نمٹ لوں گا۔ میں دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے اس کے دائیں طرف نپے تلے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک ہی وہ گھوما اور اس نے پوری طاقت سے مجھ پر وار کیا۔ اگر میں بروقت بیٹھ نہ جاتا تو یہ وزنی پانا میرے سر کو بہت سے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا۔ فولادی پانا میرے سر سے تقریباً دو انچ کے فاصلے سے سنسناتا ہوا گزرا۔ میں نے بیٹھنے کے ساتھ ہی زمین پر ٹک کر پوری قوت سے اس کے پیٹ میں ایک لات ماری اور میرا یہ وار بھی بڑا کارگر ثابت ہوا۔ وہ گر گیا۔ ویسے میں اس بات کا تذکرہ ضرور کروں گا کہ یہ ایک عام ضرب نہیں تھی بلکہ فٹ بال کھیلنے والے کی کک تھی۔ پانا اس کے ہاتھ سے دور جا گرا۔ میرے لئے اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں تھا۔ میں اچھل کر اس پر سوار ہوگیا۔ اس وقت میری دلی خواہش تھی کہ عالیہ فائر اسکیپ سے نیچے اتر جائے۔ کون اسے سمجھائے۔ مگر مجھے سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ واقعی ایک ذہین عورت تھی۔ میں نے کریم خان کے لہولہان چہرے پر گھونسے برساتے ہوئے ایک لمحے کے لئے گھوم کر دیکھا تو عالیہ برق رفتاری سے فائر اسکیپ کے آہنی پنجرے میں اتر رہی تھی۔ میرا دل خوش ہوگیا۔ بہرحال مجھے امید تھی کہ اب وہ باآسانی نیچے پہنچ جائے گی۔ ہوٹل میں داخل ہونے کا ایک ہی راستہ تھا۔ میرے کمرے کا پچھلا دروازہ۔ اور تمام دروازے اس وقت بند تھے۔ میرے

کمرے میں پہنچ کر وہ خاموشی کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں پہنچ سکتی ہے۔ اور ایک بار اپنے کمرے میں پہنچ جائے پھر سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر میرا مڑ کر دیکھنا غضب ہو گیا۔ کریم خان نے بھی اسے فائر اسکیپ سے نیچے اترتے دیکھ لیا۔ ویسے کریم خان مجھ سے زیادہ نہیں تو برابر کا ضرور ہوگا۔ اس نے پوری قوت لگا کر مجھے گرایا اور چیختا ہوا دوڑا۔

''مار ڈالوں گا تجھے کتیا کی بچی، میں تجھے مار ڈالوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے تو نجانے اس پر کیا دیوانگی سوار تھی۔ غالباً یہ رقابت کا جذبہ تھا۔ ادھر عالیہ کی جو کیفیت تھی اس سے مجھے ڈر تھا کہ کہیں فائر اسکیپ کی سیڑھیوں سے اس کا پیر نہ پھسل جائے۔ وہ بڑے بے ڈھنگے پن سے نیچے اتر رہی تھی۔ میں نے پھرتی سے کریم خان پر چھلانگ لگائی۔ وہ فائر اسکیپ سے اترنے کے بعد جھکا ہی تھا کہ میں نے اسے پیچھے سے جا پکڑا اور ایک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف پھیر لیا۔ اس نے الٹے ہاتھ کا ایک کٹ مارا اور مجھے یوں لگا جیسے میرے رخسار کی ہڈی گوشت پھاڑ کر باہر آ گئی ہو۔ میں نے ہوا میں ہاتھ گھمایا، وہ پیچھے ہٹا۔ وہ مجھ سے اب دو دو ہاتھ کرنے پر تل گیا تھا۔ ممکن ہے پہلے سے اس کے ذہن میں کسی طرح کا شبہ رہا ہو۔ لیکن اب تو عالیہ کو اس نے اپنی آنکھوں سے فائر اسکیپ سے اترتے دیکھ لیا تھا۔

ہم دونوں چھت کے سرے پر پہنچ گئے۔ زیادہ سے زیادہ چھ انچ کی منڈیر ہوگی جس پر کریم خان اب کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے یونیفارم کی آستین سے ہونٹوں پر لگا ہوا خون پونچھا اور گالی دے کر مجھ پر جھپٹا ہی تھا کہ میں نے اس کے پیٹ پر سیدھے پیر کا ایک کک رسید کیا۔ وہ تکلیف سے دُہرا ہو گیا اور پیچھے کی طرف گرا۔ مگر پیچھے کچھ نہیں تھا۔ محض خلا تھا اور موت...... وحشت کی لہر مجھے کاٹتی ہوئی گزر گئی۔ کریم خان کی بھیانک چیخ ابھری۔ اس نے ہوا میں دونوں ہاتھ پاؤں چلائے جیسے کسی چیز کو پکڑ کر لٹک جانا چاہتا ہو۔ اس کے دونوں ہاتھ اس طرح اٹھے ہوئے تھے اور پیر یوں چل رہے تھے جیسے کوئی مستی میں ناچ رہا ہو۔ خداوند...... یہی وہ تصویر تھی جو اس ہوٹل میں آتے ہوئے میں نے بھوج پتر پر دیکھی تھی۔ ایک رقص کرتا ہوا وردی پوش۔ پلک جھپکتے میں یہ تصویر بنی اور مٹ گئی۔ زمین کی طرف جاتے ہوئے وہ کسی چھجے سے ٹکرایا ہوگا۔ کیونکہ میں نے ایک دھماکہ سنا اور اس کے بعد اس کی آخر چیخ۔ پھر کچھ ہی لمحوں کے بعد لوگوں کے پکارنے اور دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کمروں میں روشنیاں ہونے لگیں۔

''چور...... چور...... چور...... کیا ہوا؟ کون تھا؟ کون اوپر سے گرا ہے؟ دیکھنا...... دوڑنا......'' یہ آوازیں فضا میں بلند ہو رہی تھیں اور میرے لئے ہر لمحہ قیمتی تھا۔ میں دیوانوں کی طرح چکر دار زینوں پر پیر مارتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ کریم خان جہاں گرا تھا وہ جگہ یہاں سے نظر نہیں آتی تھی لیکن وہ جگہ بالکل نیچے تھی۔ بہت سے سایوں کو ایک خاص سمت میں جمع ہوتے دیکھا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ٹارچ بھی تھی اور وہ زمین پر روشنی ڈالتا ہوا کسی کو زور زور سے پکار رہا تھا۔ میرے خدا، اگر اس نے ایک بار بھی اپنی ٹارچ کا رخ اوپر کی طرف کر دیا تو میں مارا جاؤں گا۔ ابھی مجھے ایک منزل اور اترنا ہے۔ چند سیڑھیاں اور ہیں، اس کے بعد میں چوتھی منزل تک پہنچ جاؤں گا اور اپنی منزل کی پچھلی گیلری میں کسی نے مجھے دیکھ بھی لیا تو میں کہہ دوں گا کہ میں خود شور سن کر اپنے کمرے سے نکل آیا ہوں۔ مگر یہاں کسی نے دیکھ لیا تو مصیبت آ جائے گی۔

میرا دم نکلا جا رہا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اب وہ چند سیڑھیاں عبور کرنا میرے اختیار میں نہ تھا۔ چوتھی منزل کی پچھلی گیلری میں چکر دار سیڑھیوں کی ریلنگ پر کوئی شخص کھڑا تھا اور نیچے جھانک رہا تھا۔ میں اسے پہچان نہیں سکا۔ وہ شاید میرے برابر کے کمرے والا تھا اور شور سن کر اپنے کمرے کا پچھلا دروازہ کھول کر گیلری میں آ گیا تھا۔ مجھے اپنے کمرے میں جانے کے لئے اس کے قریب سے ہو کر گزرنا پڑتا اور وہ سوچتا کہ میں اوپر سے کیوں اتر رہا ہوں؟

میں دم سادھے کھڑا رہا۔ میں پانچویں اور چوتھی منزل کے درمیان معلق تھا۔ نیچے بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ کسی نے کہا۔

''پولیس کو بلاؤ...... پولیس کو۔''

دوسری آواز آئی۔ ''ارے کوئی ڈاکٹر ہے یہاں؟''

''ڈاکٹر...... ڈاکٹر کیا کرے گا؟''

''کیوں؟''

''یہ مر چکا ہے۔'' کسی نے کہا اور میری آنکھوں کے سامنے پھانسی کا پھندا لہرانے لگا۔ بہرحال میں خاموشی سے سیڑھیوں پر جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ آواز پھر آئی۔

''یہ گرا کہاں سے ہے؟'' اس آواز میں ایک کرختگی، ایک فوجی پن تھا۔ یہ شاید ہوٹل کے بے شمار چوکیداروں میں سے کوئی چوکیدار تھا۔ عموماً اچھے ہوٹلوں میں ریٹائرڈ فوجیوں کو

جگہ دی جاتی ہے۔ یہ ذہن بھی ہوتے ہیں اور اعلیٰ کارکردگی کے مالک بھی۔ ایسی صورت میں دیکھا جا سکتا تھا کہ اوپر سے کس جگہ سے وہ گرا ہے۔ کسی نے فوراً کہا۔

''ادھر اوپر سے۔''

میں نے دو سیڑھیوں کی درمیانی درز سے دیکھا، ٹارچ والا اور دوسرا سایہ اس سائے سے نکل کر باہر آئے تھے جس کی وجہ سے میں کریم خان کی لاش نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ٹارچ والے نے اوپر کی طرف ٹارچ چمکائی اور پھر اس کی آواز اُبھری۔ ''ٹھہرو ادھر دیکھو، وہ کون ہے؟''

''کدھر؟''

''چوتھی منزل پر۔'' چوکیدار کی آواز ہتھوڑے کی مانند پڑی۔ میں نے سوچا کہ اب چھپنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں پکڑا گیا۔ ٹارچ والے نے چوتھی منزل پر روشنی گھمائی۔ یہ ہمسایہ ابھی تک ریلنگ پر جھکا ہوا تھا اس نے نیچے والوں سے پکار کر کہا۔

''ارے نیچے کھڑے ہوئے کیا باتیں کر رہے ہو۔ چھت پر دیکھو، چھت پر اس کے اور بھی ساتھی ہوں گے۔''

میں نے دو تین آدمیوں کی آوازیں سنی تھیں۔ ٹارچ والے نے ٹارچ بجھا دی تھی۔ چوتھی منزل پر اسے جو سایہ نظر آیا تھا وہ میرا پڑوسی تھا۔ ہوٹل کا معزز مہمان۔ چوکیدار نے بڑے ادب سے کہا۔

''سر! آپ اپنے کمرے میں جائیں، ہم دیکھتے ہیں۔''

میرے پڑوسی نے زیر لب کچھ کہا اور وہاں سے ہٹ گیا۔ کیونکہ میں نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تھی۔ نیچے چوکیدار اپنی فوج جمع کر رہا تھا اور ٹارچ والا اب نیچے سے ہٹ گیا تھا مگر ان کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ یہی موقع ہے۔ میں نے سوچا۔ منٹ بھر میں وہ چھت پر جانے کے لئے فائر اسکیپ پر چڑھنا شروع کر دیں گے۔ میں بے آواز قدم رکھتا ہوا یہ چند سیڑھیاں اتر کر اپنی گیلری میں آ گیا اور پھر یہاں سے اپنے کمرے کی محفوظ چار دیواری میں پہنچنا لمحے بھر کی بات تھی۔ یہ خطرہ میں نے خطرے کے بالکل سر پر پہنچ جانے کے بعد مول لیا تھا۔ لیکن بہرحال اس وقت تقدیر ساتھ دے رہی تھی چنانچہ میں اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرے میں آنے کے بعد میں نے دروازہ بند کیا اور سانس روکے فائر اسکیپ پر چڑھنے والے قدموں کی آوازیں سننے لگا۔

میں نے سوچا کہ ابھی روشنی نہ جلاؤں۔ چوکیداروں کی فوج چوتھی منزل پر پہنچے گی تو ان کے قدموں کے شور سے جیسے میری آنکھ کھل جائے گی اور میں روشنی جلا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ فائر اسکیپ پر یہ دھاچوکڑی کیسی مچی ہوئی ہے۔ ایک لمحے کے اندر میں نے پورا منصوبہ تیار کر لیا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ خطرہ فوری طور پر ٹل گیا تھا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میری رخسار کی ہڈی سلگ رہی ہے اور سلیپنگ سوٹ کے کالر پر کچھ چپچپاہٹ سی ہے۔ میں دروازے سے ہٹ کر سیدھا غسل خانے میں پہنچا۔ روشنی جلا کر سیدھا آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو دیکھا کہ بائیں آنکھ کے نیچے رخسار کا گوشت پھٹ گیا ہے۔ تقریباً ایک انچ کا زخم تھا۔ خون زیادہ نہیں بہا تھا مگر گال سوجنے لگا تھا۔ میں نے شیونگ کے سامان میں سے آفٹر شیو نکالا اور پھر زخم پر ہلکا ہلکا اسپرے کرنے لگا۔ میرے زخم پر اتنی شدید جلن ہوئی کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن خون رِسنا بند ہو گیا تھا۔ پھر میں نے تھوڑا سا پاؤڈر لگا کر شب خوابی کے کپڑے غسل خانے میں اتار پھینکے اور کمرے میں آ کر روشنی جلا لی۔

باہر کوریڈور میں کھلنے والا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں نے چٹخنی چڑھا دی۔

ہم اوپر جاتے ہوئے ایک کمبل اور دو تکیے لے گئے تھے۔ عالیہ نے کمرے سے جاتے ہوئے میرا کمبل اور تکیہ قالین پر پھینک دیا تھا اور باہر نکل گئی تھی۔ بہرحال میں اس کی حاضر دماغی کا قائل ہو گیا۔ کمال کی لڑکی تھی۔ اتنی ننھی سی عمر میں اس قدر ماہر ہو چکی تھی۔ لیکن ایک بار پھر میرے پورے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ میرے خدا...... میرے خدا...... میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کمبل اٹھا کر جھٹکا۔ میں ایک بار پھر اپنے گلے میں رسّی کا پھندا محسوس کرنے لگا۔ عالیہ کمبل کے ساتھ ایک تکیہ بھی اٹھا کر لائی تھی اور دوسرا تکیہ چھت پر ہی چھوڑ آئی تھی۔ میں نے کمبل کو دوسری بار جھاڑا جھپٹا، تکیے کو اٹھا کر دیکھا۔ اس کے ریشمی غلاف پر ہوٹل کا مونوگرام اور کمرے کا نمبر کڑھا ہوا تھا۔ یقیناً چھت پر پڑے تکیے پر بھی یہ نشان ہوگا اور وہ اب چھت پر پہنچ چکے ہوں گے اور تھوڑی دیر میں میرے کمرے کو گھیر لیں گے۔ اس کے بعد پولیس اسٹیشن، مقدمہ، پھانسی۔ میں نے پاگلوں کی طرح کمرے میں نظر دوڑائی۔ دوسرے تکیے کا واقعی پتہ نہیں تھا۔ میں نے خود کو جھوٹی تسلی دینے کے لئے کہا۔

''ہو سکتا ہے عالیہ اسے اپنے ساتھ لے گئی ہو۔ لیکن پھر خود ہی میں نے اس احمقانہ

خیال کو مسترد کر دیا۔ تکیہ یقیناً ابھی تک چھت پر پڑا ہوا ہے یا پھر سیڑھیوں پر رہ گیا ہے، مگر نہیں، سیڑھیوں پر کچھ نہیں تھا۔ میرے کمرے کا ایک تکیہ ابھی تک چھت پر ہی تھا۔ فائر اسکیپ کی سیڑھیوں پر برابر لوگ آ جا رہے تھے لیکن نہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اگر تکیہ سیڑھیوں پر ہوتا تو اس پر ضرور میری نظر پڑتی۔ وہ یقیناً چھت پر ہی رہ گیا ہے۔ ایک بار پھر میں نے دروازے پر کان لگا کر سنا، کوئی کہہ رہا تھا۔

"پولیس آ گئی ہے...... پولیس آ گئی ہے۔"

"مگر چھت پر تو چوکیدار چڑھے ہوئے ہیں۔"

"ہاں، پولیس ان سے بھی نیچے اترنے کے لئے کہہ رہی ہے۔"

پولیس کی یہ برق رفتاری بھی میرے لئے حیران کن تھی اور واقعی پولیس جس برق رفتاری سے کام کرتی ہے اس حساب سے دس پندرہ منٹ میں میری تلاش شروع ہو جائے گی۔ اب ایک ہی راستہ ہے۔ صرف ایک راستہ اور وہ یہ کہ میں یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں نے مایوسی سے ہاتھ ملتے ہوئے سوچا کہ کیا میری تقدیر میں یہی سب کچھ لکھا ہے کہ ایک مشکل سے چھٹکارا پاؤں تو دوسری میں گرفتار ہو جاؤں؟ اب اور کچھ نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ نکل جاؤں یہاں سے۔ میں نے جلدی جلدی سوٹ کیس کھولے اور جس قدر بھی نقد رقم اور قیمتی چیزیں میرے پاس تھیں وہ ایک بیگ میں بھریں اور اس کے بعد وہاں سے نکل گیا۔

بمبئی جیسے زبردست شہر میں جہاں قدم قدم جیب کتروں اور چوروں سے واسطہ پڑتا ہے، اس مال و زر اور جواہرات کو بچانا بھی ضروری تھا۔ میرے پاس اس وقت بہت بڑی رقم تھی اور اس کے علاوہ کچھ جواہرات بھی تھے جو میں نے بڑی حفاظت سے اپنے لباس میں محفوظ کر لئے تھے۔ ویسٹ پہننے کے بعد میں نے کپڑے پہنے اور وہ سب کاغذات وغیرہ جن سے میری شناخت ہو سکتی تھی یا بمبئی یا اس کے بعد سیتا گڑھی یا کلکتے میں میرا سراغ لگایا جا سکتا تھا، یہ سارے کے سارے کاغذات میں نے جیبوں میں ٹھونس لئے۔

اب مجھے یہ فکر ہوئی کہ آنکھ کے نیچے جو چوٹ آئی ہے اسے کس طرح چھپایا جائے۔ ایک سوٹ کیس میں بینڈج کا سامان موجود تھا۔ بینڈج نکال کر میں نے اپنے چہرے کی مرمت شروع کر دی۔ خون بہنا تو بند ہو گیا تھا۔ اور اس کے بعد میں نے کمرے کی روشنی جلائی اور کوریڈور میں نکل آیا۔

ہوٹل کے ملازمین تیزی سے اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ میں نے ہوٹل میں موجود چند مہمانوں کو دیکھا جو اس شور و غل اور ہنگامے کے بارے میں معلومات کرنے نکل آئے تھے۔ چنانچہ میں بھی انہی میں شامل ہو گیا۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

"پتہ نہیں کیا ہوا۔ کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا۔"

"شاید کوئی چور گھس آیا ہے۔ میں نے پورٹر کی آوازیں سنی تھیں۔" میں نے خود بھی چہرہ کیا اور آگے بڑھنے لگا۔ میں نے اپنے گال پر رومال رکھ لیا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر میں نے اس شخص کو دیکھا جو میرا پڑوسی تھا اور عقبی گیلری میں ریلنگ پر جھکا ہوا تھا۔ وہ میرے برابر ہی آ کر کھڑا ہو گیا اور بڑے زور و شور سے بتانے لگا کہ کس طرح اس نے پچھلی گیلری سے کسی کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر گرنے والے کی چیخ سنی تھی۔ یہ اگر سچ بول رہا ہے اور اس نے عالیہ کو دیکھا ہے تو اسے بتانا چاہئے کہ وہ شخص میرے کمرے میں داخل ہوا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

"آپ نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"ہاں۔"

"مگر وہ گیا کہاں؟"

"یہی تو نہیں معلوم ہو سکا۔" اس نے کہا۔

"ظاہر ہے آپ فوراً ہی تو باہر نہیں نکل آئے ہوں گے۔"

"میں نے پہلے اس کی آواز سنی تھی مگر اسے دیکھا نہیں تھا۔" اس نے آخر کار سچ اگل دیا اور میں نے سکون کی گہری سانس لی۔ ہم چار آدمی لفٹ سے اتر کر لابی میں آ گئے۔ پولیس والوں نے ابتدائی کارروائیاں شروع کر دی تھی۔ مگر ابھی تک ہوٹل سے باہر جانے والے مہمانوں پر پابندی نہیں لگائی تھی۔ میں جس قدر ممکن ہوتا یہ ہوٹل چھوڑ دیتا لیکن میرے برابر کے کمرے والا موقع واردات پر جانا چاہتا تھا۔ وہ اتنی سی دیر میں بے تکلف ہو گیا تھا۔ میرا بازو پکڑ کر اس نے کہا۔

"آیئے ذرا ہوٹل کے پچھلے حصے میں چلتے ہیں۔ دیکھیں تو سہی اوپر سے کون گرا ہے؟"

دل تو میرا یہ چاہ رہا تھا کہ اس گدھے کی گردن توڑ دوں مگر ظاہر ہے یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ اس وقت تو میری دلی خواہش تھی کہ میں دوڑتا ہوا ہوٹل کے صدر دروازے سے باہر نکل جاؤں۔ ایک ایک منٹ ایک صدی کی طرح گزر رہا تھا۔ میں نے بے زاری سے کہا

کہ مجھے لاشیں دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

''آیئے تو سہی جناب! ذرا دیکھیں۔''

''بھائی! میں دل کا مریض ہوں اور کسی بھی ایسی چیز کو دیکھ کر میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔''

''اوہ...... یہ بات ہے۔'' اس نے کہا اور ریستوران کی طرف مڑ گیا۔ میں خود بھی وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ وہ شخص اب دوسروں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ روشنی ابھی تک نہیں پھیلی تھی لیکن اندازہ یہ تھا کہ تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی۔ میں نے ریستوران کے کاؤنٹر پر جا کر ڈسپرین کی گولیاں مانگیں۔ دراصل میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سوئمنگ پول کا راستہ کھلا ہے یا بند۔ اس طرف سے کمپاؤنڈ کی چھوٹی دیوار پھلانگ کر فرار ہو جانے کی آسانی موجود تھی۔ لیکن ہائے بدنصیبی، دروازہ بند تھا اور کاؤنٹر والے کے پاس درد کی گولیاں بھی نہیں تھیں۔ میں نے سوچا کہ اب صدر دروازے سے نکلنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ مگر لابی میں وہی کتا کھڑا ہوا تھا یعنی میرا نامعقول پڑوسی۔ میں کاؤنٹر پر کچھ دیر بلاوجہ کھڑا رہا تاکہ یہ لوگ لابی سے ہٹ جائیں تب میں ہوٹل سے باہر نکلوں۔

اچانک ہی میرا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سامنے سے ایک پولیس افسر آ رہا تھا۔ لیکن اس وقت میرے اس پڑوسی نے میرے ساتھ بہت ہی بہترین سلوک کیا۔ وہ پولیس آفیسر کے راستے میں آ گیا اور اسے غالباً اپنی معلومات کے بارے میں بتانے لگا۔ پھر وہ باتیں کرتے ہوئے اس طرف مڑ گئے جہاں سے ہوٹل کے پچھلے حصے پر راستہ جاتا تھا۔ اب موقع تھا کہ میں ان کے جاتے ہی تیزی سے دروازے کی جانب بڑھ جاؤں۔ لیکن پھر مجھے خیال ہوا کہ مجھے تیزی نہیں دکھانی چاہئے ورنہ وہ لوگ بلاوجہ متوجہ ہو جائیں گے۔

میں نے اپنی رفتار ہلکی کی اور ٹہلتا ہوا صدر دروازے کی طرف چل پڑا۔ دروازے پر دو تین پولیس والے اور کئی چوکیدار کھڑے تھے۔ انہوں نے ایک بھدی سی شکل والے شخص کو روک رکھا تھا۔ مجھے دروازے کی طرف آتا دیکھ کر ایک پولیس والا آگے بڑھا اور میں نے سوچا کہ آئی مصیبت۔ لیکن پچھلے دنوں میں ہوٹل کے چھوٹے ملازموں کو جو بخششیں دیتا رہا تھا وہ کام آ گئیں۔ دو چوکیداروں نے مجھے پہچان کر سیلوٹ مارا اور میں ان کے سلام کا جواب دیتا ہوا پولیس والے کو نظرانداز کر کے صدر دروازے سے گزر گیا۔ میں نے باہر نکلنے کے بعد ہوا میں گہری گہری سانسیں لیں۔ میرے خدا...... میرے خدا، میری

جان بچ گئی۔ آہ...... واقعی، میری جان بچ گئی۔ لیکن کیا کہا جا سکتا تھا۔ ابھی میں فٹ پاتھ تک نہیں پہنچا تھا کہ کمپاؤنڈ میں پولیس کی سیٹیاں بجنے لگیں اور دوسرے لمحے میں نے اپنے پیچھے تیز قدموں کی آواز سنی......

میرے پورے جسم سے جان نکل گئی۔ ایسا لگا جیسے پیروں میں آگے بڑھنے کی سکت ہی ختم ہو گئی ہو۔

آہ یہ تقدیر کے کھیل ہوتے ہیں۔ تقدیر کیسے کیسے راستوں سے گزار کر کہاں کہاں لے آتی ہے، کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کوئی اپنے آپ کو کتنا ہی تیس مار خان سمجھ لے، تقدیر اسے انگلیوں پر نچاتی ہے۔ میں کس طرح اس وقت زندگی اور موت کا کھیل کھیل رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میری اپنی سوچ کے سارے دروازے بند تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میری تقدیر کا اگلا لمحہ کون سا ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پولیس والوں کو قاتل کے بھاگنے کا گمان پیدا ہو جائے اور اس کے بعد ظاہر ہے یا تو مجھے رُکنے کی وارننگ دی جائے گی اور اگر میرے قدم نہ رُکے تو اس کے بعد پولیس والے جانتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہوگا۔

میں اپنی تقدیر کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا جو ایک لمحے کے اندر اندر ہونے والا تھا۔ پیچھے سیٹیاں بج رہی تھیں۔ لیکن پھر نجانے کیا ہوا کہ سیٹیاں بند ہو گئیں البتہ میں کسی کار کی ہیڈ لائٹ میں نمایاں ہو گیا تھا۔ روشنیاں قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ یہ سو فیصدی پولیس کی گاڑی ہوگی جو میرے پیچھے بھاگی ہوگی۔ ابھی مجھے وارننگ ملنے والی ہے۔ مجھ سے کہا جانے والا ہے کہ رُکو۔ اگر ایک قدم بڑھایا تو گولی مار دی جائے گی۔ لیکن آگے بڑھنے والے قدم اس وقت تک نہیں روکے جا سکتے جب تک کہ آواز نہ آ جائے۔ چنانچہ میں آگے قدم بڑھاتا رہا۔ لیکن کچھ ہی لمحوں کے بعد روشنیاں میرے قریب سے گزر گئیں۔ وہ پولیس کار نہیں بلکہ ایک پرائیویٹ گاڑی تھی جو اپنا سفر طے کرتی ہوئی اپنی منزل کی جانب چلی گئی تھی۔ لیکن قدموں کی چاپ بدستور میرے قریب آ گئی اور کوئی میرے بالکل نزدیک آ گیا۔ اور جب وہ میرے بالکل قریب پہنچا تو میرے قدم سہمے ہوئے انداز میں رُک گئے۔ تبھی ایک آواز سنائی دی۔

''سر! اگر کہیں جانا ہے تو ٹیکسی لا دوں آپ کے لئے؟'' میں نے بند سانسوں کے ساتھ دیکھا، یہ سیلوٹ کرنے والے چوکیداروں میں سے ایک تھا۔ چونکہ میں ان لوگوں کو

ٹپ وغیرہ دیتا رہتا تھا اس لئے خاص طور سے یہ دو چوکیدار میری بڑی عزت کرتے تھے۔
میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے بالکل یوں لگا جیسے کسی نے پھانسی کا پھندا میری گردن
سے اتار دیا ہو۔ میں نے اپنی چوٹ کے زخم کو اسی طرح رومال سے چھپا رکھا تھا۔
بہرحال اس شخص کو جواب دینا ضروری تھا۔ میں نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔

"نہیں میرے دوست! میرے دانت میں تکلیف ہے۔ بہت دیر سے دانت میں درد
ہو رہا ہے۔ ویسے بھی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہوٹل میں ہنگامہ ہوا تو میری نیند اور اڑ
گئی۔ میں نے سوچا کہ تھوڑی دیر باہر چہل قدمی کر لوں۔ یہاں کا ماحول بڑا پرسکون
ہے۔ میرے دانت میں شدید درد ہے اور میں چہل قدمی کرنا چاہتا ہوں۔"

"اوہو سر! کوئی دوا نہیں لی آپ نے؟" چوکیدار ہمدردی سے بولا۔

"نہیں۔ پتہ تو نہیں تھا کہ درد دور ہو جائے گا اس طرح سے۔ خیر کوئی بات نہیں۔
سا ٹہلوں گا تو کچھ سکون مل جائے گا۔"

چوکیدار ہمدردی کے الفاظ کہتا ہوا سلام کر کے چلا گیا۔ میں اسی طرح فٹ پاتھ پر
ہوا صدر دروازے سے کافی دور نکل آیا تھا۔ سڑک بالکل سنسان تھی اور اب مجھے یہ سوچنا
تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اس بات کا تو مجھے پورا پورا یقین تھا کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد
میرا راز کھل جائے گا اور اس کے بعد پولیس سرگرمی سے میری تلاش میں مصروف ہو
جائے گی۔ بمبئی میں اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ یہاں سے نکل کر کسی ہوٹل میں قیام کروں تو
ظاہر ہے پولیس اس بات کو بھی ذہن میں رکھے گی۔ اس وقت میرے اور پولیس کے
درمیان ذہانت کا مقابلہ ہے۔ جو بھی اس مقابلے میں جیت جائے۔ مجھے خود ہی اپنے
احساس پر ہنسی آ گئی۔ لیکن ہنسی کے ساتھ ساتھ ہی مجھے کسی اور کی بھی یاد آئی اور میرا دل
خوشی سے اچھل پڑا۔ یہ ہنسی ولیم ہاروے کی تھی جو ایک مخصوص انداز میں ہنستا تھا اور کئی بار
میں اس کی ہنسی پر تبصرہ کر چکا تھا۔ اس وقت ہنسی پر مجھے اس کی ہنسی یاد آئی تھی۔ اور
ولیم ہاروے یاد آیا تو دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ولیم ہاروے اس وقت بمبئی میں
تھا۔ اس کا جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز تھا اور اس کی مرمت ہو رہی تھی۔ آہ...... یہ تو بہت
شاندار بات ہے۔ ولیم ہاروے اس وقت میری بھرپور مدد کر سکتا ہے۔ بس اس کے علاوہ
اور کچھ سوچا ہی نہیں جا سکتا۔ چنانچہ میں نے اندازے سے بندرگاہ کا رخ کیا اور چلنا
شروع کر دیا۔ میں یہاں سے ٹیکسی وغیرہ کا بھی بندوبست کر سکتا تھا لیکن میں نہیں چاہتا

تھا کہ فوری طور پر کسی کو یہ علم ہو کہ ہوٹل کا ایک فرد ٹیکسی میں بیٹھ کر یہاں سے کہاں گیا
ہے۔ حالانکہ بمبئی میرے لئے تقریباً اجنبی شہر تھا لیکن ولیم ہاروے ایک دو بار اپنے جہاز
پر لے جا چکا تھا اور اس کا جہاز جہاں کھڑا تھا اس کا راستہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔
میں اپنی تمام تر ذہانت سے کام لے کر آگے کا سفر کرتا رہا۔ سنسان جگہ دیکھتا تو رفتار
تیز کر دیتا بلکہ ایک حد تک دوڑنے لگتا۔ اِکا دُکا لوگ آتے جاتے نظر آتے تو چہل قدمی کا
سا انداز اختیار کر لیتا۔

صبح کی روشنی آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی۔ بڑی سڑک چھوڑ کر میں چھوٹی سڑکوں اور
گلیوں میں گم ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن بندرگاہ کے علاقے میں پہنچنے کے بعد ایسی گلیاں وغیرہ
بھی نہ نظر آ رہی تھیں۔ کشادہ سڑکوں اور بڑی عمارتوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر
بھی میں نے حسب توفیق چکردار راستے اختیار کئے اور آخر کار میں ڈارک پورٹ کے
قریب پہنچ گیا۔ اب اچھی خاصی روشنی پھیل گئی تھی اور گودیوں میں کام کرنے والے رات
کی شفٹ کے مزدور سڑکوں پر آنا جانا شروع ہو گئے تھے۔ ڈارک پورٹ کے علاقے میں
ہر کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی لیکن ولیم ہاروے کے نام پر میں اور خاص طور سے
اس جہاز کے نام پر میں وہاں سے جا سکتا تھا۔ بحریہ کے گارڈ روم سے کچھ دور میں نے
اپنی جیب سے کنگھا نکال کر اپنے بال درست کئے، رومال سے جوتوں کی گرد صاف کی
اور سگریٹ جلا کر بڑے اعتماد سے آخر کار مسلح گارڈ کے قریب پہنچ گیا۔ اس سے میں نے
بات کی تو گارڈ نے مجھے ایک نگاہ دیکھا اور اس کے بعد بولا۔

"آپ مجھے نہیں پہچانے گے سر! لیکن میں آپ کو پہچان گیا ہوں۔ آپ کئی بار یہاں
آ چکے ہیں۔"

"ہاں! اصل میں میرا دوست ولیم ہاروے یہاں ہوتا ہے اور اس وقت مجھے اس سے
اہم کام تھا۔" میں نے کہا۔

"جی سر! آپ جا سکتے ہیں۔" اس نے کہا اور میں سکون کی گہری سانس لے کر ولیم
ہاروے کے جہاز کی طرف بڑھ گیا جو مرمت کے لئے خشک گودی پر کھڑا ہوا تھا۔ اس
وقت بھی جہاز پر مرمت کرنے والوں کا ہنگامہ جاری تھا۔ لیکن جہاز کے فورمین کو یہ بات
سمجھانے میں کافی وقت صرف ہو گیا کہ میں جہاز پر جانا چاہتا تھا۔ یہ فورمین ایک نیا
آدمی تھا۔ ظاہر ہے ولیم ہاروے نے ہر شخص سے میری شناسائی نہیں کرائی تھی۔ لیکن اس

سے اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا مجھے کہ لیفٹیننٹ ہاروے اس جہاز پر موجود ہے۔ بس میں یہی کہتا رہا کہ یہ بحریہ کا جنگی جہاز ہے اور اس پر جانا میری اہم ضرورت ہے۔ لیکن فور مین آسانی سے مجھے اس کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ باہر کے کسی بھی آدمی کو جہاز پر جانے کا حکم نہیں ہے۔

''تو پھر تم یوں کرو کہ لیفٹیننٹ ہاروے کو یہاں بلا دو۔''

''سوری سر! یہ میری ڈیوٹی نہیں ہے۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا اور میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ میں عام حالات میں اس شخص سے نمٹ سکتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ میں اس وقت کسی قسم کا جھگڑا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میں اس جہاز پر پناہ لینے آیا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ یہاں میری موجودگی کا علم کم سے کم لوگوں کو ہو۔

میں نے بے بسی کی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ بحریہ کی وردی میں بہت سے انگریز افسر جہاز پر اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ مگر میری بد قسمتی کہ ولیم کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ وہ لوگ جو ادھر گشت کر رہے تھے وہ ڈارک پورٹ کے انجینئر وغیرہ تھے۔ اور سب سے زیادہ خطرہ انہی لوگوں سے تھا۔ بہرحال میں بے بسی کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ فورمین عجیب ضدی آدمی تھا۔ اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر وہیں منڈلانے لگا اور میں الجھنے لگا۔ یہاں زیادہ دیر تک کھڑے رہ کر بھی اپنی پوزیشن خراب نہیں کرنی تھی۔ میں جانتا تھا کہ گودی پر سکیورٹی والے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے موٹر سائیکل پر گشت کرتے ہیں۔ اب جو گشتی پارٹی یہاں سے گزرے گی تو فورمین یقیناً انہیں روک کر میرا معاملہ ان کے سامنے پیش کر دے گا۔ چنانچہ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ فور مین گردن اٹھا اٹھا کر دوسری سڑک پر دیکھتا جا رہا ہے۔ لازمی بات ہے وہ اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ حالانکہ سکیورٹی والے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ کیونکہ میں لیفٹیننٹ ہاروے سے ملنے آیا تھا۔ وہ جہاز پر جا کر تصدیق کر لیتے۔ لیکن میں اس صورت میں گشتی پارٹی اور جہاز کے بہت سے لوگوں کی نظر میں آ جاتا۔ آخر کار میں نے پریشانی کے عالم میں دور موٹر سائیکلوں کی آواز سنی۔ فور مین میری طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور بولا۔

''صاحب! یہ لوگ آپ کی ہیلپ کر دے گا۔ میں ان کو بول دیتا ہوں۔''

میں نے کھا جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھا اور غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔'' یہ بھی تمہاری ڈیوٹی نہیں ہے۔ میں خود ان سے بات کر لوں گا۔''

''او کے سر، جیسی آپ کی مرضی۔''

اس نے کندھے اچکا کر کہا لیکن بدبخت کا بچہ وہیں کا وہیں کھڑا رہا یہ ظاہر کرنے کے لئے سکیورٹی والوں سے بات کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں ہے۔ میں خود ہی موٹر سائیکلوں کی طرف بڑھا۔ مجبوری تھی۔ میں کسی بھی طرح اس صورتحال سے نہیں بچ سکتا تھا۔ فورمین بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جنہیں کوئی چھوٹا موٹا عہدہ بھی مل جائے تو اسے مسئلہ بنا لیتے ہیں اور دوسروں کی جان عذاب میں کر دیتے ہیں۔ دونوں موٹر سائیکلیں میرے پاس آ کر رک گئیں۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر جہاز کے عرشے پر نگاہ ڈالی۔ اب جو کچھ بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ اور پھر میں نے جو کچھ دیکھا اس سے مارے خوشی کے میری باچھیں کھل گئیں۔ میں نے اسی طرح سر اٹھائے اٹھائے پکار کر کہا۔

''ہیلو لیفٹیننٹ...... ہیلو ہاروے۔'' عرشے کی ریلنگ پر دونوں ہاتھ رکھے ولیم ہاروے کھڑا تھا اور نیچے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس شور وغوغا میں بھی اس نے میری آواز سن لی۔ اتنی صبح میرے اچانک پہنچ جانے سے اسے عجیب سی خوشی ہوئی اور مسخرے پن سے اٹینشن ہو گیا اور بھاری بھرکم آواز میں بولا۔

''ہیلو لیفٹیننٹ۔'' پھر اس نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔''بیوقوف کے بچے، نیچے کھڑے کیا کر رہے ہو؟ کم آن...... کم آن۔'' پھر اس نے جھک کر اشارہ کیا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے سکیورٹی والوں کو نظر انداز کر دیا۔ اب میں اس فورمین کی طرف متوجہ تھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ وہ فوجیوں کی طرح اٹینشن کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کی جانب گھور کر دیکھا تو اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''سس...... سر آپ نے بتایا نہیں تھا۔ آئی ایم سوری...... آئی ایم ویری سوری۔''

ولیم ہاروے ایک مسخرہ قسم کا آدمی تھا اس نے میرے ہی کہے ہوئے الفاظ دوہرائے تھے جس سے فور مین یہ سمجھا کہ میں بھی بحریہ کا لیفٹیننٹ ہوں اور اس وقت سویلین کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

''ویسے تم بہت ضدی آدمی ہو اور تم جیسے ضدی آدمی کے بارے میں سوچنا بہت ضروری ہے۔'' یہ کہہ کر میں جھولتے ہوئے گیٹ وے پر ماہر ملاحوں کی طرح چلتا چلا گیا۔ سکیورٹی والوں کی موٹر سائیکلیں وہاں سے روانہ ہو چکی تھیں۔

ولیم ہاروے میری آمد سے بہت خوش ہوا تھا۔ وہ رات بھر جاگ کر کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ حالانکہ ایسے دوست میرے لئے بہت زیادہ قابل توجہ نہیں ہوتے تھے لیکن بات تو یہ کہ ولیم ہاروے میرے کالج کا ساتھی تھا اور ہمارے درمیان ایک خصوصی دوستی ہو چکی تھی۔ دوسری بات یہ کہ اس وقت وہ میرے لئے ایک ناخدا ہی ثابت ہوا تھا۔ ڈارک پورٹ کے انجینئروں نے چارج سنبھال لیا تھا اور ولیم اپنے کیبن کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے پریشان ہو کر میرے چہرے پر چپکی ہوئی پٹی کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

"یہ کیا ہوا؟ خیریت؟"

"ہاں خیریت ہے۔ بس میرے دانت میں درد ہے۔"

"دانت میں درد ہے؟" ولیم حیرت سے بولا۔

"ہاں۔"

"تو یہ کیا لگایا ہوا ہے؟"

"یار! جو کچھ بھی لگایا ہوا ہے، ساری تفصیل اسی جگہ معلوم کر لو گے؟"

"نہیں، میں یہ کہہ رہا تھا کہ تو ڈاکٹر کیسے ہو گیا؟ دانت کے درد کا ایسا علاج تو نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ چلو آؤ میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر وہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے پیچ در پیچ راہداریوں سے گزرتا ہوا اپنے کیبن میں پہنچ گیا۔ ولیم واقعی ان دوستوں میں سے تھا جو اپنے یار کو اپنے وجود کی طرح رکھ لیتے ہیں اور اپنے وجود میں اتار لیتے ہیں، اس کے چہرے پر ایک شکن یا زیر لب مسکراہٹ سے اس کے قلب کی کیفیت لیتے ہیں۔ بہرحال اس وقت ولیم ہاروے کے لئے میں جو بھی کہوں کم ہے۔ وہ بہت اچھا دوست تھا۔ کیبن کا دروازہ بند ہوتے ہی ولیم کا چہکنا بند ہو گیا اور اس کے اس کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی طاری ہو گئی۔ اس نے کہا۔

"ہاں، آؤ بیٹھو اور مجھے بتاؤ کیا پریشانی ہے؟"

میں ولیم ہاروے کے اچانک ہی بدلے ہوئے انداز پر پریشان ہو گیا تھا۔ ابھی میں نے اسے کوئی بھی بات نہیں بتائی تھی۔ ویدا ہاؤس کا قصہ، اپنے کیریئر کی تباہی اس کے بعد یہ آخری کیل جو میرے تابوت میں ٹھک گئی تھی۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم اس حد تک بتا دینا بہت ضروری تھا کیونکہ مجھے اس سے مدد لینی تھی۔ میں نے اس سے

"ہاروے! میرے دانت میں درد نہیں ہے۔"

"اس کا اندازہ تو مجھے بھی ہو گیا ہے۔" وہ بدستور سنجیدگی سے بولا۔

"تو پھر تم پہلے میرے اس زخم کی ڈریسنگ کرو اور اس کے بعد مجھے ناشتہ کراؤ۔ پھر میں تمہیں اس کے بارے میں مزید تفصیل بتاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" ولیم ہاروے نے کہا اور اس کے بعد وہ فرسٹ ایڈ بکس نکال کر میرے زخم کی بینڈیج میں مصروف ہو گیا۔ لیکن اب اس کے اندر وہ کھلنڈرا پن نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ ایک تجسس نے لے لی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے ناشتے کا بندوبست بھی کر دیا اور اس دوران مجھے موقع مل گیا۔ میں نے ذہن میں ایک کہانی ترتیب دے لی۔ یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ بھوج پتر کا ذکر میں اس سے نہیں کروں گا لیکن باقی ساری کہانی اسے سنانا ضروری تھی۔ چنانچہ ناشتے کے دوران میں نے اسے کلکتے سے بمبئی تک کی پوری داستان سنا دی۔ ولیم ہاروے کی ساری شوخی ختم ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت پھیلی ہوئی تھی کیونکہ بہرحال یہ ایک مجرم کی داستان تھی۔ ولیم کے ذہن و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس قدر جلد میری زندگی میں ایسے انقلاب آ جائیں گے۔ پھر ولیم بھی راہبوں کی زندگی نہیں گزارتا تھا۔ اس کے بھی معاملات تھے، لڑکیاں اور شراب جیسی چیزیں اس کی زندگی کا ایک حصہ تھیں خاص طور سے اس لئے بھی کہ وہ ایک یورپین تھا۔ لیکن ایلس فیوری کا واقعہ اور اس کے بعد کریم خان کا قتل سو فیصدی یہ قتل ہی تھا۔ اگرچہ ولیم اسے حادثہ کہہ رہا تھا لیکن بہرحال یہ باتیں ایسی تھیں کہ ولیم بہت دیر تک سناٹے میں رہا۔ مجھے اس کی خاموشی سے وحشت ہونے لگی۔ اگر اپنی ملازمت کی مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے اس نے مجھے جہاز پر پناہ دینے سے پرہیز کیا تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟ اور آخری فیصلہ میں نے یہی کیا کہ اس سلسلے میں، میں اپنے دوست کو بہت زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔ ایک ایسے مجرم کو جس کو اس وقت بمبئی کی پولیس پوری تندہی سے تلاش کر رہی ہو گی۔ اگر وہ پناہ نہیں دینا چاہتا تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں اگر خود بھی اس کی جگہ ہوتا تو شاید اس سلسلے میں خاصی پس و پیش کرنا پڑتی۔ بہرحال یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ دیکھوں گا تقدیر تو اس کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ اور فیصلہ آخر کار تقدیر ہی کرتی ہے۔ لیکن ایک لمحے کے اندر مجھے محسوس ہوا جیسے ولیم نے میرے چہرے کے تاثرات پڑھ لئے ہیں۔ وہ میرے خیالات کو سمجھ گیا ہے۔ اور اس کے بعد اس کی آواز ابھری۔

"نہیں مائی ڈیئر خاقان! مجھے غلط مت سمجھنا۔ تم اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ یقین

رکھتے ہو کہ اگر مجھے اس وقت وردی اتار کر تمہارے ساتھ فرار ہونے کی ضرورت پیش آ تو میں ایک لمحے کی دیر کئے بغیر وردی پھینک کر تمہارے ساتھ چل پڑوں گا۔ بات یہ ہے جو اس وقت سمجھ رہے ہو۔ میں نے تمہارے چہرے سے تمہاری دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں، ہر پہلو پر غور کر رہا ہوں۔ میں ذرا فیصلہ کر رہا ہوں بہرحال تمہیں اس جہاز میں اس وقت تک رہنا ہے جب تک ہم اس سے بہتر کوئی انتظام نہ کر لیں۔ میں اس وقت اس جہاز کا......'' اس نے کیبن کی دیوار پر ہاتھ مارا اور بولا۔ '' ذمے دار افسر ہوں۔ کم از کم پندرہ دن تک ہمیں اس پر اس گودی پر رہ کر کام کرنا ہے یہ پندرہ دن تو تم میرے جہاز میں گزارو۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ کیا سمجھے؟''

میں نے ممنونیت سے ولیم ہاروے کا چہرہ دیکھا اور وہ میرے شانوں پر ہاتھ رکھتا بولا۔ ''تم مجھے صرف ایک دوست ہی نہ سمجھو۔ یوں سمجھو کہ میں اس وقت تمہاری ہر مشکل ایک حصہ ہوں۔ اصل میں، میں تمہارا چوبیس گھنٹے کا پروگرام ترتیب دے رہا تھا۔ جہاز انچارج ہونے کی بنا پر کیپٹن کی واپسی تک مجھے برج پر کیپٹن کے کیبن میں رہنے کا حق حاصل ہے۔ وہاں مرمت کا کام ختم ہو چکا ہے۔ ڈارک پورٹ کا عملہ اپنے کام سے سروکار رکھتا ہے۔ وہ لوگ برج پر اب نہیں جا سکتے۔ باقی بات دوسروں کی رہ جاتی ہے جیسے میرا اردلی اور باورچی تو یہ دونوں میرے وفادار ہیں، تم بالکل بے فکر رہو۔ میں صرف اس سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ اس کے بعد ہمیں کیا کرنا ہے۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔''

''کیا......؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ بات تو میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اب کم از کم پندرہ دن تک تو تم اس جہاز پر ہو باقی رہا ان دونوں کا مسئلہ تو میں انہیں سمجھا دوں گا کہ تم کسی خفیہ سرکاری مشن پر یہاں ٹھہرے ہوئے ہو اور کسی کو تمہاری موجودگی کا علم نہیں ہونا چاہئے۔ یہ جاننے کے بعد یہ دونوں کسی سے ذکر کرنا تو دور کی بات ہے، تمہارے بارے میں آپس میں باتیں کرنے سے بھی گریز کریں گے۔ مجھے ان پر مکمل اعتماد ہے۔''

ولیم کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی جو کبھی شاذ و نادر ہی اس کے چہرے پر نظر آتی تھی، اس وقت میری ڈھارس بندھا رہی تھی۔

یہ رات میرے لئے بڑی بھیانک رات گزری تھی اور میں بہت سی سوچوں میں تھا۔ میں جانتا تھا کہ برائی کا انجام تو بہرحال برائی ہی ہوتا ہے۔ لیکن کسی برائی کا نتیجہ

قدر جلد نمودار ہو سکتا ہے یہ شاید کسی کسی نے ہی دیکھا ہوگا۔

ولیم ہاروے نے میرے لئے انتظام کر دیا۔ منصوبے کے مطابق موقع دیکھتے ہی اس نے مجھے برج پر کیپٹن کے کیبن میں پہنچا دیا تھا۔ اس نے اپنے اردلی اور باورچی کو بلا کر اپنا سامان بھی اسی کیبن میں منگوا لیا تھا۔ مرمت کرنے والوں کا شور اگرچہ کافی تھا مگر نیچے کی طرح یہاں اتنی تیز آوازیں نہیں آ رہی تھیں اور کسی قدر سکون تھا۔ ولیم نے اپنے بہت سے کپڑے میرے حوالے کر دیئے اور بولا کہ اب میں کچھ آرام کر لوں۔ میں واقعی یہ محسوس کر رہا تھا کہ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں لباس تبدیل کر کے کیپٹن کے بستر پر دراز ہو گیا۔ میرے تھکے ہوئے اعصاب چیخ چیخ کر نیند نیند پکارنے لگے اور میں گہری نیند سو گیا۔ کیبن کے پردے کھینچ کر تاریکی کر دی گئی تھی۔ پورٹ ہول بھی بند تھے۔ میں نجانے کب تک سوچتا رہا۔ ذہن اپنے طور پر سفر کر رہا تھا اور اس کے بعد مجھے اپنی ہی آواز سنائی دی۔

''انیک دکھ، انات نمو...... ست نمو...... بدھا، انیک دکھ، انات نمو...... ست نمو...... بدھا......'' یوں لگا جیسے یہ آواز صدائے بازگشت کی طرح برسوں کا زمانہ اور میلوں کی مسافت طے کر کے میرے پاس آئی ہو۔ میں نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔ پتہ نہیں میں جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا۔ یہ آواز میں نے لنکا کی گاشر بھرم کی پہاڑیوں میں سارتھی کے دھار میں سنی تھی اور اسے پوری طاقت سے اپنی زبان سے بھی دوہرایا تھا۔ مفہوم ان الفاظ کا کچھ یوں تھا کہ بے شک سب فضول ہے۔ دنیا دکھوں سے بھری ہوئی ہے اور یہ دکھ کہیں اور سے نہیں آتے ہم خود اپنے لئے دکھ بوتے ہیں اور دکھوں کی فصل کاٹتے ہیں۔ دکھ ہمارا لباس ہیں، ہماری غذا ہیں، ہمارا سایہ اور ہمارا مقدر ہیں۔ اور یہ بات بالکل سچ تھی۔ ذرا سا غور کیا جاتا تو صورتحال واضح ہو جاتی۔ ایلس فیوری کی زبان بند کرنے کے لئے وہ سارا کھیل ہوا تھا۔ اس وقت تو خیر زندگی بچانے کا مسئلہ تھا لیکن اب کیا تھا۔ اپنی ہوس، اپنی خواہشیں، اپنا عمل، اپنے لئے جہنم کے راستے کھولنا۔ واقعی ہم دُکھ کی فصل بوتے ہیں اور غم کی فصل کاٹتے ہیں۔ کیا سچ بات تھی۔ مکمل سچ۔ بھلا کیا ضروری تھا کہ عالیہ کی زندگی میں مداخلت کر کے اپنے لئے مصیبت مول لی جائے۔ بے چارہ آدم زمان تو میرے لئے کسی بھی طرح تکلیف دہ نہیں بنا تھا اور میں نے اس سے غداری کی تھی بلکہ میرا اس سے تعلق ہی غداری کا نتیجہ تھا۔ صرف ایک بدن کو کچھ لمحوں کے لئے حاصل

کرنے کے لئے میں نے یہ مکروہ زندگی اپنائی تھی۔ سچ ہی تو ہے کہ دُکھ ہمارا لباس ہے، ہماری غذا ہے، ہمارا سایہ اور ہمارا مقدر ہے۔ یقینی طور پر وہ میرا بہت اچھا دوست ہے جو نہ میرا ہم وطن ہے، نہ میرا ہم مذہب۔ ایک ایسی قوم سے اس کا تعلق ہے جو برائی اور بدکاری میں اپنا بڑا نام رکھتی ہے۔ لیکن یہ شخص آج تک بے داغ ریکارڈ کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرتا رہا ہے۔ پتہ نہیں میری وجہ سے اس پر کیا کیا مصیبتیں نازل ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میری وجہ سے کتنے مسائل کا شکار ہو جائے، کتنی مصیبتیں جھیلے یہ۔ اگر اس کا کیپٹن یا کوئی اور اعلیٰ افسر میرے ہوتے ہوئے جہاز پر آ جائے تو لیفٹیننٹ ولیم ہاروے ایک ایسے مفرور ملزم کو جس پر قتل کا الزام ہے پناہ کے جرم میں بڑے مسائل میں گرفتار ہو جائے۔ کورٹ مارشل اور بدنامی اور سزا اس جیسے باعزت عہدے دار کا مقدر بن جائے گی۔ صرف میری وجہ سے۔ میں غلط کار آدمی ہوں اور میں نے اپنی حیوانی خواہش کی تسکین کے لئے ایک ایسی عورت کا انتخاب کیا جس کی زندگی مسائل میں پڑ کر خود مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ آہ...... واقعی یہاں آ کر میں نے ولیم ہاروے کے لئے پریشانیاں پیدا کر دی ہیں۔ اب بھی وقت ہے، ابھی کچھ نہیں گیا۔ پولیس میری تلاش میں ضرور ہے لیکن اخبارات میں ابھی تک میرے خلاف کوئی خبر نہیں آئی ہے۔ ہو سکتا ہے بعد میں میرا ایک مفرور ملزم کی حیثیت سے حلیہ چھپ جائے۔

آہ...... ابھی وقت ہے...... ابھی وقت ہے۔ اگر میں خاموشی سے اٹھ کر کپڑے بدل کر یہاں سے باہر نکل جاؤں تو ولیم کی ہموار زندگی سے میری نحوست کی پرچھائیاں دور ہو جائیں گی۔ اگر ناکہ بندی نہیں ہوئی ہے تو میں یہاں سے کہیں نہ کہیں نکل جاؤں گا۔ بمبئی سے وکٹوریہ ٹرمینل جانے والی گاڑی میں سوار ہو کر پونا چلا جاؤں گا اور پونا میں اس جگہ پناہ لوں گا جہاں ماموں جان رہتے ہیں اور ان کے پاس میری ماں ہے۔ ماں پھر ماں ہوتی ہے۔ میں کتنا ہی غلط کار سہی لیکن مجھے ایک دفعہ پھر معاف کر دے گی۔ آہ۔ میں اپنی ماں سے معافی مانگ لوں گا۔ حالانکہ امی نے میری پہلی غلطی کب معاف کی ہے جو اس دوسری غلط کاری کو درگزر کرنے کا سوال پیدا ہو۔ پھر میں نے سوچا کہ میں گڑھی چلا جاؤں گا۔ میرے باپ کا وہ خاص ملازم بہت دانش مند آدمی ہے۔ میرے بے شمار فارموں میں سے کسی ایک فارم میں یا رہائش گاہ میں میرے چھپنے کا بندوبست ہو ... کہیں ... ہو لیکن میں کم از کم رتنا گڑھی میں محفوظ رہوں گا۔ وہ تو میری

سلامت ہے۔ لیکن اصل مسئلہ بمبئی سے نکلنے کا ہے۔ اگر ریلوے اسٹیشنوں پر نگرانی ہوئی تو میرا بچ نکلنا ممکن نہیں ہو گا اور مجھے یقین ہے کہ بمبئی پولیس کے کتنے ہی سادہ لباس آدمی ریلوے اسٹیشنوں پر موجود ہوں گے۔ میں گھنٹوں میں ہی دھر لیا جاؤں گا۔

یہ خیالات پتہ نہیں خواب کی شکل اختیار کر چکے تھے یا خواب نہیں، میرے ذہن میں ایک چرخی سی گردش کر رہی تھی۔ شاید میں سو بھی نہیں رہا تھا۔ وہ آواز جو مجھے سنائی دی تھی، نیند کے عالم میں نہیں تھی بلکہ حقیقت تھی۔ انیک دکھ، اناتھ نمو، ست نمو، بدھا! آہ..... یہ آواز مسلسل میرا تعاقب کر رہی تھی۔ یہ تو ایک نیک آواز تھی۔ تیکیون کے راستے پر لے جانے والی آواز۔ نہیں، مجھے اس آواز سے چھٹکارا پانا چاہئے۔ میں جھنجھلا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے طے کر لیا کہ میں پکڑا جاؤں یا بچ نکلوں، یہ میرا اور صرف میرا مسئلہ ہو گا۔ مجھے یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہوتا کہ اپنی وجہ سے ولیم کی زندگی کو الجھنوں میں ڈالوں اور اس کی خوبصورت زندگی کو تباہ کر دوں۔ یہ تو دوستی کا حق نہ ہوا۔

میرے اندر ایک شدید ہیجان برپا تھا۔ دل و دماغ کے درمیان شدید کشمکش ہو رہی تھی اور یہ کشمکش اس قدر حیثیت اختیار کر گئی کہ میں نے بستر سے اٹھ کر خاموشی سے کپڑے بدلے، جوتے ہاتھ میں لئے اور کیبن کے دروازے پر پہنچ گیا۔ لیکن جیسے ہی میں نے کیبن کا دروازہ کھولا ولیم مجھے اپنے سامنے کھڑا نظر آیا۔ میں اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ولیم کا بھرپور قہقہہ فضا میں گونجا۔ میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس نے مجھے زور سے اندر دھکا دیا اور خود بھی اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

"تم کو ایک بھرپور نیند کی ضرورت ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ تمہیں نیند نہیں آ رہی۔ جب بے خوابی ذہن و دل پر حماقتیں پیدا کر دیتی ہے تو انسان ایسے ہی فیصلے کرتا ہے اور میں ایک بیوقوف آدمی نہیں ہوں بلکہ دنیا شناس ہوں۔ میں جانتا تھا کہ تم بھاگنے کی کوشش کرو گے۔ چلو ایک بار پھر کپڑے اتارو اور میرے سامنے اتارو۔ میں اپنا کام ختم کر کے آیا ہوں اور اب میں بھی تمہارے ساتھ سونے کی کوشش کروں گا۔ لیٹو یار! کپڑے تبدیل کرو۔ کیا فضول باتیں ہیں۔ مجھے بھی سونے دو۔ میں بھی تھکا ہوا ہوں۔ یقین کرو رات بھر جاگ کر ڈیوٹی انجام دی ہے۔ میں تو بس لوگوں کو کام سمجھانے کے لئے تمہارے پاس سے چلا گیا تھا۔"

ولیم نے ایک بار پھر کہا۔ "احمق آدمی! جو کچھ تم سوچ رہے ہو نا اس پر بعد میں تم سے

تفصیلی گفتگو ہوگی یار! یقین کرو میں تھکا ہوا ہوں اور اب اور کچھ نہیں کہوں گا سوائے اس کے کہ کپڑے بدلو اور لیٹ جاؤ۔ جب تک میں تم سے تفصیلی گفتگو نہ کرلوں اس وقت تک یہاں سے بھاگنے کی کوشش مت کرنا اور بھاگنا چاہو تو بھاگ بھی نہیں سکو گے۔ کیونکہ باہر سکیورٹی ہے اور وہ تمہیں جانے نہیں دیں گے۔ پلیز!"

میرے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ بڑا مکار ہے یہ شخص بھی۔ میں نے دل میں سوچا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی ہلکی سی نمی آ گئی تھی۔ مگر میں نے ولیم کو آنکھوں کے آنسو نہ دیکھنے دیئے اور دل میں سوچا کہ کیا واقعی مجھے اتنا سچا دوست حاصل ہے۔ بہرحال خاموشی سے کپڑے تبدیل کئے اور اس احساس کے ساتھ سو گیا کہ ولیم نے مجھے پناہ دے کر جو خطرہ مول لیا ہے وہ اس کے نتائج بھی خوب جانتا ہے اور ہمت کے ساتھ ہر مصیبت بھگتنے کو تیار ہے۔

شام کو چار بجے اردلی نے کیبن کے دروازے پر دستک دی۔ ولیم بیدار ہو چکا تھا۔ وہ غسل خانے میں تھا۔ اس نے غسل خانے کا دروازہ کھول کر چابی باہر اچھال دی۔ اردلی کھانے کا سامان اور شام کے سارے اخبارات لایا تھا۔ طبیعت اندر سے متلائی متلائی سی ہو رہی تھی۔ چائے کے ساتھ اور بھی بہت سے لوازمات تھے۔ مگر مجھ سے نہ کھائے گئے۔ میں نے صرف چائے پی۔ شام کے تمام اخبارات نے اس واقعے کو نمایاں طور پر لکھا تھا اور میری نگاہیں ان خبروں پر جم گئی تھیں۔ آہ، وہی ہوا تھا جو میں نے سوچا تھا۔ لکھا تھا۔

"ایک مقامی فرم کا تیس سالہ ڈرائیور کریم خان رات کے وقت ایک ہوٹل کی چھت سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ پولیس کا شبہ ہے کہ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ایک نوجوان رئیس زادہ خاقان جمشیدی اس ہلاکت میں ملوث ہے۔ رات ہی سے خاقان جمشیدی بھی لاپتہ ہے۔ پولیس نے ہوٹل کے اس کمرے کو سیل کر دیا ہے جس میں خاقان جمشیدی ٹھہرا ہوا تھا۔ بہت ہی سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔"

اس کے بعد بمبئی کی پولیس کے ان افسروں کے نام لکھے تھے جو اس واقعے کی تحقیقات کر رہے تھے۔ ان خبروں کو کئی بار پڑھ کر میں نے ایک گہری سانس لی۔ دولت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ وہ دولت مند بھی تھا لیکن میں تو ایک پراسرار مشکل کا شکار تھا اور صحیح معنوں میں میری اپنی شخصیت کبھی کی کھو چکی تھی۔ بارہا یہ خیال میرے دل میں آتا کہ اگر میں اپنی ریاست، اپنی جاگیر، اپنی مملکت کو سلیقے سے سنبھالتا جیسا کہ میرے والد

صاحب نے میرے لئے ابتدا کی تھی اور انتہائی مجبوری کے عالم میں بھی مجھے کلکتہ بھیج کر میری تعلیم مکمل کرائی تھی، ظاہر ہے اس کے بعد میں سیتا گڑھی پہنچ کر اپنی جاگیریں ہی سنبھالتا اور صحیح معنوں میں کسی بھی طرح میں سیٹھ آدم زمان سے کم نہ ہوتا۔ سیٹھ آدم زمان تو صرف ایک کاروباری آدمی تھا۔ ایک عام قسم کے کاروباری آدمی اور جاگیردار میں فرق ہوتا ہے۔ میری حیثیت اس سے ہزار گنا زیادہ بہتر ہوتی۔ لیکن تقدیر نے مجھے ایک ایسے ہولناک جال میں گرفتار کر لیا تھا جس سے نکلنے کی کوئی صورت میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کبھی کبھی تقدیر ایسے ہی کھیل کھیلتی ہے اور انسان نجانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔

اخبار کی خبر میں ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ کریم خان کو ایک مقامی فرم کا ڈرائیور بتایا گیا تھا اور کہیں بھی آدم زمان کا کوئی حوالہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے آدم زمان کی مکمل حمایت کی گئی تھی اور اسے ان معاملات میں ملوث نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ اب تو میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ پولیس نے آدم زمان یا عالیہ زمان سے یہ بھی نہ پوچھا ہو گا کہ میں ان کا دوست رہا ہوں یا نہیں۔ وہ بڑے آرام سے ان سارے معاملات سے بچ گئے تھے۔

آگے چل کر لکھا گیا تھا کہ خاقان کی تلاش جاری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی میرا تفصیلی حلیہ بھی درج تھا۔ ولیم نے غالباً پہلی بار میرے چہرے کے تاثرات دیکھے اور محسوس کیا کہ ان اخبارات کی خبریں پڑھ کر میں اُلجھن میں گرفتار ہوں۔ چنانچہ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے تمام اخبارات میرے سامنے سے دور پھینک دیئے اور ہنستا ہوا بولا۔

"دنیا ختم نہیں ہو گئی ہے میری جان! کیا سمجھے؟ ان اخبارات میں چھپی خبروں پر بالکل توجہ نہ دو۔ تمہارا یار زندہ ہے، مجال ہے کسی کی کہ تمہاری طرف ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھ جائے۔ ابھی پندرہ دن تو اس جہاز پر آرام سے رہو۔ اس عرصے میں یہ گرماگرمی ختم ہو جائے گی۔ پولیس ہر وقت تو ناکہ بندی نہیں رکھ سکتی۔ کیپٹن کو جہاز کا چارج دینے سے پہلے میں تمہیں بمبئی سے نکال کر لے جاؤں گا اور کسی بھی ایسے علاقے میں پہنچا دوں گا جہاں تمہیں مکمل تحفظ مل جائے۔ تم بے فکر رہو، میں وہ متعصب انگریز نہیں ہوں جو ہندوستان پر حکومت قائم کر کے اپنے آپ کو بڑا تیس مار خان سمجھتا ہو گا۔ میں ایک دوست کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں تم سے۔ بہت سی جگہ میرے ایسے جاننے والے موجود ہیں جو تمہاری بھرپور مدد کریں گے۔ بس ان سے ایک بار کہہ دینا کافی ہے۔ میرا باورچی

گوا کا رہنے والا ہے۔ وہ گوا میں تمہارے رہنے کا بندوبست کر دے گا۔ وہاں سے اسمگلروں کی لانچیں تمہیں با آسانی سری لنکا پہنچا دیں گی۔ اس کے بعد پورا یورپ پڑا ہے، افریقہ ہے، جہاں بھی دل چاہے نکل جانا۔ کچھ دن بیرونی ملکوں کی سیر کر لو، تمہارا جی بھی بہل جائے گا اور زندگی کے کچھ اور تجربات حاصل ہو جائیں گے اور...... اور......" اس نے خوش دلی سے ایک آنکھ دبائی اور بولا۔ "اور لڑکیاں بھی ملیں گی۔ دولت کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے پھر پریشانی کس بات کی ہے۔ کیا سمجھے؟" وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور میں سوچنے لگا کہ انسان کہیں بھی مل سکتے ہیں۔ ان کا تعلق کسی بھی نسل، کسی بھی قوم سے ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک انفرادی عمل ہے کہ کون کس حد تک اچھا ہے اور کس حد تک برا۔ ولیم بہرحال ایک اچھا دوست تھا جس پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ وہ مجھے ایسے دلاسے دے رہا تھا جیسے کوئی ننھے سے بچے کو بہلاتا ہے۔ پھر اس نے کہا۔

"اب اٹھو اور نہا دھو کر تیار ہو جاؤ۔ میں باہر جاتا ہوں۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے اپنے بارے میں سوچا۔ ولیم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے غلطیوں پر غلطیاں ضرور کی ہیں لیکن زندگی سے کچھ سیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

بہرحال پانچ بجے تک جہاز پر ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔ ڈارک پورٹ کے کاریگر اور مزدور دن بھر کی مصروفیت ختم کر کے جا چکے تھے۔ میں نے کیپٹن کے آرام دہ کیبن میں غسل وغیرہ کیا، کپڑے تبدیل کئے۔ کپڑوں کا مسئلہ میرے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ ظاہر ہے اس ایک جوڑے کو میں کب تک چلا سکتا تھا؟ بہرحال میں کیبن کے سناٹے میں بیٹھا سوچتا رہا اور آگے کے منصوبے بناتا رہا۔ بازار جا کر اپنے لئے کپڑے اور دوسرا سامان لانا ممکن نہیں تھا۔ بہرحال میرے پاس کافی رقم موجود تھی اور اس سلسلے میں مجھے ولیم کی مدد درکار تھی۔ اس کے علاوہ باورچی یا اردلی کو اس سے زیادہ اعتماد میں لینا بھی مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ یہ کام صرف اور صرف ولیم کر سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ ولیم آ جائے تو اس سے بات کروں گا اس بارے میں۔

پھر کیبن کے دروازے پر مخصوص انداز کی دستک ہوئی۔ یہ میرا اور ولیم کا لڑکپن کا کھیل تھا۔ کالج، ہوسٹل میں ہم نے امتحانوں کی تیاری کے دوران یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا تھا کہ اگر ہم اپنے کمرے میں پڑھ رہے ہوں اور دوسرے لڑکے ہمارا وقت آ کر

دوسرا کمرے سے باہر گیا ہوتا تو باہر والے کو کمرے میں آنے کے لئے مخصوص اشارہ دینا پڑتا تھا ورنہ دروازہ نہیں کھلتا تھا۔ اب جب کیبن کے دروازے پر وہی دستک ہوئی تو میں نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ باہر ولیم نہیں تھا بلکہ اس کا اردلی کھڑا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے اندر بات میری سمجھ میں آ گئی۔ ولیم نے خفیہ سرکاری مشن والی بات نبھانے کے لئے اردلی کو اس کھیل میں شریک کر لیا تھا۔

"ہاں...... کیا بات ہے؟" میں نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

"سر! مسٹر ولیم کسی کام سے جہاز سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ سات بجے تک آ جائیں گے۔ اگر آپ پسند کریں تو ڈیک پر جا کر بیٹھ سکتے ہیں۔ سارا انتظام ہو گیا ہے۔"

"کیا انتظام ہو گیا ہے؟"

"سر! جہاز پر اب یا تو میں ہوں یا باورچی۔ اور گیٹ وے پر حسب معمول بحریہ کا گارڈ ڈیوٹی دے رہا ہے۔"

"کیا ولیم نے تمہیں اس بات کی ہدایت کر دی تھی؟"

"جی سر۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر آپ ڈیک پر آنا چاہیں تو میں آپ کو اس بارے میں مطمئن کر دوں۔" اردلی نے جواب دیا۔

میں واقعی کیبن میں بند تنگ ہو گیا تھا۔ ویسے بھی فاسد خیالات نے دل و دماغ پر ایسے برے اثرات مرتب کئے تھے کہ طبیعت پر بوجھ ہی بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ کھلی فضا میں جا کر سانس لینے کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ ولیم میرا دوست، میری جان میرے لئے سینہ سپر ہو گیا ہے۔

بہرحال میں ڈیک پر پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ اردلی نے دو تین کرسیاں اور میز لگا دی ہے۔ سینٹر ٹیبل پر پانی کا گلاس اور جگ رکھا ہوا ہے۔ اس نے کہا۔

"سر! میں آپ کو بہترین کافی پیش کر سکتا ہوں اگر آپ پسند کریں۔"

"پلا دو یار! تم سب لوگ سونے سے بنے ہوئے ہو۔" میں نے جواب دیا۔

شام بڑی پُر فضا تھی۔ کئی گھنٹے کیبن میں بیٹھنے کے بعد مجھے اس طرح ہوا میں بیٹھنا اچھا لگا۔ دل میں کچھ اعتماد بھی پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ ولیم ہاروے نے میرے لئے جو تحفظ فراہم کیا تھا [illegible] ملکی جہاز پر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان لوگوں

کے حساب سے ایک قاتل چھپا بیٹھا ہوگا۔

میری نگاہ دور بندرگاہ پر کھڑے ہوئے تجارتی جہازوں کی روشنیوں پر پڑی اور میں نجانے کیا سے کیا سوچنے لگا۔ شاید اسی شام عالیہ زمان یورپ کے دورے پر روانہ ہوگئی ہوگی۔ یہ شام کا وقت تھا جب سمندر کا پانی چڑھتا ہے تو بڑے مسافر بردار جہاز عام طور پر شام ہی کو روانہ ہوتے ہیں۔ یقیناً عالیہ اس وقت اپنے فرسٹ کلاس کیبن میں شام کی مصروفیتوں کے لئے لباس بدل رہی ہوگی۔ آہ کیا عورت ہے، آگ کی طرح گرم اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے زندگی کی بازی لگا دینے والی۔ میرے بارے میں اسے اس بات کا علم تو ہو گیا ہوگا کہ میں کس طرح عذاب میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ کیا تاثرات ہوں گے اس کے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک منظور نظر اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ کیا عجیب دنیا ہے۔ کس طرح اسے بچانے کے لئے کریم خان کو کسی مقامی فرم کی کسی گاڑی کا ڈرائیور بتایا گیا ہے حالانکہ حقیقتیں بہت الگ تھیں۔

آرام دہ کرسی پر پڑا ہوا میں انہی خیالات میں محو تھا کہ ولیم آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے کاغذ کے بہت سے تھیلے اور ڈبے اٹھائے ہوئے اس کا اردلی تھا۔ ولیم نے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یقیناً تمہاری کیفیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم بہت دیر سے یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔“

”ہاں...... کافی دیر ہوگئی۔“

”تو پھر آؤ اُٹھو، کیبن میں چلتے ہیں۔ آ جاؤ۔“

میں خاموشی سے کھڑا ہوا اور اردلی اور ولیم کے ساتھ برج کی طرف بڑھ گیا۔

کیبن میں پہنچ کر اردلی نے اپنے ساتھ لائے ہوئے پیکٹ اور ڈبے بستر پر ڈھیر کر دیئے۔ ولیم مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اردلی واپس چلا گیا تو وہ آگے بڑھا اور اس نے ڈبے اور تھیلے کھولنا شروع کر دیئے۔ میں دلچسپی سے اس کا یہ عمل دیکھ رہا تھا۔ اور پھر میں نے آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس لی۔ ولیم میرے لئے کپڑے، جوتے، بنیان اور ایسی ہی دوسری چیزیں لے کر آیا تھا۔ درحقیقت میرا دل چاہا اس وقت کہ میں سسکیاں لے کر رو پڑوں۔ بہت عرصہ ہو گیا تھا...... بہت ہی عرصہ ہو گیا تھا۔ وقت نے مجھے جن حالات کا شکار کر دیا تھا ان میں میرا اپنا کتنا دخل تھا۔ اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو میں ایک معصوم سا آدمی تھا اور اس وقت بھی اپنے آپ کو معصوم سمجھتا تھا۔ براہ را

قوتوں کے دائرے میں آ کر میں نجانے کہاں سے کہاں نکل گیا تھا ورنہ نہ تو میں کردار کا برا تھا نہ گفتار کا۔ یہ ظالم کس طرح کا دوست ہے کہ میرے سوچنے سے پہلے سارے انتظامات کر دیتا ہے۔ ایسے دوست اس کائنات میں کہاں ہوتے ہیں؟ میں نے یہ بھی دیکھا کہ تمام چیزیں میری پسندیدہ تھیں۔ جوتے پیروں میں اس طرح فٹ تھے کہ بیان سے باہر ہے اور کپڑے بھی میرے بدن پر بالکل ٹھیک تھے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔

”تم شاید یہ بات بھول رہے ہو کہ میرے اور تمہارے جسم اور پیروں کا ناپ ایک ہے۔ انیس بیس کا بھی فرق نہیں ہوگا۔ کیا سمجھے؟ تمہیں یاد ہے کہ اکثر ہم ایک دوسرے کے کپڑے پہن لیا کرتے تھے۔ اور یار، میں تمہیں ایک بات اور بتاؤں، ٹھیک ہے جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہمارے تمہارے درمیان مذہب کا فرق ہے لیکن نجانے کیوں مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرا دل تمہارے سینے میں اور تمہارا دل میرے سینے میں دھڑکتا ہو۔“

”میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا ولیم! کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔“ میری آواز رندھی ہوئی تھی۔

اس نے بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لیا اور بولا۔

”دیکھو...... ہم لوگوں کے درمیان بھی کوئی پردہ داری نہیں رہی۔ ہماری دوستی ایک مثال کہی جاتی تھی۔ اب اس میں کون سا ایسا کوئی بڑا فرق آ گیا کہ تمہاری آنکھوں میں آنسو آ جائیں۔ اچھا ہاں، ایک بات سنو۔ یہ میں تمہیں بتا دوں کہ شیونگ کٹ میں جان بوجھ کر نہیں لایا ہوں کیونکہ اب تم شیو نہیں کرو گے۔ تمہیں داڑھی بنانی ہے۔ میرا مطلب ہے داڑھی بڑھاؤ گے۔ اس طرح سے تمہارے حلیے میں خاصی تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔“

میں چونک پڑا۔ میں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس قدر چھوٹی چھوٹی تفصیلات پر بھی اس شخص کی نظر ہے۔ مجھے واقعی یہ بات بڑی پسند آئی تھی۔ دس بارہ دن میں مجھ جیسے ریچھ نما آدمی کی داڑھی اتنی ضرور بڑھ جائے گی کہ میرا حلیہ بدلنے میں مددگار ثابت ہو۔

اب ولیم کے ایک ایک عمل پر مجھے مکمل اعتماد ہو گیا تھا اور میں جانتا تھا کہ زندگی بچانے کے لئے قدرت نے میرے لئے ولیم کا انتظام کر دیا ہے۔ چنانچہ میں نے خود کو جہاز کی زندگی کے مطابق ڈھال لیا۔ میرا زیادہ وقت کیپٹن کی لائبریری میں گزرتا تھا۔

ولیم کے کیپٹن کو یقینی طور پر اچھی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ اس کی لائبریری میں ایک
ایک کتاب موجود تھی۔ جتنی دیر تک ڈارک پورٹ کا انجینئرنگ کا عملہ جہاز پر کام کرتا رہ
کیبن میں رہتا۔ آٹھ آٹھ گھنٹے پڑھتا رہتا۔ سو جاتا۔ ولیم مجھے آ کر جگا دیتا۔ میری د
اب ولیم، اردلی، باورچی اور کیبن تک محدود ہوگئی تھی۔ یہ لوگ اس طرح میرا خیال رکھ
تھے جیسے میں کوئی شہنشاہ ہوں اور یہ سب میرے غلام۔ میری ایک ایک ضرورت پر نگا
رکھی جاتی تھی۔ چنانچہ دس دن اتنے آرام سے گزر گئے کہ بیان سے باہر ہے۔ ولیم
پابندی سے صبح شام کے اخبارات منگواتا تھا اور ان اخبارات میں میری خبریں نظر آتی
تھیں۔ کمبخت مجھے ابھی تک نہیں بھولے تھے۔ ویسے پولیس کی کارروائیاں تھیں اور پولیس
رتنا گڑھی تک پہنچ گئی تھی۔ یہ خبر میرے لئے انتہائی روح فرسا تھی کہ میری شہرت میرے
اپنے گھر پہنچ گئی تھی اور ظاہر ہے میرے تمام عزیز و اقارب وہ جو میرے خاندان کی عزت
کرتے تھے اب میرے بارے میں لاکھوں قسم کی چہ میگوئیاں کر رہے ہوں گے۔ نجانے
کیا کیا کہانیاں منسوب کی جا رہی ہوں گی میری ذات سے۔ اور پھر میرے والد کی تو
بہت سی بیویاں تھیں، ان کے اپنے خاندان تھے۔ کیا شہرت حاصل ہو رہی ہوگی مجھے۔

ویسے کریم خان کی موت کے دس دن بعد اخبارات نے وہ تصویریں بھی چھاپ دی تھیں اور یہ بڑی پریشان کن بات تھی۔ ذرا سی ڈھارس بندھانے کے لئے اتنا ضرور تھا کہ پولیس کو رتنا گڑھی سے جو تصویریں ملی تھیں وہ سب میرے طالب علمی کے زمانے کی تھیں اور اب جب میں صبح آئینہ دیکھتا تھا تو دن بدن بڑھتی داڑھی میں کوئی دوسرا ہی آدمی نظر آتا تھا۔

جہاز پر کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ رنگ و روغن والے اب صبح کو آتے اور شام تک خاموشی سے کام کرتے رہتے۔ ولیم اور میں سر جوڑ کر بیٹھتے تو یہ سوچتے رہتے کہ میرے بمبئی سے نکلنے کی کیا صورتحال ہو سکتی ہے۔

ایک شام میں اور ولیم جہاز سے اتر کر گودیوں کے علاقے سے باہر نکلے اور ٹہلتے ہوئے کافی دور نکل گئے۔ ہم دونوں کو خطرے سے اس طرح کھیلنے میں بڑا لطف آیا تھا۔ اس کی تجویز بھی ولیم نے ہی پیش کی تھی اور کہا تھا۔

''یار! ایک بات سنو، کیا تم یہاں اس کیبن میں گھسے گھسے اپنے آپ کو کوئی بہادر مرد تصور کرتے ہو؟''

''بالکل نہیں۔''

''واقعی.....؟''

''ہاں۔ جھوٹ بولنے کا بھلا کیا تصور ہے۔''

''تو پھر باہر کیوں نہیں نکلتے۔''

''نکلنا چاہتا ہوں مگر تمہاری وجہ سے نہیں نکلتا۔''

''میری وجہ سے؟''

''تو اور کیا؟''

''سمجھاؤ۔''

''ظاہر ہے اس وقت تم میری معاونت کر رہے ہو۔ میرا ہر غلط قدم تمہیں بدنام کرے گا۔''

''آؤ ایڈونچر کرتے ہیں۔ ٹہلتے ہوئے چلتے ہیں کہیں اور۔''

اور اس طرح ہم باہر نکل آئے تھے۔ دو گھنٹے تک ہم سنسان سڑکوں پر ٹہلنے کے بعد لوٹ رہے تھے کہ گارڈ روم کے قریب انجینئرنگ والوں کی موٹر کرین کھڑی ہوئی نظر آئی۔ میں نے دور ہی سے کرین کو پہچان کر ولیم سے کہا۔

''ولیم، وہ دیکھو کرین کھڑی ہوئی ہے۔ کیوں نہ ہم واپس لوٹ جائیں اور سڑکوں کا چکر لگا کر آئیں۔ اس عرصے میں یہ لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔ بلاضرورت میرا ان لوگوں کے سامنے آنا ٹھیک نہیں ہے۔''

ولیم نے میری طرف غور سے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں ایک تنقید تھی۔ پھر اس نے لاپرواہی سے گردن ہلا کر کہا۔ ''نہیں دوست! تمہارے اندر جو تبدیلیاں پیدا ہوگئی ہیں ان سے کوئی تمہیں نہیں پہچانے گا۔ آ جاؤ۔''

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر گردن ہلائی۔ اب بہت زیادہ بزدلی کا اظہار بھی شرمندگی کا باعث بن سکتا تھا۔ چنانچہ ہم گارڈ روم سے گزرے اور میں نے محسوس کیا کہ گارڈ روم سے گزرتے وقت عملے کے لوگ ولیم کو پہچان کر سلیوٹ کر رہے تھے۔ لیکن وہی فورمین جس سے میری اس دن جھک جھک ہوئی تھی، ولیم کو سلام کرنے کے بعد خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا ہوا کرین میں جا بیٹھا تھا۔ مگر ہم کرین سے بمشکل دو قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ فورمین دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ ہم رک گئے۔ اس نے زمین

پر پیر مار کر مجھے سلوٹ کیا اور بولا۔

”سر! معافی چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔“

میں نے سلام کا جواب دیا اور مسکرا کر کہا۔ ”کوئی بات نہیں فور مین۔ تم اچھے تو ہو؟“

”سر آپ کی دعا ہے۔“ اس نے کہا اور معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ولیم کا یہ خیال کہ بارہ دن کے بڑھے شیو سے میرا حلیہ بالکل ہی بدل گیا ہے غلط ثابت ہوا۔ آخر اس آدمی نے بھی تو مجھے پہچان لیا۔ ہم لوگ اس پر دیر تک تبصرہ کرتے رہے تھے لیکن ولیم اب بھی کسی احساس کا شکار نہیں تھا۔

دوسرے دن ہم باہر نکلے تو میں نے ولیم کا دھوپ کا چشمہ پہن رکھا تھا اور بالوں کو ذرا مختلف انداز میں سنوارا تھا۔ یہ سب ولیم ہی کی کارروائی تھی۔ وہ مجھ پر تجربات کر رہا تھا۔ اس روز ہم بازار کی جانب نکل گئے۔ اور پھر ہم نے ایک درمیانہ درجے کے ریستوران میں چائے پی اور واپس جہاز پر آ گئے۔ دو دن بعد ولیم کو جہاز کا چارج دینا تھا۔ اس عرصے میں اس نے اپنے باورچی کے ساتھ تمام معاملات طے کر لئے تھے۔ کیپٹن کو چارج دینے سے ایک دن قبل ولیم کا باورچی مجھے لے کر جانے لگا جہاں اس کے ایک ہم وطن کے ہاں میرے عارضی قیام کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ بہرحال یہ تمام تفصیل مجھے اس نے بتائی تھی۔ ولیم کا باورچی میرا مختصر سا سامان ایک سوٹ کیس میں بھر کر پہلے ہی وہاں پہنچا چکا تھا۔ میں منصوبے کے مطابق دو تین دن اس دوست کے پاس رہوں گا۔ اس دوران جہاز کا چارج دینے کے بعد ولیم کو پندرہ روز کی چھٹی مل جائے گی۔ وہ مجھ سے اپنے دوست کے مکان پر آ کر ملے گا اور ہم دونوں پرتگالی سیاحوں کے حلیے میں اس کے دوست کے ساتھ ڈمن چلے جائیں گے۔ ڈمن میں ہمیں ایک مشہور اسمگلر کے سپرد کر دیا جائے گا اور وہ اسمگلر جسے یہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں موقع محل دیکھ کر ہمیں خلیج فارس کے کسی مقام پر اتار دے گا۔ وہاں سے آگے میرے اصل سفر کا آغاز ہو گا۔ یہ تھی مکمل منصوبہ بندی جس پر اب مجھے عمل کرنا تھا۔

جس شام کو مجھے ولیم ہاروے کے دوست مسٹر جان بک کے ہاں جانا تھا اس دن صبح ہی صبح ولیم کو بحریہ کے ہیڈ کوارٹر سے بلاوا آ گیا۔ اب جہاز پر میں تھا، اردلی تھا اور باورچی۔ ناشتے کے بعد مجھ پر وحشت سوار ہوئی۔ دل چاہا کہ گودیوں کے علاقے سے نکل کر کچھ دور کا چکر لگا کر آؤں۔ کتابیں پڑھتے پڑھتے اور سو سو کر وقت گزارتے گزارتے

مجھ پر اس قدر بیزاری طاری ہو گئی تھی کہ بعض اوقات تو طبیعت عجیب و غریب کیفیت محسوس کرنے لگتی تھی۔

بہرحال میں نے لباس تبدیل کیا۔ دھوپ کا چشمہ اور فلیٹ ہیٹ پہن کر گینگ وے سے اترا اور ٹہلتا ہوا گارڈ روم سے باہر سڑک پر آ گیا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک ٹیکسی نظر آئی اور میں نے اسے ہاتھ سے اشارہ کر کے قریب بلا لیا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں شہر چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ میں زیادہ دور نہیں جاؤں گا۔ بس اتنا جی چاہ رہا تھا کہ کسی بھرے پرے بازار کی ایک جھلک دیکھ کر لوٹ آؤں۔ خود آئینے میں اپنا حلیہ دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ میں بہت زیادہ تبدیل ہو گیا ہوں اور اب مجھے یہ فکر نہیں تھی کہ کوئی مجھے اخبار کی تصویروں سے پہچان لے گا یا پھر ہوٹل میں جن لوگوں نے مجھے دیکھا ہو گا وہ مجھے پہچان لیں گے۔ میں ہر خطرے سے بے نیاز تھا۔ ولیم کے اردلی نے جو پیشے کے لحاظ سے خاندانی نائی تھا، نیوی کے ریگولیشن کے مطابق میری جارج پنجم جیسی داڑھی تراش دی تھی اور میں ایک نظر میں ہی بحریہ کا آدمی دکھائی دیتا تھا۔

ٹیکسی بہت دیر تک بازاروں اور سڑکوں سے گزرتی رہی۔ ڈرائیور کو میں نے کہہ دیا تھا کہ میں سیر و سیاحت کرنا چاہتا ہوں اور میری کوئی خاص منزل نہیں ہے۔ چنانچہ وہ پُرسکون انداز میں ٹیکسی ڈرائیو کر رہا تھا۔ بمبئی میں ان دنوں ٹریفک کی وہ حالت نہیں تھی جو اب ہو گی۔ تاہم ایک بندرگاہی شہر اور ایک مصروف تجارتی مرکز میں جو رش ہوتا ہے وہی کیفیت اس وقت تھی۔ ڈرائیور بھی پُرسکون انداز میں گاڑی چلا رہا تھا۔ ایک بارونق سڑک سے آہستہ آہستہ گزرتا ہوا میں کھڑکی سے لگا فٹ پاتھ پر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور اس وقت کو یاد کر رہا تھا جب میں انہی لوگوں کی طرح سینہ تان کر اور بے خوف ہو کر سڑکوں پر چل سکتا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک میں نے ایک انتہائی خوبصورت، ریشمی سوٹ میں ملبوس ایک غیر ملکی شخص کو تیزی سے فٹ پاتھ پر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ سیاہ چشمہ پہنے ہوئے تھا۔ مگر میں نے اسے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ میرے خدا...... یہ ہیگ جانس تھا۔ سو فیصدی ہیگ جانس جو میرے مصائب، میری تمام تر ذلتوں اور تمام تر پریشانیوں کا سبب تھا۔ نجانے میرے ذہن پر کیا جنون سوار ہوا، میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

”روکو ٹیکسی، ڈرائیور روکو۔“

ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی ایک سائیڈ پر کر کے روکی اور سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ لیکن میں نے اسے جیب سے ایک بڑا نوٹ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ، بس مجھے یہیں اترنا تھا۔"

میں پھرتی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ وہی دیوانگی، وہی جنون میرے سارے وجود پر سوار تھا جو کسی انتہائی مشتعل شخص کا ہوسکتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کاش میں اس وقت مسلح ہوتا۔ کاش میرے پاس کچھ بھی ہوتا، چاہے وہ ایک قلم تراش چاقو ہی کیوں نہ سہی تو میں اس خبیث کو اسی فٹ پاتھ پر گرا کر ذبح کر دیتا جس کی وجہ سے میں دربدر مارا مارا پھر رہا ہوں۔ میں نے جو بھی جرائم کئے ہیں، جو روحانی اذیتیں جھیلی ہیں، ان کا بدل تو یہ بھی نہیں ہے کہ میں اسے ذبح کر دوں۔ درحقیقت اس نے خاقان جمشیدی کو قتل کر دیا تھا، اس خاقان جمشیدی کو جو سیدھے اور سچے راستے پر چلنے والا سچ بولنے والا نوجوان تھا۔ اپنی ہر مشکل کے باوجود یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ ہر قیمت پر سچائیوں کے راستے اختیار کرے گا اور میں ہی نہیں، اس نے بہت سے قتل کئے تھے۔ صحیح معنوں میں یہی شخص این مورالس کا قاتل بھی تھا۔ کریم خان کو بھی میں نے نہیں، اسی نے ہلاک کیا ہے۔ بے چاری ایلس فیوری بھی اسی کے ہاتھوں خراب ہوئی ہے۔ کاش ان تمام قتلوں کے عوض میں اسے ہزاروں بار قتل کر سکتا۔ اتنا ہی جنون سوار تھا مجھ پر۔ میں فٹ پاتھ پر ایک راہ گیر سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ وہ آگے جا رہا تھا۔ اور کچھ لمحوں کے بعد وہ ایک بلند و بالا شاندار عمارت میں داخل ہو گیا۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا، یہ ایک فرم کا صدر دفتر تھا۔ میں نے دفتر کے سامنے رک کر ایک لمحے کے لئے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنے اس جنون پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں خود کو سمجھا رہا تھا کہ مجھے کوئی ایسی حرکت نہیں کرنی چاہئے جس سے بنا بنایا کام بگڑ جائے۔ یہ حرام زادہ بچ کر کہاں جائے گا۔ میں جہنم تک اس کا پیچھا کروں گا۔ اس نے بڑی عیاری سے مجھے اور مورالس کو شکار کیا تھا۔ میں اسی کے ہتھیار سے اسے ماروں گا۔

کچھ لمحے تک میں اپنے آپ کو سنبھالے رہا اور اس کے بعد شیشے کا دروازہ کھول کر میں فرم کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ پچیس تیس آدمی اور عورتیں کاؤنٹر پر کھڑے تھے۔ کچھ لوگ صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک انتہائی قیمتی اور اعلیٰ درجے کا دفتر تھا، دیواروں پر رنگ برنگے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ غالباً یہ کسی ٹریول ایجنسی کا عظیم الشان آفس تھا۔ کیونکہ

جگہ جگہ پوسٹروں پر تفصیلات لکھی ہوئی تھیں۔

"یورپ دیکھئے۔"

"پراسرار افریقہ آپ کا منتظر ہے۔"

"امریکہ جانا ہو تو فلاں جہاز کمپنی کی خدمات حاصل کیجئے۔"

میری نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں اور میں نے ہیگ کو کاؤنٹر پر جھکے ہوئے دیکھا۔ وہ بکنگ کلرک سے کچھ معلومات حاصل کر رہا تھا۔ میں آہستہ اور پُرسکون قدموں سے چلتا ہوا اس کے برابر والے کاؤنٹر پر اس طرح جا کھڑا ہوا جیسے اپنی باری کا منتظر ہوں۔ لیکن میرے کان پوری توجہ کے ساتھ ہیگ کی باتیں سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے انتہائی غور سے سنا، بکنگ کلرک کاغذات الٹ پلٹ کر ہیگ سے کہہ رہا تھا۔

"مسٹر، آپ کو سترہ نمبر کیبن ملی ہے۔ آپ کا جہاز نو نمبر برتھ پر لگے گا۔ جہاز کی روانگی کا وقت نوٹ کر لیجئے۔" یہ کہہ کر اس نے مڑ کر ایک چارٹ دیکھا، پھر بولا۔ "جی ہاں۔ ساڑھے پانچ بجے شام۔ آپ ایک گھنٹہ پہلے پہنچ جایئے تاکہ کسٹم کی چیکنگ وغیرہ میں آسانی رہے۔ آج ساڑھے پانچ بجے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک فارم سا ہیگ کی طرف بڑھا دیا اور ہیگ یہ فارم پُر کرنے لگا۔ پھر اس نے شکریہ ادا کر کے کاؤنٹر سے کچھ چیزیں وصول کیں اور وہاں سے ہٹ گیا۔

میرے لئے اب وہاں ٹھہرنا بالکل بے کار تھا۔ تقدیر نے ہیگ کی پیشانی پر بدنصیبی اور میری پیشانی پر خوش نصیبی کی مہر لگائی تھی۔ مجھے وہ سب کچھ معلوم ہو گیا تھا جسے جاننے کے لئے میں یہاں آیا تھا۔ میرے سامنے کاؤنٹر کے شیشے کے پار ایک بکنگ کلرک مجھ سے یس پلیز، یس پلیز کہے جا رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا، ہیگ دروازہ کھول کر باہر جا رہا تھا۔ بکنگ کلرک سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں نے پوچھا۔

"یہ کون سی کمپنی کا دفتر ہے؟"

"آپ یہ معلوم کئے بغیر یہاں آ گئے ہیں؟"

"نہیں وہ، اصل میں مجھے مسٹر جان بک سے ملنا تھا۔"

"مسٹر جان بک تیسرے فلور پر ہوتے ہیں اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں۔" کلرک نے کہا اور اپنے کاغذات پر جھک گیا۔ میں حیرت سے منہ کھول کر رہ گیا تھا۔ میں نے تو ایسے ہی یہ نام لے دیا تھا۔ لیکن اتفاق سے اس نام کا کوئی شخص یہاں موجود تھا اکاؤنٹس

ڈیپارٹمنٹ میں۔ یہ بھی ایک دلچسپ اور پُرلطف اتفاق تھا۔ ویسے جان بک کے بارے میں ولیم ہاروے سے کبھی کوئی تفصیلی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

بہرحال میں تیزی سے دروازے سے باہر نکل آیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک ٹیکسی نظر آئی۔ اب اس وقت ہیگ کا تعاقب کرنا بالکل مناسب نہیں تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں چل پڑا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو میں نے ڈارک پورٹ کی خشک گودی پر چلنے کے لئے کہا۔

میں نے دل میں سوچا کہ میں اب کہیں نہیں جا سکتا۔ مجھے تو اب اس جہاز پر سوار ہونا ہے جو نو نمبر کی برتھ پر لگنے والا ہے۔ حالانکہ اس کے کوئی انتظامات میرے پاس موجود نہیں تھے۔ اپنا پاسپورٹ تو میں استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح مجھے ٹکٹ بھی نہیں مل سکتا تھا کیونکہ بغیر پاسپورٹ کے ٹکٹ ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن کچھ بھی ہو جائے میں اس شیطان کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ میں دنیا کے آخری حصے تک اس کا پیچھا کروں گا، یہ میرا عزم ہے۔ چاہے اس کے لئے مجھے ہزاروں زندگیاں قربان کرنی پڑیں۔ بس ایک جنون تھا جس نے مجھے بہا کر رکھ دیا تھا۔ ہیگ سے انتقام لینا اب میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے بظاہر کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں تھا۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر زندگی کی بازی بھی ہارنا پڑے تو ہیگ کا تعاقب کروں گا۔ کچھ بھی ہو جائے...... چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

※☆※

بظاہر تو یوں لگتا تھا جیسے دنیا ہی بدل گئی ہو۔ حالانکہ مستقل مصلحتوں سے کام لیتا رہا تھا۔ لیکن ہیگ کو دیکھ کر نجانے کیوں یہ شدید جنون سوار ہو گیا تھا کہ ہیگ کا کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔

بہرحال جہاز پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ بحریہ کے ہیڈ کوارٹر سے ولیم کا پیغام لے کر کوئی شخص آیا تھا۔ ولیم نے کہلوایا تھا کہ میں آج شام کو ہیڈ کوارٹر میں مصروف رہوں گا۔ باورچی سے کہو کہ جو چیزیں شام کو تیار کرنے کے لئے بتائی تھیں وہ ابھی دوپہر میں تیار کرے اور بازار جا کر کچھ اور سامان لے آئے۔ شام کے کھانے پر کیپٹن کے علاوہ دو اور افراد کھانے پر آ رہے ہیں۔ میں اس پیغام کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے باورچی کے ساتھ فوری طور پر روانہ ہو جانا چاہئے کیونکہ جہاز کا کیپٹن کل کی بجائے آج ہی آ رہا ہے۔

اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اردلی اور باورچی نے کپتان کے کیبن سے میرا اور ولیم کا سامان ہٹا کر میرا مختصر سا سامان سوٹ کیس میں جما دیا تھا۔ وہ دونوں نہایت بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ باورچی نے اپنا کام کا لباس یعنی بنیان اور ایپرن اتار کر استری کی ہوئی جینز کی پتلون، سفید قمیض پر ٹائی باندھ رکھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے جوتے چمچما رہے ہیں اور بالوں میں بہت سا تیل ڈال کر اس نے بڑی نفاست سے کنگھا بھی کیا تھا۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں مجھے بتایا کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں جہاز چھوڑ دینا چاہئے۔

اردلی مجھے سلام کرنے کے بعد رخصت ہو گیا تھا۔ باورچی ایک لمحے تک کیبن کے دروازے پر اٹینشن کھڑا رہا، پھر بولا۔ ''سر! آپ تیار ہو جائیں تو مجھے بیل دے دیجئے، میں ویٹ کرتا ہوں۔'' پھر اس نے میرا سوٹ کیس اٹھایا اور چلا گیا۔

میری زندگی کا اہم موڑ آ پہنچا تھا۔ اس وقت مجھے فوراً ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ باورچی

کے ساتھ جانے کے معنی یہ ہیں کہ ہیگ ہمیشہ کے لئے میرے ہاتھ سے نکل جائے۔ دوسری طرف ولیم کے جہاز پر ٹھہرنا اب میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ باورچی کو دھوکا دے کر اگر میں جہاز سے کھسک جاتا ہوں تو بمبئی میں کہاں سر چھپاؤں گا؟ اگر کسی ہوٹل میں پہنچتا ہوں تو میرے پاس سامان تو کچھ ہے نہیں۔ لوگ خواہ مخواہ شبہ کریں گے۔ پھر ہوٹل میں ٹھہر کر مجھے کرنا بھی کیا ہے۔ مجھے ہر قیمت پر ہیگ کے جہاز پر سوار ہونا ہے اور وہ بھی ٹکٹ اور پاسپورٹ کے بغیر۔

میں بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔ دس بارہ دن مجھے اس جنگی جہاز پر بھرپور آرام ملا تھا۔ پناہ ملی تھی۔ اور اس دوران میں یہ بھول گیا تھا کہ بمبئی کی پولیس شکاری کتوں کی طرح مجھے سونگھتی پھر رہی ہے۔ میرا حلیہ اگرچہ بہت تبدیل ہو چکا تھا لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ میں اس شہر میں یا پھر بمبئی سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو ہندوستان کے کسی دوسرے شہر میں آسانی سے چھپا رہ سکوں گا۔ میں نے جھلاہٹ میں لکڑی کی الماری پر گھونسا مارا۔ میں آخر چھپے رہنے کے امکان پر کیوں غور کر رہا ہوں؟ مجھے اب صرف ایک مسئلے پر سوچنا چاہئے۔ وہ یہ کہ اب میں سائے کی طرح ہیگ کے پیچھے لگ جاؤں اور موقع پا کر اپنی تباہی کا بدلہ لے لوں۔ وہ ہندوستان سے باہر جا رہا ہے، مجھے بھی یہ ملک چھوڑنا ہے۔ وہ میرا سب سے خطرناک دشمن ہے اور مجھے ہر صورت میں اسے ختم کر دینا ہے۔

میں نے دیکھا کہ میرے گھونسا مارنے سے الماری کا ایک پٹ نکل گیا۔ الماری میں ہینگروں میں قطار در قطار ولیم کی وردیاں سلیقے سے استری سے ٹنگی ہوئی تھیں۔ اور میرے شیطانی ذہن میں ایک اور جھماکہ ہوا۔ حالانکہ میرا ذہن شیطانی ذہن نہیں تھا بلکہ میں تو بہت ہی اچھے انداز میں سوچنے کا عادی تھا۔ لیکن اب شیطنت مکمل طور پر میرے سارے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔ میرے عیار ذہن نے پورا منصوبہ تیار کر لیا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے کپڑے اتار ڈالے۔ الماری کی دراز میں تہہ در تہہ وردی کی قمیصیں استری کی ہوئی رکھی تھیں۔ سرکاری موزے، سرکاری جوتے، سرکاری ٹائی۔ تیس منٹ کے بعد جب میں آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا تو میں نے اپنے آپ کو شاہی بحریہ کا ایک لیفٹیننٹ پایا۔ نیوی والوں جیسی داڑھی اور نیوی کا ہیئر کٹ۔ سر سے پیر تک نیوی کا افسر معلوم ہو رہا تھا۔

سے آگے بڑھتا ہوا ڈیک پر پہنچ گیا۔ ابھی میں نے ڈیک پر قدم ہی رکھا تھا کہ سامنے سے کوئی آتا نظر آیا۔ میں فوری طور پر کسی کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا چنانچہ ڈیک پر بنے ہوئے ایک ہوا دان کے پاس پہنچ گیا۔ آنے والا ہوا دان سے کچھ فاصلے پر ہی رک گیا تھا۔ پھر شاید وہ واپس ہو گیا ہو گا۔ کیونکہ قدموں کی چاپ اب دور ہو رہی تھی۔ دروازہ پھر کھلا اور بند ہو گیا۔ آنے والا نجانے کیوں واپس چلا گیا۔ میں ہوا دان کے پیچھے سے نکل کر جلدی سے گیٹ وے کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے میں نے اپنے اتارے ہوئے کپڑے بستر کے گدے کے نیچے چھپا دیئے تھے۔ کتابوں کی الماری کھول کر دونوں جوتے بھی کتابوں کی قطار کے پیچھے ڈال دیئے تھے۔

بہرحال میں آگے بڑھا اور میرا خیال یہی تھا کہ اردلی اور باورچی مجھے نہ دیکھ سکیں کیونکہ ولیم کی وردی پہننے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ اگر انہیں ذرا بھی شک ہو جاتا کہ میں ان کے ساتھ کوئی چال چل رہا ہوں یا ولیم کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہوں تو دونوں اپنے افسر کے اس قدر وفادار تھے کہ اس کے آنے تک مجھے پکڑ رکھنے سے دریغ نہ کرتے۔ باورچی تو پینٹری میں ہو گا۔ جب تک اسے بیل بجا کر بلایا نہ جائے، وہ وہیں رہے گا۔ اردلی کی کوٹھڑی بھی اسی طرف تھی۔ مجھے خدا حافظ کہہ کر وہ سیدھا وہیں گیا ہو گا۔ بظاہر میدان صاف تھا۔ میں دبے قدموں سے اترتا ہوا ڈیک پر آ گیا اور وہاں سے گیٹ وے تک پہنچنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف تھا۔ ہلکی سی آہٹ سن کر باورچی یا اردلی ڈیک پر آ سکتے تھے۔ میرے سر پر جیسے کوئی ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ کنپٹی کی ایک رگ یوں پھڑک رہی تھی جیسے ابھی تڑخ جائے گی۔ پانچ قدم...... پانچ قدم اور گیٹ وے دس قدم دور تھا۔

پینٹری کی طرف کوئی دروازہ کھلا اور بند ہو گیا اور کہیں قدموں کی چاپ بیدار ہو گئی۔ کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔ میں ایک بار پھر چھپنے کے لئے جگہ تلاش کرنے لگا۔ اور اس کے بعد جب مجھے اندازہ ہوا کہ آنے والا گزر گیا ہے تو میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

شام کے ساڑھے پانچ بجے تک کا پورا منصوبہ تیار تھا۔ یہاں سے میں سیدھا مسافروں کی گودیوں کی طرف جاؤں گا اور وہاں نو نمبر برتھ پر ہیگ کا جہاز لگ گیا ہو گا۔ بحریہ کی وردی میں کسی بھی جہاز پر بلا روک ٹوک چڑھ جانا کوئی مشکل بات نہیں ہوتی۔

جہاز بیچ سمندر میں نہیں اتر جاتا۔ اس کے بعد کیا ہوگا یہ سب بعد کی باتیں ہیں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ خطرہ تو مول لینا ہی ہے۔

بہر حال گیٹ وے سے اتر کر میں گودی کے پختہ فرش پر آ گیا اور میری دانست میں بہت بڑا معرکہ سر ہو گیا۔ میں نے گارڈ روم کا راستہ دیکھ لیا تھا اور پھر میں فوجیوں کی طرح باوقار انداز میں تیز تیز چلنے لگا۔ دوپہر کے کھانے کی چھٹی ہو چکی تھی اور دور دور تک کرینیں اور فوجی گاڑیاں قطار میں کھڑی ہوئی تھیں۔ اِکا دُکا مزدور یا بحریہ کا کوئی وردی پوش کارکن سامنے سے تیزی سے گزر جاتا تھا۔ بائیں طرف سے دو سائیکل سوار فوجی گارڈ روم کی طرف جانے کے لئے میرے قریب سے گزرے تو انہوں نے گردنیں تان کر دائیں طرف اپنے سر کو جھٹکا۔

"اٹ از رائٹ۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر دونوں کا سلام لیا اور اس وقت کالج میں اسکاؤٹ کے لئے جو تربیت لی تھی اس نے میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ میرا جوابی سیلوٹ سو فیصدی لیفٹیننٹ کا سیلوٹ تھا۔ ابھی میرا اٹھا ہوا ہاتھ شانے سے نیچے بھی نہیں گرا تھا کہ گارڈ روم سے چھوٹی سی بحریہ کی ایک کار نکلی اور میری طرف بڑھی۔ اسٹیئرنگ پر میرا دوست ولیم ہاروے تھا۔ اس کی نظریں اپنے جہاز پر لگی ہوئی تھیں ورنہ قدرتی طور پر وہ سامنے سے آتے ہوئے لیفٹیننٹ کی طرف دیکھتا۔ تیز دھوپ میں میری وردی کی آستینوں پر عہدے کی سنہری پٹیاں دور سے چمک رہی تھیں۔ میرا دل شدید رفتار سے دھڑکنے لگا۔ لیکن بہر حال میں جلدی سے گھوم گیا۔ سائیکل سوار فوجی چند قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ میں نے رعب دار آواز میں انہیں پکارا۔

"جوانز، کم ہیئر۔"

فوجیوں نے سائیکلیں روک دیں اور پاؤں ٹیک کر مجھے دیکھا۔ میں نے جاتی ہوئی کار کی طرف پشت کئے ہوئے ہی انگریز افسروں کی سی شان سے کہا۔

"ادھر آؤ۔"

دونوں جوان سائیکلوں سے اتر کر میری طرف آ گئے۔ میں نے یہ سب کچھ فوری ہیجان کے تحت کیا تھا۔ اب اگر ولیم گاڑی سے اتر کر اس طرف دیکھتا بھی ہے تو یہ ایک عام سا منظر ہوگا کہ ایک لیفٹیننٹ دو فوجیوں سے کھڑا باتیں کر رہا ہے۔ البتہ میں نے یہ ضرور سوچا تھا کہ انہیں روک تو لیا ہے میں نے لیکن انہیں کیا کہوں گا۔ میرے کان کار کی

طرف لگے ہوئے تھے اور میں نے محسوس کیا کہ کار کا انجن بالکل بند ہو گیا ہے۔ اب ولیم گاڑی سے اترے گا اور ممکن ہے جہاز پر چڑھنے سے پہلے وہ اس طرف دیکھ لے۔ دونوں فوجی میرے پاس پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے زمین پر بوٹ مار کر کہا۔

"یس سر!"

وہ دونوں ایک ایک ہاتھ سے سائیکل پکڑے اٹینشن کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک لمحے میں میرے ذہن میں گڑبڑ سی ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ اب میں ان سے کیا کہوں، کیا بات کروں۔ بہر حال کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ آخر آگے ایک دم بڑھ کر ایک جوان کی جیب کے فلیپ پر انگلی ماری، ایک فلیپ کا بٹن کھلا ہوا تھا۔ یہ بے ضابطگی تھی اور انسپکشن کے وقت ایسی کسی بے ضابطگی کی سزا دی جا سکتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"تم نے پاکٹ کی فلیپ کا بٹن نہیں لگایا۔ کیوں؟"

جس شخص سے میں نے یہ الفاظ کہے تھے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس نے سامنے دیکھتے ہوئے اور زیادہ اٹینشن ہو گیا۔

"آئی...... آئی ایم سوری سر۔"

اس کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب کیا کروں۔ اگر میں ان کے ساتھ گارڈ روم تک پہنچ جاؤں تو خطرے سے باہر ہو جاؤں گا۔ میں نے پھر کہا۔

"یہ بہت غلط ہے...... بہت غلط ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔" یہ کہہ کر میں نے رعب کے ساتھ گارڈ روم کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ دس، بیس، تیس اور پچاس قدم۔ اور ہم لوگ گھوم کر گارڈ روم میں پہنچ گئے۔ مسلح سنتری نے اٹینشن ہو کر مجھے سلام کیا۔ ہم گارڈ روم سے گزرتے ہوئے باہر سڑک پر آ گئے۔ ابھی میں پوری طرح خطرے سے باہر نہیں ہوا تھا۔ میرے ساتھ آنے والے دونوں گارڈز کی حالت خراب تھی۔ میں نے کہا۔

"ٹیکسی...... ٹیکسی نہیں ملے گا اس وقت؟"

میرے اس غیر متوقع سوال پر وہ دونوں حیران سے ہوئے اور پھر جس شخص پر میں نے اعتراض کیا تھا اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اس عرصے میں اپنی جیب کا فلیپ بند کر چکا ہے۔

"سر! مل جائے گی۔ ابھی لے کر آتے ہیں۔ آپ گارڈ روم میں تشریف رکھئے۔"

"اوکے...... اوکے۔ جاؤ۔ مگر ٹھہرو، میں کسی سے لفٹ لے لوں گا۔ اوکے...... تم جاؤ۔ تھینک یو۔" وہ دونوں اتنی آسانی سے جان چھوٹنے پر سیلوٹ مار کر سائیکلوں پر سوار ہوئے اور روانہ ہو گئے۔ میں سڑک پر کھڑا انہیں جاتے دیکھتا رہا۔ مجھے اندازہ تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس منحوس جگہ سے دور پہنچ چکے ہوں گے۔ لیکن میں اگر کچھ دیر یہیں کھڑا رہا تو مجھے ولیم کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں لفٹ مانگوں مگر کس سے؟ سڑک تو دور دور تک ویران پڑی ہوئی تھی۔

دفعتہً ہی مجھے ایک ٹرک آتا ہوا نظر آیا اور میں تیار ہو گیا۔ اب چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے، مجھے اس ٹرک کو روک کر یہاں سے بھاگنا ہے۔ ٹرک میرے قریب آ کر رکا تو اچانک ہی میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر وہی فور مین بیٹھا ہوا تھا جس کی مجھ سے کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ اس نے فوراً ہی مجھے پہچان لیا اور نیچے اتر آیا۔ پھر سلام کر کے بولا۔

"یس سر! کیا حکم ہے؟"

میں ٹرک کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ ولیم کی گاڑی گارڈ روم پر آئی، لمحے بھر کے لئے رُکی اور پھر چل پڑی۔ وہ ادھر ہی آ رہی تھی۔ میں نے ٹرک کا دروازہ کھولا اور اندر سیٹ پر بیٹھ کر فور مین کو اشارہ کیا۔

"تم پیچھے بیٹھ جاؤ۔ مجھے بھی اس طرف جانا ہے۔ مجھے کوئی ٹیکسی چاہئے۔ چلو، میرا کام بہت جلدی کا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے ٹرک ڈرائیور کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو جو سمت بتائی تھی وہ اس سمت سے مختلف تھی جہاں ولیم کی گاڑی مڑی تھی۔ ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے ولیم نے اپنی گاڑی کی رفتار ہلکی کر لی اور میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں نے ٹرک کے دروازے پر اس طرح ہاتھ رکھ لیا کہ عہدوں کے نشانات بھی چھپ گئے اور میرا چہرہ بھی بازو کی آڑ میں ہو گیا۔

ولیم ٹرک کا جائزہ لیتا ہوا وکٹوریہ ٹرفیس جانے والی سڑک پر رک گیا۔ ہمارے ٹرک نے دوسری سڑک پکڑ لی تھی۔ کچھ اور آگے نکلے تو میں نے خود کو سنبھال کر گرد و پیش پر نگاہ ڈالی۔ یہ سڑک مسافر گودی کی طرف جا رہی تھی۔ آگے چل کر اسی راستے پر تھوڑا سا گھومتے ہوئے وکٹوریہ ٹرفیس آ جاتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب میں ٹرک سے اتر کر براہ راست ٹیکسی میں بیٹھ جاؤں گا تو کوئی خطرے کی بات نہیں رہے گی۔ البتہ اگر میں اتر کر

سڑک پر کھڑا ہوا اور کسی ٹیکسی کا انتظار کیا تو ضرور پکڑا جاؤں گا۔ ولیم اس علاقے میں گشت لگاتا رہے گا۔ نجانے کیوں مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مجھے ہی ڈھونڈنے کے لئے نکلا ہے۔

بہرحال کچھ دور ایک خالی ٹیکسی نظر آئی تو میں نے ڈرائیور سے کہا کہ ٹرک کی رفتار بڑھا کر ٹیکسی کو روکنے کی کوشش کرے۔ ڈرائیور نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی رک گئی اور میں ان دونوں کا شکریہ ادا کر کے خدا حافظ کہتا ہوا ٹیکسی میں آ بیٹھا۔ میرا ذہن اب برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ جب کوئی مجرمانہ عمل کیا جاتا ہے تو انسانی ذہن اس پر پورا پورا تیار ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ دفتر کے سامنے میں نے ایک صاف ستھرا چائے خانہ دیکھا تھا۔ یہ دفتر ٹامس کک کا دفتر تھا۔ اس علاقے میں غیر ملکیوں کی آمد و رفت رہتی تھی اس لئے چائے خانہ بہت شاندار قسم کا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو یہ پتہ بتا کر میں نے لیفٹیننٹ کی ٹوپی اتاری اور سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔

آخر کار ٹیکسی اس چائے خانے پر پہنچ گئی۔ لنچ کا وقت تھا اور چائے خانہ بھرا ہوا تھا۔ زیادہ تر تجارتی فرموں کے لوگ کھا پی رہے تھے۔ صرف چائے پینے والے کم ہی نظر آتے تھے۔ صبح سے پے در پے ایسے ہیجان خیز واقعات ہوئے تھے کہ میری بھوک ہی اڑ گئی تھی۔ بہرحال میں چائے خانے میں جا بیٹھا اور ویٹر کو چائے کے ساتھ کچھ اسنیکس کا بھی آرڈر دے دیا۔ پھر میں چائے پیتا رہا۔ لنچ کرنے والے رفتہ رفتہ چھٹتے جا رہے تھے۔ میں نے سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ اب ذہن کسی طرح مطمئن ہو گیا تھا۔ میں ہیگ کے جہاز پر سوار ہونے کے منصوبے پر ہر پہلو سے غور کرتا رہا تھا۔ صورتحال کے بہت سے پہلو ایسے تھے جن کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ہیگ کہاں جا رہا ہے۔ بہرحال وہ دفتر میرے سامنے تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کے کاؤنٹر پر جا کر پوچھوں کہ نو نمبر برتھ پر کون سا جہاز لگ رہا ہے اور یہ جہاز کہاں جا رہا ہے۔ لیکن یہ بات فضول سی معلوم ہوئی۔ بہرحال اب ہیگ کہیں بھی جا رہا ہے، مجھے یہ بات نظر انداز کرنی ہے۔ میں کون سا قانونی طور سے کسی جہاز سے سفر کروں گا۔ ایک مجرمانہ سفر کرنا ہے مجھے۔ لیکن ہیگ کو چھوڑنا میرے بس سے باہر تھا۔ وہ کہیں بھی جائے، مجھے اس کے پیچھے جانا ہے۔

جہاز پر سوار ہونے کا مسئلہ تو میں نے حل کر ہی لیا تھا۔ لیفٹیننٹ کی وردی کے نیچے کمر

سے وہ بیلٹ بندھی ہوئی تھی جس میں بہت کچھ میرے پاس موجود تھے۔ میں نے بہت سے روپے تبدیل کرائے تھے اور اب بے شمار امریکی ڈالر اور پاؤنڈ میرے پاس موجود تھے۔ اس کے علاوہ برٹش انڈیا کے جو نوٹ باقی بچ رہے تھے وہ بھی میرے پاس موجود تھے۔ میں اس کا کوئی مصرف دریافت نہیں کر سکا تھا۔ ایک صورت تو یہ تھی کہ میں ٹریولر چیک لے لیتا۔ دوسری بات یہ تھی کہ جہاز کی روانگی میں چار گھنٹے سے زیادہ تھے۔ میں یہ رقم ڈالر میں تبدیل کر لیتا یا پھر اس کے جواہرات خرید لیتا۔ مجھے پتھروں کی پہچان تھی۔ اور اس شہر میں ایک سے ایک بڑا جوہری پڑا ہوا ہے۔ دھوکا کھانے کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔ کسی ایسی بڑی دکان کو دیکھتا ہوں جہاں اس رقم سے جواہرات خریدے جا سکیں۔ جواہرات کی زبان اس دنیا میں عام ہے اور صحیح معنوں میں وہ ٹریولر چیک سے زیادہ محفوظ چیز ہوتے ہیں۔

دفعتہً ہی ایک نام میرے ذہن میں آیا۔ یہ سیٹھ سلطان میاں جواہر والے تھے۔ ایک بہت بڑے جاگیر دار۔ ریاست کے نوابی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے طبقے سے اس درجے مختلف تھے کہ انہوں نے بہت سے کاروباروں میں روپیہ لگایا ہوا تھا اور اس زمانے میں کروڑ پتی تھے جب ہزار پتی کی حیثیت بھی ہزار پتی کہلاتی تھی۔ میں بیسیوں مرتبہ ان کے ساتھ شکار پر جا چکا تھا۔ والد صاحب کے بہت اچھے دوستوں میں سے تھے اور سچی بات یہ ہے کہ جواہرات کا کاروبار ان لوگوں نے صرف اس لئے شروع کیا تھا کہ مہم جوئیوں میں والد صاحب کے ساتھ رہتے تھے اور بہت سی جگہوں سے لاتعداد نوادرات ان کے ہاتھ لگے تھے۔ بس ان نوادرات کے حصول کے بعد اسی شوق میں جوہری بن گئے تھے اور اس وقت بمبئی میں سب سے بڑی دکان انہی کی تھی۔ پرانے ٹائپ کے جھکی سے انسان تھے۔ اکثر ریس کھیلنے کے لئے بمبئی آتے رہتے تھے۔ ایک بار بمبئی میں قیام کے دوران جوہری بازار سے گزر رہے تھے کہ خیال آیا کیوں نہ بیگم کے لئے موتیوں کا اچھا سا ہار خرید لیں۔ ان کا حلیہ ہمیشہ ہی خراب رہتا تھا۔ میلا کرتہ پائجامہ اور روئی کی سدری اور سر پر ترکی ٹوپی، ہاتھ میں پانوں کی ڈبیہ اور بٹوا۔ البتہ دو تین ریاستی پھٹنے باز کم و بیش انہی کی طرح خراب حلیے میں پان چباتے ہوئے ان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

اس دن جب وہ جوہری بازار سے گزر رہے تھے تو وہ لوگ ان کے ساتھ ہی تھے۔ جس جوہری کے ہاں وہ پہنچے اس نے نئی دکان خریدی تھی۔ سلطان میاں سے واقف نہیں

تھا۔ حلیہ بھی ان کا ایسا تھا کہ کوئی بھی انہیں دیکھ کر یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ کوئی بڑے آدمی ہوں گے۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔ اس دوران سلطان میاں نے کہا۔

"ہاں بھئی، ذرا موتیوں کا کوئی ستر واں ہار دکھاؤ۔" جوہری نے ملازموں کو اشارہ کیا۔ ملازموں نے دو تین ہار سامنے رکھے تو انہوں نے بھولے پن سے کہا۔

"ارے ہاں، یہ تو بتاؤ کہ چاندی کی انگوٹھیاں بھی مل جائیں گی کیا عقیق والی؟"

جوہری کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ جب انہوں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر عقیق جڑی ہوئی چھ سات چاندی کی انگوٹھیاں دکھائیں تو وہ جا کر سمجھا کہ میاں کیا طلب کر رہے ہیں۔ ایک ملازم نے کسی قدر رعونت سے کہا۔

"نہیں جناب! آپ نے شاید اس دُکان کی حیثیت کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ اگر آپ کو ایسی گھٹیا انگوٹھیاں چاہئیں تو وہ سامنے والی گلی میں آگے چلے جائیے، فٹ پاتھ پر ایک شخص چادر بچھائے بیٹھا ہوا ہے۔ وہ انگوٹھیاں اس کے پاس مل جائیں گی۔ اچھی انگوٹھیاں ہیں، چار چار، پانچ پانچ روپے کی مل جائیں گی۔ بات کریں گے تو شاید دو چار آنے کم کر دے۔"

سلطان میاں اور ان کے ساتھی اب بھی نہیں سمجھے کہ ملازم کیا کہنا چاہتا ہے۔ اپنے ایک ساتھی سے بولے۔ "پتہ سمجھ لو عقیل میاں۔ یہاں سے اٹھ کر وہیں چلیں گے۔"

ادھر دکان کا مالک جوہری ان تمام لوگوں کو عجیب سے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ یہ گھٹیا درجے کے لوگ کس طرح اس عظیم الشان دکان میں گھسے چلے آئے ہیں۔ سلطان میاں کہنے لگے۔

"بھئی یہ جو ہار تم نے ہمیں دکھائے ہیں ان کے علاوہ بھی کچھ ہیں تمہارے پاس؟ کوئی ڈھنگ کی چیز دکھاؤ یار! یہ کیا گھٹیا چیزیں میرے سامنے لا کر رکھ دی ہیں۔"

اب دُکان کے مالک سے نہ رہا گیا۔ اس نے ملازموں کو اشارہ کر کے کہا۔ "ہٹا لو یہ ہار...... ہٹا لو۔ ہٹا لو یہ سامان اس کے سامنے سے۔ جی، کیا چاہئے آپ کو جناب؟ یہ چاندی کی چار چار روپے والی انگوٹھیاں آپ یہاں اس دُکان سے طلب کر رہے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ اصلی موتیوں کی دُکان ہے۔ ہم اصلی موتیوں کے ہار بیچتے ہیں بھائی۔ جاؤ، سامنے وہ گلی ہے اس میں تمہارے مطلب کی چیزیں مل جائیں گی۔"

سلطان میاں کو ایک دم احساس ہوا کہ وہ شخص ان کا مذاق اڑا رہا ہے اور انہیں گھٹیا

سمجھ رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ ''ریاض میاں! اس سے پوچھو کہ بیچ رہا ہے اپنی یہ سچے موتیوں کی دُکان، کیا لے گا اس کے؟''

جوہری اور اس کے ملازم ہنسنے لگے۔ دُکان کے مالک کو بھی مسخرہ پن سوجھا۔ اس نے ہاتھ باندھ کر مسخرے پن سے کہا۔ ''بس جناب! معاف کر دیجئے گا، غریب آدمی ہوں، روزی کمانے دیں۔ جائیے، جائیے اس غریب آدمی کی روزی چھیننے کی کوشش مت کیجئے۔''

''ہوں...... مطلب کیا ہے، یہ بتاؤ۔ آؤ بھئی...... ذرا باہر آ جاؤ۔ کہیں یہ بیوقوف آدمی یہ نہ سمجھے کہ ہم اس کی دکان میں ڈاکا ڈالنے آئے ہیں۔ اور تم عقیل میاں ہمارے بینکر کو بلا لاؤ۔ جاؤ، جو ہم کہہ رہے ہیں وہ کرو۔''

وہ نیچے اتر آئے اور پھر بپھرے ہوئے شیر کی طرح دیوار کے سامنے ٹہلتے رہے۔ ان کے منہ سے گالیاں نکل رہی تھیں۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد ان کا بینکر بھی آ گیا تھا۔ یہ ایک پارسی تھا اور سلطان میاں کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ سلطان میاں نے کہا۔

''جاؤ ذرا اس دکان کا سودا کرو۔ یہ ہمارا حکم ہے۔''

بینکر نے دُکان میں جا کر صورتحال معلوم کی اور جب اسے اس صورتحال کا پتہ چلا تو اس نے کہا۔ ''سیٹھ جی! کیوں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال لیا۔ جانتے ہو وہ کون ہیں؟''

''انہیں تو نہیں لیکن آپ کو جانتا ہوں جناب! آپ......''

''اب دُکان بیچ دیں آپ۔ یہ دُکان یہاں قائم نہیں رہے گی۔ وہ بہت بڑے نواب ہیں۔'' اور اس کے بعد بینکر، جوہری کو سلطان میاں کے بارے میں تفصیلات بتاتا رہا۔

جوہری کے تو ہوش اڑ گئے تھے۔ اس دوران سلطان میاں فٹ پاتھ پر کھڑے غصے سے لال پیلے ہوتے رہے تھے۔ جوہری نیچے آیا اور ہاتھ جوڑ کر اس نے معافی مانگی اور کہنے لگا۔

''آپ مجھے معاف کر دیں جناب! میں آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ آئیے...... میری دکان میں آئیے۔''

''ابے تیری اور تیری دُکان کی ایسی تیسی۔ تو نے کیا سمجھا ہے، پٹھان ہوں پٹھان۔''

وہ کسی طور مان کر نہ دیئے دُکان دار نے بہت کچھ کہا لیکن بس شامت ہی آ گئی تھی۔ اس وقت تک سلطان میاں سکون سے نہ بیٹھے جب تک منہ مانگی قیمت دے کر انہوں نے وہ دُکان نہ خرید لی۔ اور جب دُکان خرید لی گئی تو سلطان میاں اپنے اسی ٹولے کے ساتھ اسی حلیے میں آئے اور بھرے بازار میں سیٹھ اور اس کے ملازموں کو گدی سے پکڑ کر دُکان

سے نیچے اُتار دیا اور دُکان میں تالہ ڈال کر واپس چلے گئے۔

ہفتے بھر کے بعد جب واپس لوٹے تو سناروں اور دوسرے کارندوں کی ایک پوری ٹیم ان کے ساتھ موجود تھی۔ دُکان پر اپنا بورڈ لگوا دیا۔ سلطان میاں جواہر والا۔ اور اس کے بعد باقاعدہ کاروبار پھیلا دیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آج دس برس کے بعد پورے صرافے میں میاں سلطان کی ٹکر کی کوئی دُکان نہیں تھی۔ ایک طرح سے یہ راجے، نوابوں کے بھائی بند تھے۔ درجنوں ریاستوں سے ان کا نقد اور اُدھار لین دین چلتا تھا۔ ان کی دُکان ریاستی کارندوں کے لئے بہت بڑی حیثیت رکھتی تھی۔ دُکان کے اوپر کی منزل میں انتہائی شاندار دو کمرے ہر وقت تیار رہتے تھے کہ آج کسی ریاست کے دیوان صاحب بمبئی کی سیر کے لئے تشریف لائے ہیں تو کل راجن گھاٹ کے وزیرِ خزانہ راجہ کی بٹیا کے جہیز کا سامان خریدنے آ رہے ہیں۔ ان کا وہی پرانا بینکر گویا افسرِ منصوبہ بندی تھا۔ ایسی ایسی ترکیبیں بتاتا تھا کہ راجواڑوں سے گویا ایک کی جگہ چار چار وصول ہوں اور احسان کا احسان الگ رہے۔

اس وقت مجھے وہی سلطان میاں یاد آ گئے تھے اور ایک دم سے میرے ذہن میں پرانی باتیں گونج گئی تھیں۔ سلطان میاں ان لوگوں میں سے تھے کہ اگر میں اس وقت ان کے پاس جا کر کہوں کہ سلطان چچا میں چالیس آدمیوں کو بم سے اڑا کر آ رہا ہوں تو مزے سے پان چباتے ہوئے فرمائیں گے کہ کوئی بات نہیں ہے شہزادے، تم منہ ہاتھ دھو کر کھانا وانا کھاؤ، ہم کوئی بندوبست کرتے ہیں۔

بہرحال میں نے قریب کی دُکان سے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں سلطان میاں کی دُکان کا نمبر دیکھا۔ خوش قسمتی سے وہ دُکان پر موجود تھے۔ میں نے ٹیلی فون پر کہا۔

''وہ سلطان صاحب! میں سالمی فارم والا ہمدان جمشیدی کا بیٹا بول رہا ہوں۔''

''جمشیدی میاں...... اچھا...... ارے کیا، کون...... جمشیدی بھائی کے بیٹے؟''

''جی ہاں وہی۔''

''لاحول ولا قوۃ۔ بڑے گدھے ہو اور ٹیلی فون کر رہے ہو۔ ابے میں تیرا چچا ہوں۔ مجھ سے ٹیلی فون پر بات کر رہا ہے۔ اگر بمبئی میں ہے تو کیا تجھے سیدھا میرے پاس نہیں آنا چاہئے تھا؟''

''جی یہیں آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ معلوم کرلوں آپ دکان پر ہیں یا نہیں۔''

"آ جاؤ...... آؤ جلدی آؤ۔ تم سے کچھ باتیں بھی کرنی ہیں۔ دیکھو اب ٹیلی فون پر ایک لفظ بھی نہ کہو، میرے پاس آ جاؤ۔"

میں حیران رہ گیا۔ ادھر سے ٹیلی فون بند ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی ٹیلی فون بند کر دیا۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ وہ مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتے ہیں اور انہیں کیسے معلوم کہ میں......

بہر حال کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ پھر ایک دم دل میں خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میری تلاش میں پولیس ان کے ہاں بھی پہنچی ہو۔ یعنی شہرت حوالے سے سیتا گڑھی اتنی معمولی جگہ نہیں تھی۔ اور وہاں کے رہنے والے اتنے عام لوگ نہیں تھے کہ پولیس یہ نہ جان سکتی کہ سلطان میاں کا تعلق بھی سیتا گڑھی سے ہے اور میرا بھی۔ بہر حال اگر ایسا بھی ہوا ہے تب بھی پریشانی کی یہ بات نہیں ہے۔ سلطان میاں ہر صورت میں میرے مددگار ہی ثابت ہوں گے۔

میں نے ایک ٹیکسی روکی اور جوہری بازار روانہ ہو گیا۔ سلطان میاں کی عظیم الشان دُکان یا شو روم کے سامنے میں نے ٹیکسی رکوائی، بل ادا کیا اور دُکان میں داخل ہو گیا۔ فوراً ہی دو ملازموں نے مجھے اٹینڈ کیا تھا اور بولے۔

"جناب والا! آیئے، تشریف رکھئے۔ جو کچھ درکار ہو بتا دیجئے گا۔ آیئے۔"

"بھائی مجھے سلطان صاحب سے ملنا ہے۔"

"اچھا اچھا، تشریف لایئے۔" ملازموں کا ادب و آداب دیکھنے کے قابل تھا۔ انہوں نے بڑے احترام سے مجھے ایک اندرونی کمرے میں پہنچا دیا۔ اندر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اپنی اسی روایتی شان سے سلطان میاں پڑے اونگھ رہے تھے لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ وہی ٹوپی، وہی سدری گویا زندگی کی ڈگر میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اٹھے اور سوالیہ انداز میں دیکھنے لگے۔

"سلطان چچا، میں ہمدان جمشیدی کا بیٹا خاقان جمشیدی ہوں۔"

"ایں......" وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ پھر مجھے ساتھ لانے والے نوکروں سے بولے۔ "جاؤ دروازہ باہر سے بند کر دو اور کسی کو اندر مت آنے دینا۔ ہمارا بھتیجا آیا ہے، ہم اس سے باتیں کر رہے ہیں۔"

سلطان میاں پرانے ٹھاٹ باٹ کے آدمی تھے۔ میں پرانی دوستیوں کے رشتے سے

ان کا بھتیجا تھا اور سلطان میاں جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس میں چھوٹوں کے ساتھ اپنی شفقت کا اظہار کرنے کا انداز ذرا مختلف تھا۔ انہوں نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ہوں...... تو تم سمندری فوج میں ملازم ہو۔"

"جج...... جی ہاں۔" میں نے بدحواسی سے کہا۔

"ہوں...... سنا ہے ہوٹل میں تم نے کوئی آدمی مار ڈالا ہے۔" ان کے یہ الفاظ میرے حواس پر بم کا دھماکہ بن کر گرے تھے۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ ان کا سوال تھا چنانچہ جواب دینا بھی ضروری تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"ابے بھوتنی کے چھپر! مجھے نہیں پہچانتے ہو؟" اس انوکھی گالی پر مجھے ہنسی آ گئی۔ مجھے ہنستا ہوا دیکھ کر وہ خود بھی ہنس پڑے اور بولے۔

"قصہ وِسہ کیا تھا...... کوئی عورت وورت کا چکر تھا کیا؟"

میری گردن جھک گئی تو وہ پھر ہنس پڑے اور بولے۔ "ابے تو اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ اللہ بخشے وہ جو کہتے ہیں نا کہ باپ پر پوت، پتا پر گھوڑا۔"

یہ جملے ادا کر کے وہ ایک دم خاموش ہو گئے پھر یوں لگا جیسے انہیں اپنے الفاظ پر شرمندگی ہوئی ہو۔ انہوں نے کسی قدر دُکھ بھری آواز میں کہا۔

"اللہ بخشے ہمدان بھائی کو، اس وقت زندہ ہوتے تو یہ کیس بن ہی نہیں سکتا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ وہ زندہ نہیں، ہم تو زندہ ہیں۔ بتاؤ...... بتاؤ بیٹھو اور مجھے پورا قصہ بتاؤ۔ لیکن ایک بات سمجھ لو، بولنا سچ ہے۔ میرے پاس ایک جادو کی انگوٹھی ہے، یہ دیکھو۔" انہوں نے اپنی انگلی میں پہنی ہوئی ایک انگوٹھی مجھے دکھائی اور بولے۔ "یہ انگوٹھی کا نگینہ دیکھ رہے ہو نا، جھوٹ بولو گے تو یہ سبز سے سرخ ہو جائے گا۔ اور بس سمجھ لو کہ جھگڑا بڑھ جائے گا۔"

انگوٹھی کے نگینے کا مسئلہ تو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن ان سے واقعی جھوٹ بولنا جائز نہیں تھا۔ بہر حال میں نے محتاط انداز میں انہیں ہوٹل کا واقعہ سنایا۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتے رہے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ انہی کی جوانی کا قصہ ہو۔ موقع موقع قہقہے لگا دیتے۔ کبھی حیران ہو کر آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگتے یا ہونٹوں کو گول کر کے سر ہلانے لگتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہیں اس داستان میں بہت ہی لطف آ رہا ہو۔ اسی دوران دو بار

بٹوے سے گلوری نکال کر منہ میں دبا چکے تھے۔ آنکھوں میں بچوں جیسی شرارت کھیل رہی تھی۔ جب میں پورا قصہ سنا چکا تو جلدی سے بولے۔

"ہائے ہائے...... کہاں ہے اب وہ چھنلیا!"

ایک لمحے تک تو میں چھنلیا نہ سمجھ سکا۔ لیکن پھر بات سمجھ میں آ گئی۔ میں نے ان کا چہرہ دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے ان کی چمکدار آنکھوں میں شکاریوں جیسی تجسس کی لہریں موجیں مار رہی ہوں۔ میرے ہونٹوں پر ایک دم مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے مجھے مسکراتے دیکھا تو ایک دم سے جھینپ گئے اور پھر ایک گندی سی گالی دے کر بولے۔

"بھوتنی کے چھپر، مسکراتا کیوں ہے؟ سسرے! بس کیا کہوں تجھ سے، خیر...... خیر وہی کہنے والا تھا۔ ہمدان جمشیدی کو تجھ سے زیادہ میں جانتا ہوں۔ باپ تو وہ تیرا تھا لیکن دوست میرا تھا۔ ابے ہم نے کیا کیا کھیل نہیں کھیلے بیٹا! تم ایک ہی کھیل میں چت ہو گئے۔ دھت تیرے کی۔ اور اس کے بعد اپنے آپ کو ہمدان جمشیدی کا بیٹا کہتا ہے۔ خیر تو جان اور تیری وہ۔ ہمیں اس سے کیا لینا۔ اچھا ایک بات بتا، آگے کیا منصوبہ ہے؟"

"کچھ نہیں چچا! یہ میرے پاس کچھ برٹش انڈیا کے نوٹ ہیں۔ یہ......"

"بس بس بس...... نوٹ ووٹ کی کوئی مشکل نہیں ہے۔ تجھے جو چاہئے مجھ سے لے لے۔ پھر وھر لے جا یا کہے تو پونڈ منگوا دوں۔ اصل جھگڑا تو ٹکٹ کا ہے۔"

"چچا، اس وردی میں جہاز پر چڑھنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوگی۔"

"ابے تیری...... کیا کہوں، تیری ماں بھابی ہے ورنہ تجھے ماں کی گالی دیتا۔ ابے جہاز پر تو چڑھ جائے گا مگر رہے گا کہاں؟ کیبن کے بغیر رہے گا جہاز میں؟ کھائے پیے گا کہاں؟ چھپا چھپا پھرے گا۔ یہ کوئی زندگی ہوگی، ایں؟...... میرے پاس آنے کے بعد ایسی باتیں کر رہا ہے۔"

"نہیں چچا، جہاز پر کسی کو کچھ دے کر اپنا بندوبست کر لوں گا۔"

"چل تیری ایسی تیسی۔ یار! تو ہے کیا چیز؟ یا تو، تو وہ ہے وہ جو میں تجھے نہیں کہہ سکتا یا تو مجھے وہ سمجھتا ہے۔ ابے سمندری فوج میں ملازم ہے تو اور جہاز کے طور طریقے نہیں معلوم تجھے۔ اول تو انگریز کی عملداری ہے، کوئی ریاستی ٹنٹا نہیں ہے۔ جہاز کے جس ملازم سے دینے دلانے کی بات کرے گا گدی سے پکڑ کر کپتان کے پاس لے جا کر کھڑا کر دے گا یا پھر کوئی آنکھ کا اندھا اور گانٹھ کا پورا، پیسہ دھیلا لے کر تمہیں چھپائے رکھنے پر

راضی ہو بھی گیا تو چھپائے گا کہاں، جانتے ہو؟ کسی کوئلے کے گودام میں یا آٹے چاول کے اسٹور میں چوہے کی طرح بند رکھے گا۔ تین چار دن میں ہی حلیہ خراب ہو جائے گا، سمجھا پاگل کہیں گا۔ ابے بھوتنی کے چھپر، میرے پاس آیا ہے اور اس طرح کی باتیں کر رہا ہے۔ کیا تجربہ ہے تیرا زندگی کے بارے میں؟ اسے تجربہ کہتے ہیں۔"

"مگر چچا، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔"

"ہوں، کرنا ہے۔ چچا کے پاس آیا اور اب کرنا تجھے ہے۔ چل ٹھیک ہے، اس وقت دو بج رہے ہیں، ڈیڑھ دو گھنٹے آرام کر لو۔ کھانا وانا کھا کر اوپر جا بیٹھو۔ میں دیکھتا ہوں کون سا جہاز ہے اور کہاں جا رہا ہے۔"

"مگر چچا میری بات سنیں۔ وہ اصل میں......"

"ابے تیری اصل کی ایسی تیسی۔ مجال ہے کسی کمپنی کی کہ سلطان میاں کو ٹکٹ دینے میں آنا کانی کرے۔ ان سسروں کی تو......" سلطان میاں نے ایک بار پھر ایک موٹی سی گالی بکی اور میں گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ حالانکہ یہ صورتحال ایسی نہیں تھی کہ کسی دوسرے پر بھروسہ کیا جائے مگر سلطان میاں کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اگر تل ہی گئے کچھ کرنے پر تو پھر کر ہی ڈالیں گے۔

بہرحال ان کی، ان باتوں سے میری پریشانی تو دور ہو گئی تھی۔ بھوک واقعی بالکل نہیں تھی لیکن پھر بھی سلطان میاں کی فرمائشی گالیوں سے بچنے کے لئے تھوڑا بہت کھایا پیا اور اس کے بعد ان کے ریاستی گیسٹ ہاؤس میں چلا گیا۔ ویسے میں نے ملازم کے ہاتھ ساری کرنسی سلطان میاں چچا کو پہنچا دی تھی۔ اور اس کے بعد ملازموں نے پردے کھینچ دیئے اور میں نرم اور آرام دہ بستر پر دراز ہو گیا۔ ویسے تو خیر نیند آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن سلطان میاں نے بڑی شاہانہ مسہریاں بچھوائی تھیں جنہوں نے بالآخر میری پلکیں ایک دوسرے سے چپکا ہی دیں۔

اور پھر جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ کمرے کی بتی جل رہی ہے اور روشندان تاریک ہیں۔ ایک لمحے تک تو صورتحال کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن پھر دوسرے لمحے میں بستر سے اچھل کر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ کمرے میں لگی ہوئی گھڑی ساڑھے سات بجا رہی تھی۔ میں نے خوفزدہ انداز میں اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر وقت دیکھا، اس میں بھی یہی وقت تھا۔ میں پانچ گھنٹے تک بے خبر سوتا رہا تھا۔

ہیگ کا جہاز دو گھنٹے پہلے بمبئی چھوڑ چکا ہو گا۔ آہ...... یہ کیا ہوا...... یہ کیا ہو گیا؟ میں نے جیسے تیسے ڈریسنگ گاؤن پہنا اور رقم کی بیلٹ اٹھا کر بھاگم بھاگ سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ کیا ہو گیا...... کیا کر ڈالا یہ میں نے؟ سلطان میاں جیسے اول جلول آدمیوں پر بھروسہ کر کے سب کیا دھرا خاک میں ملا دیا۔

نیچے دکان میں بڑی رونق تھی۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر دکان کا منیجر میری جانب آیا تو میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”سلطان میاں کہاں ہیں؟“

”آپ آیئے جناب، آیئے پلیز۔“ اس نے نرمی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر کا راستہ دکھایا۔ سلطان میاں کی کوٹھڑی میں تاریکی تھی۔ منیجر نے لائٹ جلا کر اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ تب میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”سلطان میاں کہاں ہیں؟ میں نے کہا نا، میں نے تم سے کچھ کہا تھا اور تم نے کچھ کر ڈالا۔“

”آپ تشریف رکھیے۔ بلکہ غسل کر لیجئے۔ کپڑے تبدیل کر لیں۔ میں چائے تیار کر لیتا ہوں۔ چائے پئیں گے یا کچھ اور؟“ منیجر کے اس سکون پر مجھے شدید غصہ آ گیا۔

”تمہاری شامت آ گئی ہے۔ میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے اور تم کچھ بکواس کر رہے ہو۔ چائے گئی جہنم میں۔ سلطان میاں کہاں ہیں؟ اور یہ سب کیا چکر ہے؟ مجھے آخر جگایا کیوں نہیں گیا؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم جناب کہ سیٹھ صاحب کہاں گئے ہیں اور آپ کو جگایا کیوں نہیں گیا۔ مجھے جو ہدایات دی گئی ہیں ان کے مطابق طے کیا گیا ہے کہ آپ جب سو کر اٹھیں گے تو تیار ہو کر چائے وغیرہ ضرور پئیں گے۔“

”لعنت ہے تم پر اور تمہاری چائے پر۔ میں جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف جھپٹا تو منیجر جلدی سے میرے سامنے آ گیا اور میرے اور دروازے کے درمیان جا کھڑا ہوا۔

”سنیے جناب خاقان صاحب! مجھے یہ ہدایات دی گئی ہیں کہ آپ کو کہیں نہ جانے دوں اور اس وقت تک آپ کی خدمت کرتا رہوں جب تک کہ خود سیٹھ صاحب نہ آ جائیں۔“

”یہ خدمت تم کیسے کرو گے...... جواب دو۔“

”معافی چاہتا ہوں جناب! جس طرح بھی بن پڑے گا کروں گا۔ چاہے آپ میری ہڈیاں کیوں نہ توڑ دیں۔“

میں بری طرح جھلا گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ قصہ کیا ہے۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی مجھے نیند کیوں آ گئی۔ لیکن اب ذہن کچھ اور انکشافات کر رہا تھا اور آہستہ آہستہ سارا کھیل میری سمجھ میں آتا جا رہا تھا۔ سلطان میاں نے کھانے پینے کی کسی چیز میں نیند کی دوا ملوا دی تھی تاکہ میں سوتا رہ جاؤں اور بمبئی سے فرار نہ ہو سکوں۔ اوہ میرے خدا، یہ خبیث بڈھا جو میرے باپ کے دسترخوان پر منوں کے حساب سے ان کا نمک کھا چکا ہو گا مجھے پولیس کے ہاتھوں فروخت کرنے گیا ہوا ہے۔ کسی بھی لمحے پولیس کے ٹرک دکان کے سامنے آ کر رکیں گے اور میں جو اتنے دن آزاد رہا ہوں اب خود اپنی حماقت سے اتنی آسانی سے پھنس جاؤں گا یا چوہے کی طرح اس پنجرے میں مارا جاؤں گا۔

میں نے ایک لمحے تک کچھ سوچا اور پھر آخری فیصلہ یہی کیا کہ مجھے ہر قیمت پر یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ منیجر جو، جوڈو کراٹے کا ماہر معلوم ہوتا تھا، بہترین تن و توش کا آدمی تھا۔ میں نے یہ سوچ لیا کہ اگر اس نے مجھے نہ جانے دیا تو پھر اس سے دو دو ہاتھ کرنا ہی پڑیں گے۔ میرے بچنے کی اور کوئی صورت تو نہیں ہے۔ اس وقت تو صورتحال یوں لگ رہی ہے جیسے پولیس بس آنے ہی والی ہو۔ سلطان میاں اب مجھے ایک شیطان کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ بے شک میں جوڈو کراٹے وغیرہ سے واقف نہیں تھا لیکن دیسی کشتی کے تمام داؤ پیچ مجھے معلوم تھے۔ حالانکہ اس وقت کشتی لڑنے کا کوئی موقع نہیں تھا کیونکہ منیجر کی ایک آواز پر دکان کے سارے ملازم جمع ہو سکتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ پیتل کا کوئی چار فٹ اونچا ایک خوبصورت سا گلدان سلطان میاں کی مسہری کے پاس رکھا ہے۔ میں نے جھپٹ کر وہ گلدان اٹھا لیا اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”سامنے سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ نتیجے کے ذمہ دار خود ہو گے۔“

”سنیے جناب! میری بات تو سنیے۔“ منیجر نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اگر آپ اس بات سے ناراض ہیں کہ میں بار بار آپ کو چائے کی دعوت دے رہا ہوں تو معافی چاہتا ہوں، آپ نہ پئیں چائے۔ لیکن میرا کوئی قصور تو نہیں ہے۔ یہ گلدان وہیں رکھ دیں اور

اور تسلی سے جا کر غسل کر لیں۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھول دیا اور میں واقعی بری طرح چکرا گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ منیجر دروازہ کھول کر اس طرح پینترے بدلتا ہوا میری طرف بڑھا کہ میں نے گلدان سر سے بلند کر لیا۔ دفعتہً ہی عقب سے مجھے سلطان میاں کی آواز سنائی دی۔

"اے، اے...... یہ کیا تماشہ ہے بھئی؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

سلطان میاں کی آواز سن کر میں نے بجلی کی طرح پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ میرا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا تھا۔ مجھے گمان تھا کہ سلطان میاں کے پیچھے پولیس ہو گی اور اب بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ منیجر نے گہری سانس لے کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"سیٹھ صاحب! میں تو بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ اگر آپ نہ آ جاتے تو پتہ نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔" منیجر کی آواز تھکی تھکی سی تھی جیسے اس کی کسی بڑے قرض سے گلو خلاصی ہوئی ہو۔

"مگر یہ صورتحال میری سمجھ میں آئی نہیں۔ یہ کیا ہو رہا تھا آخر؟" سلطان میاں آرام سے اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ بچ نکلنے کا اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں ملے گا۔ چنانچہ میں نے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔

"ابے پکڑیو اسے۔" سلطان میاں کے نعرے کے ساتھ ہی منیجر نے جھکائی دے کر مجھ پر چھلانگ لگائی اور مجھے کمر سے پکڑ لیا۔ ہم دونوں قالین پر گر گئے۔ وہ واقعی جوڈو کراٹے کا ماہر تھا۔ اس نے کچھ اس انداز سے میرے پیروں میں قینچی ڈالی کہ میں بے بس ہو کر قالین پر پڑے کا پڑا رہ گیا۔ سلطان میاں بڑی خباثت سے ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بھئی یہ کیا حرامی پن ہے۔ ابے چھوڑ بھوتنی کے چھپر! دو چٹکی بھنگ ایسی سالی دماغ کو چڑھ گئی، بلاوجہ کبھی گلدان اٹھاتا ہے اور کبھی اٹھ کر بھاگتا ہے۔ ہاتھ پیر تڑوا بیٹھے گا بیٹا، کیا سمجھا؟"

"میں...... میں...... میں......"

"ابے میں، میں کے بچے! بکرے کی اولاد ہے کیا؟ ابے اگر ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے تو جہاز پر کون چڑھے گا تیرا باپ یا تیرا چچا؟ باپ تو اس دنیا میں نہیں ہے۔" پھر انہوں نے منیجر کے ایک لات رسید کی اور بولے۔ "اُٹھ جا بے۔ کیسا ایسے پڑا ہے جیسے......

چیے...... اب کیا کہوں بچے کے سامنے۔ چائے یہیں بھجوا دے اور دروازہ بند کرتا جا۔"

منیجر نے مجھے چھوڑ دیا اور کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور پھر لنگڑاتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ میری سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بالکل دماغ خراب ہو گیا تھا۔

"اوہ، بھئی کیا سوچ رہا تھا تو آخر؟ کرنا کیا چاہتا تھا مجھے یہ بتا دے...... نہیں نہیں...... بتا دے مجھے۔ یہ کیا مار پیٹ کی سوجھی تھی؟ اور منیجر بے چارہ، ابے دو کوڑی کا آدمی تھا وہ۔ تیرا ملازم تھا، مار پیٹ کر لیتا، اس کی ٹانگیں توڑ دیتا، سر پھاڑ دیتا، کچھ بھی نہیں کہتا وہ تجھ سے۔ تو کیا سمجھتا ہے۔ چل اٹھ، یہ دیکھ۔"

یہ کہہ کر سلطان میاں نے جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے حیرت سے دیکھا، یہ جہاز کا ٹکٹ تھا۔ اسکندریہ کے لئے ایک فرسٹ کلاس کیبن سلطان میاں کے نام سے ریزرو کر دی گئی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس ٹکٹ کو دیکھا اور پھر سلطان میاں کی طرف دیکھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اپنے منہ پر غلاظت لگا لوں۔ سلطان میاں کے انداز میں ایک باپ جیسی شفقت تھی۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔

"بھئی میری صورت کیا دیکھ رہا ہے۔ جہاز کا ٹکٹ ہے۔ تیرے لئے کیبن تک کرا دی ہے میں نے فرسٹ کلاس کی۔ کیا سمجھا؟"

میں واقعی اندر ہی اندر زمین میں گڑھا جا رہا تھا حالانکہ جو کچھ سوچا تھا وہ میرے دل میں تھا۔ لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہو۔ اس شخص کے بارے میں اس انداز میں سوچا تھا میں نے جو محبت و ایثار کا پیکر ہے، جس کے چہرے کی شفقت میں مجھے اپنے باپ کے چہرے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن پھر اچانک ہی مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"لیکن چچا، جہاز تو جا چکا ہو گا۔"

"ابے ماں کی آنکھ ان سالوں کی۔ ہماری اجازت کے بغیر سالے ساحل چھوڑ سکتے تھے بمبئی کا؟"

"لیکن چچا میاں! اس وقت تو پونے آٹھ بج رہے ہیں۔"

"ہاں بج رہے ہیں۔ جہاز ساڑھے نو بجے جائے گا بیٹا! ساڑھے نو بجے۔ سمجھا؟ ہم کہہ رہے ہیں نا کہ تو خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ جب چچا کے پاس آ گیا تو سمجھ لے ساری

مشکلیں حل ہو گئیں۔ تیرا جہاز ساڑھے نو بجے جائے گا اور اسی نو نمبر کی گودی سے۔ تو جس وقت اپنی حرام کاری کی داستان سنا رہا تھا نا بھوتنی کے چھپر! میں نے اسی وقت ملازم سے پرچہ بھجوا کر منیجر سے جہاز کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ادھر تو کھانا کھائے جا رہا تھا اور ادھر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تیرا جہاز ساڑھے پانچ بجے کی بجائے اب ساڑھے نو بجے جا رہا ہے۔ سمجھا؟ میں نے دیکھا کہ تو تھکا ہوا ہے، خوفزدہ ہے، منہ پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ سالے، باپ نے کبھی کسی کی خاطر داری نہ کی، انگریز کیا انگریز کا باپ بھی اسے ڈرا نہیں سکا اور تیرے منہ پر اتنی سی بات سے ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ہم جانتے تھے کہ ایسی حالت میں جہاز پر چڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ بلاوجہ تجھ پر شک کیا جائے۔ اور اس کے بعد تو دھر لیا جاتا آرام سے۔ بزرگوں نے ایسی حالت میں ایک ہی علاج بتایا ہے بیٹا! اور وہ علاج ہے نیند۔ وہ بھی چار پانچ گھنٹے کی بھرپور نیند۔ اور ہماری بوٹی اس کام کے لئے تیر بہدف ہے۔ اس لئے ہم نے خانساماں سے کہہ دیا کہ دو چٹکی بھتیجے کو بھی چکھا دو۔ یہ حرام کا پلّہ سوتا رہے گا اس دوران ہم ٹکٹ کا معاملہ کر لیں گے۔ مگر پتہ چلا بیٹا کہ باپ کی طرح تم بھی ہماری بوٹی کو ہضم نہیں کر سکتے۔ اوچھے ہو حرامیو، اوچھے ہو۔ ہمارے سب سے قیمتی آدمی کا ستیاناس کرنے والے تھے تم۔ کھوپڑی پھاڑ دیتے اس کی، ٹانگیں توڑ دیتے اس کی، مجال تھی کہ وہ تم پر ہاتھ بھی ہلاتا۔ اچھا ہوا موقع پر پہنچ ہی گئے ہم۔ اس سلسلے میں پورے جنگلی ہو بھوتنی کے سانڈ اپنے باپ کی طرح۔"

سلطان چچا کی گالیاں ایسی بے مثال تھیں کہ میرے حلق سے ہنسی نکل گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ شرمندگی اب بھی میرے رگ و پے میں موجود تھی جو میں نے ان کے بارے میں اس برے انداز میں سوچا تھا۔ اگر انہیں ذرا بھی گمان ہو جاتا کہ میں نے ان کے بارے میں کیا کیا سوچا تھا تو میرے لئے واقعی ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ وہ میری اس ہنگامہ آرائی کو بھنگ کا اترتا ہوا نشہ سمجھ رہے تھے۔ بہرحال میں نے فرش سے اپنی رقم کی بیلٹ اٹھائی اور بمشکل تمام پوچھا۔

"چچا میاں! اسکندریہ کا ٹکٹ کتنے کا ملا؟"

سلطان میاں کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس کے بعد گالیوں کا وہ سلسلہ شروع ہو گیا جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ انہوں نے کئی زبردست گالیاں دے کر وہی گلدان اٹھا لیا اور بولے۔

"حرام کے تخم! چچا کہتا ہے اور چمار سمجھتا ہے۔ ابے مجھے کسی بنیے کی اولاد سمجھ رکھا ہے یا پھر کیا سمجھا ہے تو نے مجھے؟ پٹھان ہوں بیٹے، پٹھان ہوں۔ جو پیسے میں نے تجھ پر خرچ کئے ہیں، اب میں کیا کہوں برا مان جائے گا تو۔"

پھر اسی طیش کے عالم میں انہوں نے سدری کی دوسری جیب سے برطانوی پونڈ کی گڈی نکالی اور میرے منہ پر مار دی۔

"یہ رکھ۔ اور تو نے جو ہندوستانی نوٹ بھجوائے تھے وہ میں نے رکھ لئے ہیں۔ جب بھی بمبئی واپس آئے لے لینا مجھ سے۔ سالا بات کرتا ہے حرامی بنیوں کی طرح۔ ابے کیا کہوں تجھ سے اور۔ دل تو چاہتا ہے کہ وہ گالیاں سناؤں کہ تیرے پورے خاندان کی روحیں بلبلاتی ہوئی قبروں سے نکل آئیں۔ تجھے پتہ ہے تیرے باپ سے میرے کیسے تعلقات تھے۔ بات کرتا ہے۔"

سلطان میاں کی آواز بھرا گئی۔ میرے لئے واقعی زمین سخت ہو گئی تھی کہ زمین میں گڑھ جاتا۔ سلطان میاں نے کرتے کے دامن سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور میں نے ایک گہری سانس لے کر سوچا کہ کمال ہے، وہ کون لوگ ہوتے ہیں جنہیں ایسے بے مثال لوگوں کی دوستیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ میرے والد بھی یقیناً ایسی ہی چیز ہوں گے۔"

بہرحال اس کے بعد سلطان میاں پر ایک خاموشی سی طاری ہو گئی۔ چائے آ گئی تھی اور سلطان میاں میرے ساتھ چائے پی رہے تھے۔ لیکن ان کی گردن جھکی ہوئی تھی اور چہرے پر افسردگی کے تاثرات تھے۔ غالباً انہیں ہمدان جمشیدی کے ساتھ گزارے ہوئے دن یاد آ رہے تھے۔ میں واقعی اس وقت عجیب و غریب کیفیت میں تھا۔ ان سے نظر ملا کر بات کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

چائے ختم ہوئی تو میں اوپر غسل کرنے چلا گیا۔ تیار کی ہوئی تازہ استری کی وردی میں نیچے اترا تو سلطان میاں کو اپنا منتظر پایا۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے پھر کچھ گالیاں بکیں اور بولے۔ "بھوتنی کے چھپر! وردی تیرے اوپر بڑی سجتی ہے۔ جمشید بھائی نے شاید اسی لئے تجھے بھرتی نہیں ہونے دیا ہو گا۔"

میں نے چونک کر سلطان میاں کی طرف دیکھا۔ بڑے عجیب الفاظ تھے۔ وہ پھر بولے۔ "کیا سمجھتا ہے مجھے، چونڈا ہوں کیا بالکل؟ مجھ سے اڑ رہا ہے بچونگڑے! تو کیا سمجھتا ہے، ایک نگاہ دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تو کسی اور کی وردی پہنے ہوئے ہے۔"

"سلطان چچا! کہاں کہاں مجھے اپنی بڑائی کا احساس دلائیں گے۔" ویسے وردی کے ذکر پر مجھے ولیم ہاروے یاد آ گیا۔ میں نے کہا۔ "چچا! مجھے ذرا لکھنے پڑھنے کا سامان منگوا دیجئے۔"

"ہوں، بھیج دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلے گئے۔ بہت ہی عمدہ قسم کا ایک کاغذ اور قلم میرے پاس آ گیا تو میں نے ولیم ہاروے کے نام ایک پرچہ لکھا جس میں مختصراً اپنے واقعات، ہیگ سے ملاقات اور اپنے فرار کے بارے میں تفصیل لکھ کر میں نے ولیم سے معافی مانگی کہ میں نے اس کے اعتماد کو مجروح کیا ہے۔ لیکن میں اس قدر مجروح ہوں کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ جو کچھ صورتحال درپیش ہے وہ میرے لئے زندگی اور موت کی مانند ہے۔

اس کے بعد میں نے واپسی کا فیصلہ کیا اور سلطان چچا سے رخصت کی اجازت مانگی۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا کر میری پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر اپنی جیب سے ایک پڑیا نکالی اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگے۔ مجھے مدھم مدھم گالیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ انہوں نے وہ پڑیا میری طرف بڑھائی اور بولے۔

"لے، یہ پہن لے۔ کبھی ضرورت پڑے تو بیچ دینا۔ واپس آئے گا تو میں اور دے دوں گا۔" پڑیا میں سے سفید سونے کی ایک بڑی خوبصورت انگوٹھی نکلی جس میں قابلی چنے کے برابر ایک ہیرا جگمگا رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے ہیرے پہنے تھے۔ اماں اور بابا جان کو خود پتھروں کا بڑا شوق تھا۔ مجھے بھی پتھروں کی پہچان تھی۔ لیکن اتنا شاندار ہیرا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سچی بات ہے کہ اس کی قیمت کا صحیح اندازہ میں نہیں لگا سکتا تھا۔ میرے خدا کیا ہوں میں اور کتنی گھٹیا ہو گئی ہے میری سوچ۔ اس شخص کے بارے میں، میں نے ایسے انداز میں سوچا تھا جس کی شفقتیں بے پناہ تھیں۔ پتہ نہیں بابا جان نے اس کو کیسے گرویدہ بنا لیا کہ ان کے بعد وہ ان کے بیٹے سے بھی اس درجے کا سلوک کر رہے تھے۔

بہرحال میں نے انگوٹھی ان سے لی اور روانگی کے لئے تیار ہو گیا۔

"سنو! میرا منصوبہ یہ ہے کہ تم بندرگاہ سے کچھ دور گاڑی سے اتر جاؤ گے اور وہ لوگ حالات کا جائزہ لے لیں گے جو تمہارے ساتھ جائیں گے۔ اس کے بعد تم کسٹمز کی حد بندی سے گزر کر جہاز پر سوار ہو جاؤ گے۔ اور سنو، بالکل فکر مت کرنا۔ جہاز کی روانگی تک

مینجر اور بے شمار افراد جنہیں پہلے سے اطلاع دے دی گئی ہے گودی پر موجود رہیں گے۔ بیٹے! تم فکر مت کرنا۔ اگر سوار ہونے سے پہلے یا سوار ہوتے وقت پولیس نے تمہیں شناخت بھی کر لیا اور گرفتار کرنے کی کوشش کی تو وہ کچھ ہو جائے گا جو تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ فوج کی فوج جو تمہارے چاروں طرف بکھری ہو گی، پولیس کے چھکے چھڑا دے گی۔ تمہیں ایک لمحے کے لئے فکر نہیں کرنی چاہئے۔ اگر صورتحال اس حد تک بگڑ گئی تو انہیں بمبئی کی زیر زمین دنیا میں پہنچا دیا جائے گا۔ کیا سمجھے؟ رائی کے دانے کے برابر فکر مت کرنا۔ میری یہ فوج بہت زیادہ تربیت یافتہ ہے اور مکمل تیاریاں کر کے تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہے۔ جاؤ!"

آہ...... کیا کیا، کیا تھا سلطان چچا نے میرے لئے۔ کوئی انسان زندگی میں کبھی اتنے بڑے انسان کا صلہ دے سکتا ہے۔

بہرحال اس کے بعد ہم روانہ ہو گئے اور میں نے اس پراسرار مینجر کو جو بڑے پہلوان ٹائپ کی چیز تھی کچھ عجیب وغریب اشارے کرتے ہوئے دیکھا۔ لیکن سلطان چچا کی وہ فوج مجھے نظر نہیں آئی تھی جو میری حفاظت کے لئے مامور تھی۔ لیکن اس وقت میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ واقعی تقدیر نے میری صحیح رہنمائی کی تھی۔ اور میں نے بہت بڑے آدمی کا سہارا حاصل کر لیا تھا۔

※☆※

نو بجنے میں ابھی کچھ دیر تھی جب ہم بندرگاہ پر پہنچے تھے۔ میں اب اپنے آپ کو بڑا پراعتماد محسوس کر رہا تھا اور مزے سے سگریٹ سلگا کر ٹہلنے لگا تھا۔ اسی طرح ٹہلتا ہوا میں نو نمبر کی گودی پر پہنچ گیا۔ عرب ملکوں اور افریقہ کو جانے والے ملازموں سے پسنجر لاؤنج کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کسٹمز اور پولیس کے حکام مسافروں کو کاغذات کی جانچ پڑتال کے بعد انہیں جہاز پر سوار کرا رہے تھے اور ہمیشہ کی طرح مسافروں سے زیادہ رخصت کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ اس ہجوم میں پتہ نہیں کتنے سی آئی ڈی والے عام لوگوں میں گھل مل کر مجھ یا مجھ جیسے لاتعداد مفرور مجرموں کو ڈھونڈ رہے ہوں گے۔

بہرحال میں نے مسافروں کے لاؤنج پر نظر ڈالی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گودی کی طرف نکلنے والے راستے کی جانب چل پڑا۔ یہاں کسٹمز اور پولیس کے کوئی آٹھ آدمی مسافروں کے کاغذات اور سامان کی جانچ پڑتال پر لگے ہوئے تھے۔ مجھے گودی کی طرف

بڑھتے دیکھ کر مسافروں نے فوراً راستہ دے دیا۔ کسٹمز اور پولیس کے آدمیوں نے میری وردی پر لگے ہوئے نشانات پر ایک نظر ڈالی اور مستعدی سے مجھے سلوٹ دیئے۔ میں بے نیازی سے ان کے سلام لیتا ہوا کسٹمز کی حد سے باہر نکل آیا۔ سامنے وہ جہاز روانگی کے لئے تیار تھا جس سے ہیگ اور میں روانہ ہو رہے تھے۔ گین وے کے ساتھ ہی عقابی نگاہوں والے دو تین سفید پوش اور کسٹمز پولیس کے چند آفیسر کھڑے ہوئے تھے اور ہر آتے جاتے مسافر کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ دور کسٹم کے شیڈ پر دو سرچ لائٹیں نصب تھیں۔ ادھر جہاز کی سرچ لائٹیں بھی گین وے پر مرکوز تھیں۔ میں اندھا کر دینے والی روشنیوں میں باوقار لیفٹیننٹوں کی طرح ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہوا گین وے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ میں یہ تاثر ابھی نہیں دینا چاہتا تھا کہ میں اسی جہاز سے سفر کرنے والا ہوں بلکہ میں یہ ظاہر کر رہا تھا کہ کسی سرکاری کام سے آیا ہوا ہوں اور واپس چلا جاؤں گا۔

گین وے کے نیچے کھڑے ہوئے لوگوں نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا۔ کسٹم اور پولیس کے آدمیوں نے مستعد ہو کر سلام کیا۔ سادہ پوش نظریں جمائے مجھے دیکھتے رہے۔ ابھی میں نے گین وے پر پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ سادہ پوشوں میں سے ایک آگے بڑھا اور اس نے سرد سے لہجے میں کہا۔

"سر پلیز، ایک منٹ۔"

میں رُک گیا۔ سردی کی لہر میرے پورے بدن میں دوڑ گئی۔ میرے دل نے آواز لگائی کہ لو بیٹے خاقان! آخر کھیل ختم ہو گیا۔ پکڑے گئے۔ لیکن میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر مڑتے ہوئے تھوڑی سی گردن گھما کر پوچھا۔

"ہاں بولو، کیا بات ہے؟"

"سر، آپ کے نام نیول ہیڈ کوارٹر کے سلطان صاحب کا میسج ہے۔ وہ جہاز پر پہنچ گئے ہیں۔" میری کھوپڑی گھوم کر رہ گئی۔ نیول ہیڈ کوارٹر کے سلطان صاحب کون بلا ہیں؟ یہ کیا چکر ہے؟ کیا یہ کوئی خفیہ سگنل ہے؟ میں مڑ کر اس شخص سے کوئی بے ڈھنگی بات کہنے ہی والا تھا کہ اوپر جہاز کی ریلنگ سے تقریباً آدھا لٹکتا ہوا میں نے سلطان میاں کے منیجر کو دیکھ لیا۔ وہ اسی سادہ پوش آدمی کو اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے مڑے بغیر اپنے پیچھے کھڑے سادہ لباس آدمی کا شکریہ ادا کیا۔

"اوکے، تھینک یو۔" اور اس کے بعد میں گین وے پر چڑھتا چلا گیا۔ گین وے کے

بعد جہاز کا عرشہ تھا اور پھر راہداری۔ جب میں نے جہاز پر پہلا قدم رکھا تو یوں لگا جیسے ہندوستان کی سرحد پار کر رہا ہوں۔ جہاز پر پہنچا تو جہاز کے عملے سے پہلے سلطان میاں کے منیجر نے مجھے آلیا۔ اس نے فوج کے سول ملازموں کی طرح نیم فوجی سلام کیا اور ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔

"سر! کیبن کا معائنہ کر لیجیے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے لفافہ لیتے ہوئے بردباری سے گردن ہلا کر اس کے سلام کا جواب دیا اور اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ مکمل ڈرامہ ہو رہا تھا۔ کچھ اس طرح کا ماحول پیدا کر دیا گیا تھا کہ کوئی میرے بارے میں غور بھی نہ کر سکے۔ یہ سلطان میاں تو پورے جرائم پیشہ آدمی تھے۔ میں تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ جہاز کے ملاحوں اور افسروں نے مجھے راستہ دے دیا تھا۔ بحریہ کا افسر تو ان کا باپ ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں نے سرسری سی نظر سلطان میاں کے منیجر پر ڈالی اور ہمیں کسی سرکاری مشن پر سمجھ کر دانستہ طور پر نظر انداز کر دیا۔ مسافر اور قلی اور جہاز کے ملاح اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ تمام راہداریاں آباد تھیں۔ راستے میں کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ منیجر فرسٹ کلاس کیبنوں کی طرف میری رہنمائی کر رہا تھا اور میں کیبنوں کے نمبروں پر نگاہیں ڈالتا جا رہا تھا۔ چودہ، پندرہ، سولہ اور یہ سترہ نمبر کا کیبن جس کا دروازہ اندر سے بند تھا، اگر میں صحیح جہاز پر سوار ہوا ہوں تو اس بند دروازے کے پیچھے میرا دشمن ہیگ موجود ہے شاید اپنی موت کے انتظار میں۔ اس لئے کہ اب میں اسے جیتا نہیں چھوڑوں گا۔

غصے کی گرم لہریں میرے بدن میں دوڑنے لگیں اور میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میرے کیبن کا نمبر چھبیس تھا۔ منیجر نے کیبن کا دروازہ کھولا اندر ایک وردی پوش اسٹیورڈ بستر وغیرہ ٹھیک کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے بستر کے سرہانے ایک نیا سوٹ کیس رکھا ہے۔ منیجر نے سوٹ کیس کی چابی میری طرف بڑھا دی۔

"سر! میں نے آپ کا سامان لگا دیا ہے۔ ٹکٹ عنایت فرما دیں تو اسٹیورڈ کو نوٹ کرا دوں۔"

"اوکے...... اوکے......" میں نے جیب سے ٹکٹ نکال کر منیجر کی طرف بڑھا دیا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اپنے آپ کو بڑا تیس مار خان سمجھتا ہوں۔ میں بہت کچھ کرتا رہا ہوں لیکن سلطان میاں نے ایک انتہائی تجربے کار شخص کے طور پر جس طرح چاروں طرف

میرے لئے آسانیاں پیدا کر دی تھیں، حقیقت یہ ہے تا قیامت میں ایسی آسانیاں حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس شخص کی صلاحیتوں کا قائل ہو گیا تھا۔ میرے لئے سب سے بڑی مشکل اس وقت یہ تھی کہ بغیر سامان کہ میں یہ سفر کس طرح کروں گا۔ اس ایک وردی میں کتنے دن رہ سکتا تھا۔ اس نے یہ مشکل بھی حل کر دی تھی۔ میں نے مینجر کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

”شکریہ مینجر۔“

اسٹیورڈ سامان لگا کے جا چکا تھا۔ ادھر کوریڈور میں گھنٹی بجنے لگی تھی۔ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ تمام غیر متعلق لوگ جہاز سے اتر جائیں۔ مینجر نے کہا۔ ”سر! گین وے پر جو بے وقوف آپ کو ملا تھا آپ اس کی بات کا بالکل خیال نہ کریں۔ میں اس احمق کی طرف سے معافی چاہتا ہوں۔ اس سے کہا گیا تھا کہ اگر آپ کو نیچے روکنے کی کوشش کی جائے تو وہ مزاحمت کرے۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ نیول ہیڈ کوارٹر کے سلطان صاحب جہاز پر سوار ہو چکے ہیں اس لئے یاد کرایا تھا کہ اگر پولیس یا کسٹم والے بلا ضرورت آپ سے سوال جواب کریں تو وہ اس طرح کی کوئی بات کہہ دیتا کہ پولیس اس دھوکے میں رہے کہ آپ بحریہ کے کسی کام سے آئے ہیں اور کوئی اعلیٰ عہدیدار پہلے سے اس جہاز میں موجود ہے۔ اس نے بلاوجہ آپ کو ٹوکا۔“

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے مینجر! کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں اب محفوظ ہوں۔ میرا خیال ہے یہ گھنٹی جو بج رہی ہے اس سلسلے میں ہے کہ غیر متعلق لوگ نیچے اتر جائیں۔ اب تم جاؤ۔ سلطان چچا سے میرا سلام کہہ دینا۔ او کے، بے حد شکریہ۔“

”سر! خدا آپ کو آپ کے ہر مشن میں کامیاب کرے۔“ اس نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ جہاز کے خلاصی شور مچاتے پھر رہے تھے کہ تمام باہر والے لوگ اتر جائیں۔ گین وے ہٹایا جا رہا ہے۔

جہاز کی روانگی کا منظر دیکھنے کے لئے میں چند قدم آگے بڑھ آیا۔ رخ بدلتے ہوئے جہاز کے ساتھ میں ساحل پر نگاہیں جمائے بے خیالی میں چلتا رہا اور پھر ہمارا جہاز دوسرے جہازوں کے عقب میں پہنچا تو ساحل کا منظر چھپ گیا۔ میں دیر تک وہاں کھڑا رہا تھا۔ چنانچہ جب ساحل نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو میں اپنے کیبن میں جانے کے

لئے مڑا۔ میرے دائیں ہاتھ پر اوپر جانے کا زینہ بنا ہوا تھا۔

لوہے کے گھومتے ہوئے زینے پر جہاز کے اس حصے پر سناٹا طاری تھا اور اس پر بنائے ہوئے لوہے کے زینے پر لکڑی کی کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ اتنی واضح تھی کہ بغیر سر اٹھائے ہوئے میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوچا کہ یہ لکڑی کے کھڑاؤں کی آواز...... آہ میرے مالک...... لکڑی کی کھڑاؤں کی یہ آواز میری شناسا ہے۔ یہ سو فیصدی سادھان وردھانی ہے۔ مہا بھکشو وردھانی۔ بمشکل تمام میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ چار سیڑھی اوپر گیروے لباس میں زینے کی ریلنگ پکڑے سادھان وردانی کھڑا ہوا تھا۔ ہماری نظریں ملیں اور مجھے یوں لگا جیسے میرا دم نکل گیا ہو۔ اس کے پتھریلے چہرے پر نفرت کی تحریر لکھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں سے کسی حملہ آور چیتے کی سی وحشت ناک چنگاریاں بن کر برس رہی تھیں۔ میں نے صرف ایک لمحے سوچا، خوف و دہشت کے یہ لمحات کہاں کہاں گزار دوں اور کیسے کیسے حالات سے نمٹوں؟ اور اس کے بعد میں نے اپنی ذہنی قوتوں کو جمع کیا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں اس لئے مسکرایا تھا کہ اس پرانی عبودیت کو بیدار کر سکوں۔ میں اس کا بودھی ستو تھا۔ میں مستقبل کا مہتر بدھا تھا۔ مگر میری مسکراہٹ میرا ساتھ نہ دے سکی۔ اس کے ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے۔ اس نے سیدھا ہاتھ بلند کیا جیسے مجھ پر کسی غیر مرئی نیزے سے وار کرنا چاہتا ہو اور وہ ایک سیڑھی نیچے اتر آیا۔ اور پھر اس کے حلق سے ایک عجیب سی مشینی آواز نکلی۔

”خا...... قان......“

میں کچھ نہ سمجھا۔ اچانک ہی میرا پورا جسم مڑا اور میں نے مڑتے ہی راہداری میں دوڑنا شروع کر دیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سب غیر ارادی طور پر ہو رہا ہو۔ زیادہ دور نہیں دوڑا تھا کہ اچانک ہی میرے قدموں میں پھر رکاوٹ پیدا ہوئی اور اب جیسے میرے سارے بدن کی طاقت سلب ہو گئی تھی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے بے شمار بلاؤں نے مجھے گھیر لیا ہو۔ میں گھر گیا تھا۔ واقعی میں گھر گیا تھا۔

راہداری کے دوسرے سرے پر راستہ روکے، کمر پر دونوں ہاتھ رکھے میرا ازلی دشمن ہیگ کھڑا ہوا تھا۔ آہ...... واقعی، اس وقت جو صورتحال میری ہو گئی تھی، خدا کسی دشمن کی بھی نہ کرے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے بدن کی ساری قوتیں کھنچتی جا رہی ہوں اور میں کسی بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ ایسی مصیبت میں۔ جس میں میری

مدد اب کوئی نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔ چاہے وہ سلطان چچا ہوں جنہوں نے ایک چیف کمانڈر کی طرح میری ہر مشکل کو حل کر دیا تھا۔ لیکن یہ مشکل بھلا کیسے حل ہو گی؟

جہاز کے نچلے عرشے کی مدھم روشنی میں ہیگ کے سفید گھنگھریالے بال مجھے مٹیالے اور بے جان نظر آ رہے تھے۔ مجھے اس کا چہرہ موت کا چہرہ معلوم ہوتا تھا، تاریک اور پتھرایا ہوا۔ وہ راہداری کے درمیان میں کمر پر ہاتھ رکھے اس طرح کھڑا تھا جیسے کسی موی مجسمے کو سہارا دے کر کھڑا کر دیا گیا ہو۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی وہ اعلیٰ تراش کا ریشمی سوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کی انگلیوں میں ہیرے جڑی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ پھر وہ میری طرف ایک قدم آگے بڑھا اور اس نے مجھ سے کہا۔

"ایکسکیوزمی آفیسر! میں چیف اسٹیورڈ کی تلاش میں ہوں۔ کیا آپ میری رہنمائی کریں گے؟" ہیگ کا لہجہ ہمیشہ کی طرح مہذب اور نرم تھا جیسا کہ اس کی عادت تھی۔ میرے شدت سے دھڑکتے ہوئے دل کو ہلکے سے قرار کا احساس ہوا۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے موت کے تاریک اندھیرے میں مجھے جیسے امید کی کوئی کرن نظر آئی ہو۔ اس نے مجھے آفیسر کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ میری وردی رائل نیوی کی روایتی وردی تھی اور ایسا ہی میرا حلیہ بھی تھا۔ خاص قسم کی داڑھی اور سیاہ چشمہ جسے میں نے رات میں بھی اتارنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ آہ، کیا یہ چیزیں واقعی میرے کام آ رہی ہیں؟ واقعی کچھ ایسا ہی ہوا ہے؟ ہیگ میرے انتظار میں نہیں کھڑا ہوا بلکہ وہ میری مدد چاہتا ہے۔

میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور اسکاٹ لینڈ کے ٹھیٹ لہجے میں کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، میں چیف اسٹیورڈ کا اسسٹنٹ ہوں؟ گیٹ لاسٹ۔" میرے بھاری لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ ہیگ ایک دم سنبھل گیا۔

"سوری سر!" اس نے ذرا سا خم ہو کر کہا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ قیمتی سگار اور اعلیٰ مردانہ سینٹ کی مہک دور تک میرا پیچھا کرتی رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ ایک بار پھر مڑ کر دیکھوں کہ کہیں ہیگ میری طرف دیکھ تو نہیں رہا ہے؟ لیکن میری ہمت نہ ہوئی۔ وردان سادھانی کے کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ اب مجھے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اور میں اپنے بے جان بدن میں جان پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خود کو اطمینان دلا رہا تھا کہ وہ میرے پیچھے نہیں آ رہا اور مجھے فی الحال اپنے دونوں دشمنوں سے عارضی نجات مل گئی ہے اور اب میرے لئے [illegible] کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ میں اپنے کیبن میں جا کر اپنی

حالات سنبھالوں۔ میرے فرشتے بھی یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ اس جہاز پر دو خطرناک دشمن میری گھات میں ہیں۔ اس وقت تو میں ہیگ سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہوں مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس طویل سفر میں دوبارہ جب میری اور اس کی مڈبھیڑ ہو گی تو وہ پھر مجھ سے دھوکا کھا جائے گا؟ آہ، ایک طرف تو ہیگ سے نفرت۔ فرض کر لو اگر میں ہیگ سے انتقام لینے میں کامیاب ہو بھی گیا تو وردان سادھانی اور اس کے ساتھ اس پراسرار بھکشو سے میں کیسے نجات حاصل کروں گا جو پتہ نہیں کس طرح سینکڑوں میل دور سے یہاں تک آ گیا ہے اور ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے جب اور جہاں چاہے مجھ تک پہنچ سکتا ہے؟ یہ بات اور یہ تصور میرے لئے بڑا جان لیوا تھا۔

میرے قدموں میں شرابیوں جیسی لڑکھڑاہٹ تھی اور میں آہستہ آہستہ اپنے کیبن کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مجھے اب اس بات کا احساس ہوتا جا رہا تھا کہ میں دنیا کے کسی بھی حصے میں پہنچ جاؤں، کتنی ہی حفاظتی تدبیریں کر لوں، پراسرار بدھ بھکشو میرا پیچھا کرتے رہیں گے۔ سیوک سندھورتی اور وردان سادھانی میری جان کے لاگو ہیں، کبھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے وہ میرا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ میں کتنی ہی حفاظتی تدبیریں کر لوں، ان کی زد سے باہر نہیں نکل سکتا۔ انہیں میری تمام سیاہ کاریوں، میرے تمام جرائم کا علم ہے۔ میں ان کی توقعات پر پورا نہیں اترا۔ میں تو ایک عام سا مجرم اور اوباش ثابت ہوا۔ ایک ایک بات مجھے یاد آ گئی تھی۔ میں نے ان کے مقدس چشمے میں غسل کیا تھا۔ ان کا مذہبی گیروا لباس پہنا تھا۔ ان کے دھرم سنگھاسن پر بیٹھ کر کائنات کے اسرار سے آگہی حاصل کی تھی اور پھر ان کا مالک و مختار بن کر ان کو دھوکا دیا تھا۔ وردان سادھانی کی تنبیہ کے باوجود میں نے اشبھ بھاؤنا کر کے اپنے اوپر مصیبتوں کے دروازے کھول لئے تھے۔ میں نے بہت کچھ کیا تھا۔ ایلس فیوری اور عالیہ کے ساتھ جسمانی رابطے قائم کئے تھے۔ اور میں نے، جسے وہ بودھی ستو سمجھتے تھے، قتل و غارت گری بھی کی تھی۔ میں نے ان کے دھرم کا مذاق اڑایا تھا۔ دو کوڑی کا ہو گیا تھا میں۔ ایسے حالات میں اگر وہ مجھ سے انتقام لینے پر تل جاتے تو اس میں حیرت کی کون سی بات تھی۔

میرا رُواں رُواں خوف سے کانپ رہا تھا۔ مجھے وردان سادھانی کا وہ لہجہ یاد آ رہا تھا جو اس نے زینے پر کھڑے ہو کر اژدھے کی طرح پھنکار کر میرا نام لے کر مجھے پکارا تھا۔ خا...... قان...... [illegible] نے محسوس کر لیا تھا کہ اس غیر انسانی چیخ میں انتقام کا جہنم بھڑک رہا

ہے۔ ساتھ ہی مجھے اس بات کا بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ کہیں بھی کائنات کے کسی بھی گوشے میں یا اس کیبن کے آہنی حصار میں اتنا ہی غیر محفوظ ہوں جتنا گاشر برم کی پہاڑیوں کی دھار میں اس شیطانی ٹولے کے رحم و کرم پر تھا۔ آہ...... کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہیگ سے نمٹ بھی لیا جائے مگر یہ پراسرار قوتیں کسی بھی طور میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ میرا خیال ہے شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دے کر بیٹھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کوئی بھی مضبوط سے مضبوط چار دیواری مجھے ان بدھ بھکشوؤں کے انتقام سے نہیں بچا سکتی۔ جو کچھ ہونا ہے، وہ ہو کے ہی رہے گا۔ اگر مجھے ہیگ سے نمٹنا ہے تو شکاریوں کی طرح چوکس رہنا اور موقع پاتے ہی وار کرنا ہوگا۔ ہیگ سے میں نمٹ لوں گا لیکن ان بھکشوؤں سے مجھے نجات حاصل نہیں ہوگی۔ میں ان کے انتقام سے نہیں بچ سکتا۔

کیبن کے اندر داخل ہو کر میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھا یہ سوچتا رہا۔ پھر میں نے اپنے اندر کے خاقان کو آواز دی اور اسے ملامت کرتے ہوئے کہا۔

"کیا اسی طرح تو زندگی میں قدم آگے بڑھائے گا خاقان؟ کیا اسی طرح خوف کی چار دیواری میں پناہ لے گا؟ ہوش میں آ...... زندگی اس قدر معمولی چیز نہیں ہے کہ تو اس طرح سے اسے کھونے پر تل جائے۔ سمجھ رہا ہے نا۔ اپنے آپ کو سنبھال۔ جب یہی سب کچھ کرنا ہے تو خوف سے مرنے سے کیا فائدہ؟"

یہی سب کچھ سوچ کر میں اٹھا، منہ ہاتھ دھویا اور اس خیال سے کہ بمشکل ابھی ساڑھے دس بجے ہیں کیوں نہ فرسٹ کلاس کے ڈائننگ ہال کا ایک چکر لگاؤں۔ میں نے یہ آخری فیصلہ کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سلطان چچا کا بھیجا ہوا سوٹ کیس کھولا اور اسے دیکھ کر میری آنکھیں فرطِ مسرت سے جھک گئیں۔ میں جانتا تھا کہ سلطان چچا بہت عظیم انسان ہیں اور میں واقعی ان تک پہنچ کر زندگی کی مشکلوں سے دور ہو گیا ہوں۔ ڈنر سوٹ، دن میں پہننے کے لئے ہلکے رنگ کے سوٹ، گہرے رنگ کے شام کے لباس سلیقے سے استری کئے ہوئے رکھے تھے۔ اس کے علاوہ مردانہ استعمال کی بے شمار چیزیں بھی موجود تھیں۔ بہرحال میں نے بڑے اہتمام سے ڈنر سوٹ اور اس کے لوازمات نکال کر بستر پر جما دیئے اور ایک بار پھر اپنے آپ کو سہارا دے کر وقت کے دھارے پر بہنے کے لئے تیار ہو گیا۔ تمام تر تیاریاں مکمل کرنے کے بعد میں نے لباس پہننے کی کوشش کی،

لیکن قمیض پہنتے ہی میری خوشی کافور ہو گئی۔ قمیض کا کالر پورے ایک انچ تنگ تھا اور آستینیں میری کہنی سے بمشکل ایک بالشت آگے پہنچ کر ختم ہو جاتی تھیں۔ پتلون نہ صرف کمر پر تنگ تھی بلکہ ٹخنوں تک پہنچنے میں اسے پورے تین انچ کی ناکامی ہوئی تھی۔ کوٹ بھی قمیض کی طرح کوتاہ آستین تھا۔ ارے باپ رے...... یہ کیا ہوا؟ میں نے سوچا تھا کہ سلطان چچا نے میری ہر مشکل حل کر دی۔ لیکن یہاں مار کھا گئے تھے وہ۔ میں نے جھلاہٹ کے ساتھ تمام کپڑے ایک طرف ڈال دیئے۔ اب تو یہ تمام چیزیں میرے لئے بیکار تھیں۔ اس سوٹ کیس میں سے صرف ایک سلیپنگ گاؤن، ایک شب خوابی کا لباس، موزے، بنیان اور شیونگ کٹ استعمال کر سکتا تھا۔ اس قدر شدید غصے کا شکار ہو گیا تھا میں کہ میں نے سارے سامان کا ایک بنڈل بنایا اور پورٹ ہول کھول کر تینوں استری کئے ہوئے تازہ تازہ سوٹ سمندر کے حوالے کر دیئے۔ اب اس جہاز پر اور پورے سفر کے دوران میں یا تو لیفٹیننٹ کی وردی پہننے پر مجبور تھا یا شب خوابی کا یہ لباس۔ باقی نام اللہ کا تھا۔

میں نے وردی اتاری اور سارا پروگرام ملتوی کر کے شب خوابی کا لباس پہن کر بستر پر لیٹ گیا۔ اب جو ہو گا صبح کو دیکھا جائے گا۔

⁂☆⁂

رات گزر گئی۔

دوسری صبح طبیعت پر ایک تکدر تھا۔ زندگی کیا ہے۔ صرف ایک سوچ۔ نہیں، سوچ نہیں بلکہ ایک بھرپور عمل۔

ذہن نے سوال کیا۔ ”تم کون ہو؟“

”خاقان جمشیدی۔“

”تمہارا کردار کیا ہے؟“

”کردار؟“

”ہاں کردار۔“

”کچھ بہتر نہیں۔“

”کیوں؟“

”ماحول۔“

”غلط۔ کون سے ماحول کی بات کرتے ہو؟“

”وہ جو مجھے میسر ہوا۔“

”کچھ نہیں۔ تم نے اپنے راستے خود منتخب کئے ہیں۔“

”میں نہیں مانتا۔“

”آخر کیوں؟“

”کاشر برم سے میری کوئی شناسائی نہیں تھی۔ وقت مجھے وہاں لے گیا۔ پتھر کے مجسمے کی آغوش میری طلب نہیں تھی۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے؟“

”اسی سے سب کچھ ہوا۔“

”ہونہہ......“

”ہونہہ۔“

اپنے آپ سے لڑنا آسان نہیں ہوتا۔ میں جھنجلا کر باہر نکل آیا۔ بالائی عرشہ عدن اور اسکندریہ جانے والے تاجروں اور بحیرہ روم کی مختلف بندرگاہوں تک سفر کرنے والے سیاحوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے ایک ڈیک چیئر گھسیٹی اور اس پر بیٹھ گیا۔ میرا اسٹیورڈ میرے پاس آیا۔

”کچھ پیش کروں سر؟“

”نہیں شکریہ۔ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟“

”کتاب۔“

”کیسی کتاب؟“

”یہ میں آپ کے لئے لایا ہوں۔ پچھلے سفر میں کوئی مسافر اسے بھول گیا تھا۔“

”دکھاؤ۔“ میں نے کہا۔

”جی سر۔“ اس نے کتاب میری طرف بڑھا دی۔ ایران کا چھپا ہوا مثنوی مولانا روم کا نادر و نایاب نسخہ تھا۔

”بہت شکریہ۔ میں اسے رکھ سکتا ہوں؟“

”مجھے خوشی ہوگی۔“

”ایک بار پھر تمہارا شکریہ۔“

اسٹیورڈ چلا گیا اور میں اس کتاب میں گم ہو گیا۔ میں نے بچپن میں یہ کتاب پڑھی تھی۔ اور اب نہ جانے کتنے برس کے بعد یہ کتاب میرے ہاتھ لگی تھی۔

میری آنکھیں کتاب پر لگی ہوئی تھیں لیکن ذہن نہ جانے کہاں تھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”راہِ نجات۔“

”نجات کے کتنے راستے ہیں؟“

”ہزاروں۔“

”آہ، نہیں۔ میں نے انہی راستوں کو تلاش کیا ہے لیکن ماحول مجھے بھٹکا دیتا ہے۔ میں یہ سب کچھ نہیں چاہتا جو مجھے حاصل ہو گیا ہے۔“

حالانکہ جہاز کا ماحول بہت اچھا تھا۔ اب میں کیا کہتا اور کس سے کہتا کہ سلطان چچا

جیسے لوگ کیا ہوتے ہیں۔ لیفٹیننٹ کی وردی میں نجانے کیسی کیسی مصیبتوں سے گزرتے جہاز پر چھپے رہنا کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن اب میں ایک شاندار کیبن کا مالک تھا اور بڑے با عزت طریقے سے سفر کر رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ نادیدہ قوتیں بدستور میرے پیچھے لگی ہوئی تھیں جو وردان سادھانی اور سندھورتی وغیرہ کی تھیں۔ جو تحفہ مجھے مندر سے ملا تھا اور جس نے میری زندگی تباہ کر دی تھی۔ حقیقی معنوں میں یوں لگتا تھا جیسے بے شمار نادیدہ پراسرار قوتیں میرے پیچھے پڑی ہوں۔ دھرم شوالہ، گاشر بھرم اور نجانے کیا کیا۔ یہ عذاب کسی اور کی زندگی میں کہاں ہوں گے۔ بس شِو مندر میں اس بت کے قدموں میں بیٹھنا ہی عذاب بن گیا تھا ورنہ باقی زندگی میں اور کوئی مرحلہ ایسا نہیں تھا جو تکلیف دہ اور پریشان کن ہو۔ بس اس کے بعد وہ کمبخت غلط کار لوگ میرے پیچھے پڑ گئے تھے اور بلاوجہ مجھے ایسی پراسرار قوتیں دینے پر تل گئے تھے جن کا پہلی بات تو یہ کہ میں اہل نہیں تھا اور دوسری بات یہ کہ میں انہیں پسند بھی نہیں کرتا تھا۔ نہ میرا دین نہ میرا دھرم۔ وہ نجانے مجھے کیا سے کیا بنانے پر تل گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے کبھی اور کسی وقت بھی وہ سب کچھ بن جانا پسند نہیں کیا تھا جو مجھے بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

اچانک میری چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی مجھے مسلسل دیکھے جا رہا ہو۔ انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے کہ اس طرح کی باتوں کا پتہ چل جاتا ہے۔

میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر میری نگاہ اس شخص پر پڑ گئی جو اچھی خاصی لمبی تڑنگی جسامت کا مالک تھا۔ سرخ وسفید رنگت، چھوٹی سی داڑھی، گدی پر لمبے بھورے بالوں کی جھالر۔ اس کا لباس انتہائی قیمتی تھا، بہت ہی شاندار تراش کا سوٹ پہنے ہوئے تھا وہ۔ لیکن مجھے یہ حیرت ہوئی کہ اس کی یہ دلچسپی میرے لئے کیوں ہے؟ اچانک ایک اور خیال میرے ذہن میں گزرا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ہیگ کا ساتھی ہو۔ وہ مجھے کیوں گھور رہا ہے؟ بس انسانی ذہن میں لاکھوں چور ہوتے ہیں۔ میرے ذہن میں ہیگ کا چور تھا۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ہیگ میرے سامنے بھی آ چکا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہیگ کو مجھ پر شبہ ہو گیا ہو اور اس نے کسی کو میری نگرانی پر مقرر کر دیا ہو۔ کیا واقعی ہیگ کے اس ساتھی نے مجھے پہچان لیا ہے یا پھر صرف ہیگ کو اس بات کا شبہ ہوا ہے اور اس نے اس شخص کو مجھ پر نظر رکھنے کے لئے تعینات کیا ہے۔

ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن میں ایسے بہت سے سوالات کوند گئے۔

اُس نے بھی مجھے اپنی جانب متوجہ محسوس کر لیا تھا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مدھم مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"معافی چاہتا ہوں جناب! اصل میں آپ کے ہاتھ میں مثنوی مولانا روم دیکھ کر میں ان ہوا تھا۔"

اس کے ان الفاظ نے مجھے تھوڑی سی تسلی بخشی۔ میں نے مسکرا کر اطمینان کا سانس لیا احتیاط سے کتاب بند کر دی۔ وہ شخص پھر بولا۔

"میرا نام احتشام بے ہے۔ اور میں ترکی کے شہر انقرہ کا رہنے والا ہوں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر جناب! آپ کی شخصیت بہت ہی متاثر کن ہے۔"

ا نے کہا۔

"یہ آپ کی محبت ہے جناب! ویسے میں انقرہ یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر ہوں۔"

"مزید خوشی ہوئی۔"

"کیا آپ کو بھی تاریخ سے کوئی دلچسپی ہے؟" احتشام بے نے سوال کیا اور میرے ن میں حس ظرافت پھڑک اٹھی۔

"جی ہاں...... اپنی پیدائش کی تاریخ سے۔ اس کے بعد اپنے خاندان کی تاریخ سے۔ دلچسپی تو ہوتی ہی ہے۔"

احتشام بے ہنسنے لگا، پھر بولا۔ "میں ان دنوں مصر کے آثارِ قدیمہ پر تحقیقی کام کر رہا اں۔"

"میں نے کہا نا آپ کی شخصیت دلچسپ اور پراسرار ہے۔"

وہ بہت دلچسپی سے مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ "ایک بات پر مجھے حیرانی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"آپ شاید بحریہ کے ملازم ہیں لیکن فارسی زبان سے اس قدر دلچسپی رکھتے ہیں۔"

"آپ کا میری قومیت کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں صحیح اندازہ نہیں لگا سکا۔" احتشام بے نے جواب دیا۔

"میں مسلمان ہوں اور ہندوستان کا رہنے والا ہوں۔ ویسے آپ کو پتہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان مثنوی مولانا روم کو حکمت و معرفت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔"

"سبحان اللہ...... سبحان اللہ...... کیا بات ہے۔ میں بہت متاثر ہوا ہوں آپ سے۔"
احتشام بے کی روشن آنکھیں کچھ اور روشن ہو گئیں۔
"ویسے آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"
"اسکندریہ۔"
"یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے۔ میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔"
"اسکندریہ میں میری بیٹی مصریات کے تحقیقی کام میں میری مددگار ہے۔ ویسے میرے ساتھ ایک اور خاتون ہیں جو اس سلسلے میں میرے ساتھ تعاون کر رہی ہیں۔ وہ اور ان کے شوہر میرے ساتھ ہی سفر کر رہے ہیں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ اس تحقیقی منصوبے میں وہی سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ اسکندریہ کا یہ سفر کر رہا ہوں۔ دونوں میاں بیوی بہت ہی اعلیٰ فطرت کے مالک ہیں۔ ویسے میں اور میری بیٹی ارسلہ فنی ماہرین کی حیثیت سے اس تحقیقی کام میں ان کے برابر کے شریک ہیں۔"
میں اس شخص کی سادہ دلی سے بہت متاثر تھا اور اسے بڑا پسند کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی مسٹر اسمتھ اور ان کی بیوی کے بارے میں بہت سی تفصیل بتائی۔ بڑا دلچسپ اور کھل مل جانے والا آدمی تھا اور پہلی ملاقات میں اس نے اپنے بارے میں اتنی تفصیل بتا دی جس سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ سادہ دل بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ صاحب علم لوگوں کی طرح سادہ مزاج اور بھولا آدمی ہے۔ گفتگو کے دوران اس نے بتایا کہ وہ کئی زبانوں پر عبور رکھتا ہے، ان میں انگریزی، فرانسیسی، عربی، فارسی اور عبرانی شامل ہیں۔ قدیم مصری تحریروں کا پڑھنا اور پڑھانا اس کا خاص شعبہ ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"میں فارسی کے علاوہ عربی زبان بھی جانتا ہوں۔"
"واہ...... یہ تو بہت ہی خوبصورت بات ہے۔" اس نے پُر اشتیاق لہجے میں کہا۔
"ویسے ایک بات آپ بتا سکیں گے کہ آپ مصر کیوں جا رہے ہیں؟ میں معافی چاہتا ہوں کہ بڑے بے ڈھنگے پن سے آپ کے نجی معاملات میں مداخلت کر رہا ہوں مگر یہ پوچھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے بتایئے۔" احتشام نے یہ بات اتنی سادگی سے کہی تھی کہ میں سادگی سے مسکرا دیا۔
"بھلا آپ کو بتا دینے میں کیا حرج ہے۔ اصل میں کچھ سرکاری اور کچھ ذاتی کام سے نکلا ہوں میں۔ اسکندریہ میں کچھ مصروفیت تو سرکاری ہے، پھر مجھے ایک پارٹی سے حساب

چکانا ہے اور اس کے بعد میں بالکل فرصت میں ہوں۔"
"اس کا مطلب ہے کہ اس کے بعد آپ اسکندریہ میں گھومیں پھریں گے۔"
"کیوں نہیں۔"
اچانک احتشام نے اپنی گردن جھکائی اور رازداری سے بولا۔ "سنیے، اگر آپ کسی نفع بخش علمی کام سے دلچسپی رکھتے ہیں تو ہمارے ساتھ شریک ہو جایئے۔ ہمیں ایک عربی جاننے والے کی ضرورت بھی ہے۔"
"لیکن......"
"نہیں، بالکل نہیں۔ میری بات سن لیجئے، سرکاری کام نمٹا کر آپ اپنا وہ حساب کتاب بھی چکا لیں جس کے لئے ابھی آپ نے مجھے بتایا ہے۔ مجھے پندرہ دن کے اندر بتا دیں کہ آپ ہماری اس مہم میں شامل ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ بس ایک سوال اور ہے میرا آپ سے۔"
"جی فرمایئے۔" میں نے دلچسپی سے کہا۔
"آپ یہ بتایئے کہ آپ کو بحریہ سے کتنے روز کی رخصت مل سکتی ہے؟"
میں ایک لمحے کے لئے الجھن میں پھنس گیا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ بڑے میاں کس نوعیت کے سرکاری کام میں مصروف ہیں؟ اور نفع بخش سے ان کی مراد کیا ہے۔ بہرحال یہ تفصیل جانے بغیر کچھ کہنا تو ممکن نہیں تھا۔ اور ویسے بھی میں ان سے مکمل طور پر جھوٹ بول رہا تھا میں کسی تفریحی یا تحقیقی کام سے سفر نہیں کر رہا تھا۔ بہرحال کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ ابھی فوری طور پر ساری تفصیل نہ وہ مجھے بتا سکتے تھے اور نہ میرے لئے پوچھنا ممکن تھا۔ میں نے گول مول سا جواب دیا۔
"سرکاری کام نمٹانے کے بعد مجھے ایک طویل رخصت کا حق حاصل ہو جائے گا۔ لیکن محترم احتشام بے! اگر آپ مجھے اپنی مہم کے بارے میں بتا دیتے تو میں اس پیشکش پر غور کر سکتا تھا۔"
"ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن بات اتنی بڑی ہے اور تفصیل طلب ہے کہ مختصراً نہیں بتائی جا سکتی۔"
"پھر جیسا آپ پسند کریں۔"
"یوں کرتے ہیں کہ دوپہر کا کھانا مسز اسمتھ اور مسٹر اسمتھ کے ساتھ ان کے کیبن

میں کھاتے ہیں۔ وہاں ذرا تفصیلی گفتگو ہو جائے گی۔ ویسے بھی جیسا میں نے آپ کو بتایا کہ یہ دونوں بڑے اچھے اور بڑی نفیس طبیعت کے مالک ہیں، آپ سے مل کر انہیں بہت خوشی ہو گی۔ معاف کیجئے گا، آپ کی شخصیت میں ایک ایسی کشش ہے جو انسان کو لمحوں میں اپنی جانب کھینچتی ہے۔ اور وہ دونوں میرا مطلب ہے مسٹر اینڈ مسز اسمتھ بڑے حسن پرست لوگ ہیں اور اچھی شخصیتوں کو دل سے پسند کرتے ہیں۔"

"آپ نے میری تعریف کا جواب دے دیا۔"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ آپ یقین کریں بالکل ایسی بات نہیں ہے۔ میں اب اجازت چاہتا ہوں۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ دوپہر کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھا رہے ہیں۔ میں اپنے ان دونوں دوستوں کو بھی یہ اطلاع دے دوں گا۔ اچھا اجازت۔"

احتشام بے بڑے تپاک سے مجھ سے رخصت ہوا۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے اپنا کیبن نمبر اور ملاقات کا وقت یاد کرایا۔ بہرحال وہ شخص چلا گیا اور میں اسے دیکھتا رہا۔ میرا اندازہ غلط تھا، یہ ہیگ کا ساتھی نہیں ہے، کچھ بھی ہو یہ ہیگ کا ساتھی نہیں ہے۔

بہرحال اس کے جانے کے بعد میں نے کتاب ایک طرف رکھی اور وقت گزاری کے لئے ریلنگ کے ساتھ ساتھ ڈیک پر ٹہلنے لگا۔ یہ ایک دلچسپ اور نئی صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔ حالانکہ میں نئی دوستیاں اور نئے منصوبے شروع کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔ چوری کی وردی پہن کر میں پولیس سے بچتا بچاتا نامعلوم مقامات کی خاک چھاننے نکلا تھا اور وہ بھی محض اس لئے کہ مجھے اپنے بدترین دشمن سے اپنی تباہی اور بربادی کا بدلہ لینا تھا۔ انتقام کا یہ تصور میرے دل و دماغ پر اس قدر حاوی تھا کہ دنیا بھر کی تمام سوچیں پس پشت پڑی تھیں۔ میں کچھ اور سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہ گیا تھا۔

بہرحال یہ ساری صورتحال درپیش تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی ایک اور بھیانک حقیقت جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا یعنی وردان سادھانی کی جہاز پر موجودگی۔ وہ کوئی ہولناک منصوبہ لئے جہاز پر موجود تھا اور میں نے جو کچھ اس کے چہرے پر دیکھا تھا اسے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ جہاز پر ہی مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ پھر اور بھی بہت سی مصیبتیں تھیں۔ وردی کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا لباس بھی نہیں تھا۔ ایسی الجھنوں میں کسی علمی یا تحقیقی مہم میں شریک ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور پھر میں اس شعبے کا آدمی بھی نہیں تھا۔ تاریخ مصر میں نے سرسری طور پر پڑھی تھی اور کسی

نام سیاح سے زیادہ مجھے مصر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی حالانکہ قدیم مصر کی کہانیاں ہر نوجوان کے لئے پراسرار ہوتی ہیں لیکن میں کیا کروں اس بات کو کہ میرے بچپن ہی سے زندگی پراسراریت کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ بھلا ایک مسلمان کے لئے یہ کیا ضروری تھا کہ وہ بدھ مذہب کا پیروکار بن جائے اور بدھ بھکشوؤں کے جال میں اس طرح پھنس جائے کہ اپنی ساری زندگی کا محور ہی تبدیل کر دے؟ یہ بات میں اپنے ذہن سے کبھی نہیں مٹا سکا تھا۔ جب بھی اس کے بارے میں سوچتا، دل چاہتا کہ تنہائی ہو اور میں آنکھیں بند کر کے ان تمام معاملات سے نمٹنے کا بندوبست کر سکوں۔

بہرحال ایک ڈیڑھ گھنٹے ٹہلنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ دوپہر کا کھانا تو مجھے بہرحال ان لوگوں کے ساتھ کھانا چاہئے کیونکہ جہاز پر ابھی سفر خاصا طویل رہے گا اور یہ لوگ مجھے ملتے رہیں گے۔ اگر میں انہیں نظرانداز کر دوں گا تو بہت اچھی گفتگو کرنے والا سادہ لوح پروفیسر احتشام بے میرے بارے میں کوئی اچھا خیال نہیں رکھے گا۔ لیکن اس نفع بخش تحقیقی کام میں چاہے وہ کتنا ہی نفع بخش کیوں نہ ہو، اپنے آپ کو نہیں پھنساؤں گا۔ بہرحال جہاز پر ایک ایسا شخص تو مل گیا ہے جس سے گفتگو کر سکتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کبھی مجھے بھی اس کی ضرورت پیش آ ہی جائے۔ اس کے علاوہ اس انگریز جوڑے مسٹر اینڈ مسز اسمتھ سے بھی مل لوں گا۔ شاید وہ میری فوری ضرورت یعنی سویلین لباس کا مسئلہ حل کرنے میں مددگار ہوں۔ اس وقت حقیقت یہ ہے کہ یہ وردی میرے لئے عذاب جان بنی ہوئی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں جس طرح بھی ہو اس سے چھٹکارا حاصل کر لوں۔ میرے سامان میں ایک قیمتی سوٹ کیس موجود تھا مگر میں کیا کرتا سلطان چچا کی اس احمقانہ حرکت پر کہ انہوں نے میرے بدن کا تعین نہیں کیا تھا۔ اب ان کی اس محبت کو تو کسی بھی طور نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن محبت کے مارے سلطان چچا میری جسامت کا خیال نہیں رکھ سکے تھے۔

دن کا باقی حصہ میں نے اپنے کیبن میں ہی گزارا۔ طے شدہ وقت پر میں پروفیسر احتشام بے کے کیبن کی تلاش میں نکلا اور پھر ایک بار اس چکر دار زینے پر چڑھا اترا جہاں میں نے وردان سادھانی کو کھڑا دیکھا تھا۔ دن کے اجالے میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اس سیڑھی پر وردان سادھانی نظر آیا تھا۔ لیکن شاید وہ میری نظر کا دھوکا تھا۔ شاید ذہن نے تصور میں ہلکی روشنی میں کسی اور کو دیکھ کر ہی یہ خیالی تانا بانا تیار کر لیا تھا۔ مگر میں

نے جو آواز سنی تھی وہ آواز تو اسی کی تھی۔ میں اس بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ بس دل پر کچھ لرزشیں لئے ہوئے میں احتشام بے کے کیبن پر پہنچ گیا۔ دستک دی تو احتشام بے نے خود دروازہ کھولا۔ مجھ سے کچھ ہی دیر پہلے وہ انگریز جوڑا وہاں پہنچا تھا اور انہوں نے ابھی نشستیں بھی نہیں سنبھالی تھیں۔ مجھے دیکھ کر دونوں کھڑے ہو گئے۔

مسز اسمتھ کی آنکھوں میں پسندیدگی کے آثار نظر آئے اور ہم لوگوں میں تعارف ہوا۔ مسز اسمتھ نے میرا ہاتھ، ہاتھ میں لیا تو چھوڑنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ ہنری اسمتھ ایک نیاز مند شوہر نکلا اور مجھے وہ پرانا جوڑا یاد آ گیا یعنی مسٹر اور مسز آدم۔

باتوں باتوں میں مسز اسمتھ نے بتا دیا کہ ان کے شوہر نامدار مسز اسمتھ کے دولت مند باپ کے کارندے تھے۔ شادی کے بعد آرام و آسائش میسر ہوا تو انہوں نے چھوٹی سی توند نکال لی اور اب وہ بیوی کی رقموں سے کاروبار کرتے تھے۔ یہ دونوں میاں بیوی عام انگریزوں سے بہت حد تک مختلف تھے۔ اتنے مختلف کہ گھنٹے بھر میں انہوں نے اپنے خاندانی حالات اور معاشی پس منظر سب کچھ بتا دیا۔ ویسے یہ بہت بڑی بات تھی کہ انہوں نے اپنی حیثیت بھی بتا دی۔ یہ انگریزوں کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن دنیا بھر کے نو دولتیوں کی طرح ڈینگیں مارنے کے مرض میں مبتلا تھے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں خوش مزاج تھے اور ان کی باتوں میں مزاح کا رنگ غالب تھا۔ چنانچہ میرا دل بہت اچھی طرح بہل گیا اور میں جو پچھلے کافی دنوں سے شدید الجھنوں کا شکار تھا ان کی باتوں میں اس طرح بہل گیا۔ ویسے پروفیسر احتشام بے نے جس نفع بخش کام کا ذکر کیا تھا میں نے اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ مجھے اس کے بارے میں جاننے کا کوئی شوق بھی نہیں تھا۔ لیکن یہ جان کر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ پروفیسر نے صبح جس اشتیاق سے مجھے اس کام میں شریک ہونے کی دعوت دی تھی اس وقت اس کا ذکر بھی نہیں ہوا تھا۔ یعنی کھانے سے پہلے، کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد اس مہم کا تذکرہ تک نہیں آیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ شرمندہ شرمندہ سا ہو۔ زیادہ تر باتیں مسز اسمتھ ہی کر رہی تھیں۔ اس نے یہ تک نہ بتایا کہ وہ لوگ جو مصر جا رہے ہیں تو آخر ان کا ارادہ کیا ہے۔ ایک بار پروفیسر کی بیٹی ارسلہ کا تذکرہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ وہ قاہرہ میں کسی ہوٹل میں مقیم ہے اور دن بھر کتابیں پڑھتی رہتی ہے۔

''کاش میں تمہیں اس کی تصویر دکھا سکتا۔ تمہیں حیرانی ہوتی وہ بڑی شاداب اور ترو

تازہ لڑکی ہے۔ کتابیں بے شک پڑھتی ہے لیکن کتابوں میں گم رہنے والی لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔ کشیدہ قامت ہے اور کھلاڑی عورتوں کی طرح کمان جیسے بدن کی مالک ہے۔ اس کی آنکھیں ہنستی ہوئی ہیں اور ہونٹ بولتے ہوئے۔''

پروفیسر نے اس طرح اپنی بیٹی کے رنگ و روپ، قد و قامت اور جسمانی موزونیت کا ذکر کیا کہ میں نے اس کی تصویر اپنی آنکھوں میں بنا لی۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ اگر اس بے وقوف جوڑے کی جگہ پروفیسر کی بیٹی اس کی ہمسفر ہوتی تو میرا سفر بڑے مزے سے کٹ جاتا۔ یہ انگریز میاں بیوی تو مجھ سے بھی گئے گزرے نکلے۔ مجھے کم سے کم علم تاریخ سے تھوڑی بہت دلچسپی تھی، انہیں اس کے علاوہ کچھ نہیں معلوم تھا کہ مصر میں بہت سے فرعون گزرے ہیں۔ مسز اسمتھ نے کہا۔

''فرعونوں کے علاوہ وہاں ملکہ قلوپطرہ کا بھی تو ذکر نکلتا ہے۔''

''ہاں، قلوپطرہ ایک مشہور عورت تھی۔ لیکن ایک اور ملکہ تھی جس کا نام نفرطیطی تھا۔''

''نفرطیطی...... بڑا مشکل نام ہے۔''

''اور ایک اور عورت تھی، حطشی پست۔ ان دونوں میں سے ایک ملکہ کا سر لمبا تھا تو وہ خاص طرز کا تاج پہنتی تھی تا کہ اس کا یہ جسمانی عیب نظر نہ آئے۔'' پروفیسر احتشام بے ان لوگوں کو پاگل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ دونوں میاں بیوی احمقوں کی طرح پروفیسر احتشام بے کی صورت دیکھ رہے تھے اور میں نے بھی پروفیسر احتشام بے کو غور سے دیکھا یہ سوچ کر کہ کہیں وہ ان دونوں کو بیوقوف تو نہیں بنا رہا ہے؟ جس نفع بخش کاروبار میں اس نے ان دونوں کو شامل کیا تھا وہ کھیل کوئی دھوکا ہی نہ ہو۔ اس دنیا میں کسی کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون کتنے پانی میں ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔ ویسے یہ بڑی حیران کن بات تھی کہ ان دو نیم تعلیم یافتہ انگریزوں کے ساتھ مل کر پروفیسر احتشام بے کس قسم کا علمی کام کر رہا ہے۔ لیکن بہرحال یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ جب مجھے ان لوگوں سے کچھ لینا ہی نہیں ہے تو ان کے بارے میں سوچنے سے کیا فائدہ؟ بہرحال نجانے کیوں میرے ذہن میں ایک عجیب سا الجھا ہوا تصور آ بسا تھا۔

میں نے کافی وقت ان لوگوں کے ساتھ گزارا اور کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے ان سے اجازت لی اور اپنے کیبن میں واپس آ گیا۔ آہ...... یہ وردی میرے لئے کس قدر عذاب جان بنی ہوئی تھی۔ میں کیا کہوں اس کے بارے میں۔ بہرحال میں وردی

میں ہی بستر پر دراز ہو گیا۔ پھر نجانے کیوں میری آنکھوں میں ایک بے نقش چہرہ ابھر آیا۔ سڈول بدن، کمان جیسی کھنچی ہوئی جوانی۔ پروفیسر نے نجانے کیوں اتنی تفصیل سے اپنی بیٹی کے حسن و جمال کا تذکرہ کیا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش تو بے شک میری نگاہوں میں واضح نہیں تھے کیونکہ پروفیسر نے اس کے چہرے کے نقوش کا کوئی تفصیلی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ نجانے کیوں بار بار میرے ذہن میں یہ تصور آ رہا تھا کہ اگر یہ لڑکی اس وقت اپنے باپ کے ساتھ سفر کر رہی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

پھر اچانک ہی مجھے اپنے اندر کچھ جھٹکے سے محسوس ہوئے۔ ایک لڑکی کا تصور کر کے میں کس طرح دیوانگی کا شکار ہو رہا ہوں حالانکہ وہ میرے لئے بالکل اجنبی ہے۔ ایک ایسی اجنبی شخصیت جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن فطرت کی یہ تبدیلی کیسی انوکھی ہے۔ مجھے یہ تمام باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ کیونکہ ظاہر ہے اسکندریہ کی بندرگاہ پر اترنے کے بعد پروفیسر احتشام بے اپنا راستہ لے گا اور میں ہیگ کا سایہ بن کر پتہ نہیں کن راستوں پر نکل جاؤں گا۔ بہرحال بڑی پریشان کن بات تھی۔

ایک بار پھر میری توجہ وردی کی جانب چلی گئی۔ اگر مجھے پورے سفر کے دوران اسی وردی میں رہنا پڑا تو کیا میں جہاز والوں کے لئے ایک یاد رہنے والی چیز نہیں بن جاؤں گا؟ وہ مجھے ایک عجوبہ ہی سمجھیں گے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ مجھے کہیں نہ کہیں سے کسی طرح کپڑے حاصل کرنے ہوں گے۔ حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ یہ پورا دن میں نے سوشل گفتگو اور خواہ مخواہ کے تعلقات بڑھانے میں گزار دیا تھا۔ مجھے اس عرصے میں کچھ کام کرنا چاہئے۔ بہرحال نجانے کب تک یہ الجھنیں میرے دل و دماغ پر سوار رہیں۔ اور پھر نیند نے مجھے آغوش میں لے کر تھپک تھپک کر سلا دیا۔

جاگا تو پوری طرح شام ہو چکی تھی۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر وردی کو جھاڑا اور صاف ستھرا کر کے بار کی جانب نکل گیا۔ میں بڑی اداسی اور تشنگی کے ساتھ جہاز کے بار میں بیٹھا کولڈ ڈرنک پیتا رہا۔ قریب ہی کی ایک میز پر میری ہی جسامت کا ایک امریکی نوجوان شاہ جارج پنجم جیسی داڑھی میں اپنا تمتمایا چہرہ چھپائے ہوئے ایک سبک سی انگریز لڑکی کے ساتھ مے نوشی میں مصروف تھا۔ وہ اپنے بے تکلف لباس اور بے ہنگم گفتگو سے پہچانا جاتا تھا۔ میں نے اس کی گفتگو سنی۔ وہ انگریز لڑکی سے کہہ رہا تھا۔

"مائی لیڈی! آپ انگریز بڑے قدامت پسند واقع ہوئے ہیں۔ ہم امریکی کاک ٹیل

ی طرح کی ساخت اور ہوا کی طرح آزاد ہیں۔ اپنے مزاج اور فطرت کے اعتبار سے ہم صحیح معنوں میں جمہوری ہے۔ مثلاً میرا دل چاہتا ہے کہ اس وقت میں آپ کے ہونٹ چوم لوں۔ لیکن کاش یہ میڈیلین ایونیو ہوتا اور آپ میری ماڈل تو پھر ہم اس شام کو اس طرح ضائع نہ کرتے۔ میرے کیبن میں تو شام کہیں زیادہ نشہ آور اور تند و تیز گزر رہی ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو آپ چلئے اور چل کر خود ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔"

میں نے اس کی گفتگو تو سرسری انداز میں سنی تھی لیکن پھر میں نے اس کی اسمارٹنس پر غور کیا۔ یہ تو واقعی بے پناہ تیز آدمی تھا۔ بڑی استادی سے وہ لڑکی کو راہ پر لا رہا تھا۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ میں کولڈ ڈرنک پیتے ہوئے ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ لڑکی آہستہ آہستہ رام ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اچانک ہی اس کے چہرے کے نقوش دھندلا گئے اور اس کی آنکھیں، ناک، ہونٹ غائب ہو گئے۔ ایک بار پھر میرے ذہن میں ارسلا کا تصور ابھر آیا تھا۔ کیا وہ ایسی ہو گی؟ امریکن بار بار لڑکی کو مائی لیڈی، مائی لیڈی کہہ کر مخاطب کر رہا تھا اور مجھے اس لڑکی میں ارسلا کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں اس قدر الجھاوے کا شکار ہوا کہ اپنی جگہ سے اٹھا اور واپس اپنے کیبن میں آ گیا۔ یہ بے نقش چہرہ نجانے کیوں میرے حواس پر مسلط ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اٹھ کر جاؤں اور پروفیسر احتشام بے کا گریبان پکڑ کر پوچھوں کہ اس نے صرف اس کے قد و قامت اور جسم کا تذکرہ کیوں کیا ہے؟ مجھے اس کے نقوش کے بارے میں کیوں نہیں بتاتا؟ کیوں نہیں بتاتا۔ یہ سوچ کر میں جھنجلا سا گیا اور میں نے زور سے دانت بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں۔ پوچھوں گا۔ پروفیسر سے معلوم کروں گا۔ یہ میری دیوانگی کی سوچ تھی۔ آہ...... نیند آ جانی چاہئے ورنہ دماغ پھٹ جائے گا۔ یہ کیا نیا کھیل شروع ہو رہا ہے؟ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔

میں نیم غنودگی کی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ پھر نجانے کیسی آوازیں مجھے سنائی دیں۔ کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ، کھٹ کھاٹ...... میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ جہاز بری طرح رول کر رہا تھا۔ میں نے تکیے سے سر اٹھا کر سنا تھا۔ آواز کسی مخصوص یکسانیت سے آ رہی تھی۔ کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ، کھٹ کھاٹ۔ نیند کی گرد جھاڑ کر میں نے جہاز کی اسپرنگ دار مسہری پر لوٹ لگائی۔ یہ یقیناً انجنوں کی آواز نہیں ہو سکتی۔ فرسٹ کلاس کے کیبن اس سے کئی منزل اوپر ہوتے ہیں۔

دستک پھر سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی کسی عورت کی سرگوشی میرے کانوں میں

ابھری۔ کوئی میرے دروازے پر ہی دستک دے رہا تھا۔ پکارنے والے کی آواز پر میں نے غور کیا اور پھر پھرتی سے اپنے بستر سے اٹھا اور اس آواز پر کان لگا دیئے۔ پکارنے والی عورت کی آواز تھی اور اس میں جھنجلاہٹ تھی۔

''دیکھو...... دیکھو گدھے...... گدھے، دروازہ کھولو۔ ورنہ میں جا رہی ہوں۔ دروازہ کھولو ایڈیٹ! میں آئی ہوں، پور لیڈی۔ پور لیڈی۔'' میں نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ یہ بے تکی بکواس میرے ذہن پر ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ میری آواز ابھری۔

''مائی لیڈی۔'' اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں عجیب سے خیالات دوڑ گئے۔ بجلی کی سی تیزی سے پچھلی شام کا بار کا منظر میری نگاہوں میں بھر گیا۔ داڑھی والا امریکن لڑکا اور وہ انگریز لڑکی جسے بار بار وہ مائی لیڈی کہہ کر پکار رہا تھا۔ ایک لمحے کے اندر میرے سارے وجود میں گرم گرم لہریں دوڑ گئیں۔ یہ لمحہ تو سوچے سمجھے بغیر کچھ کر گزرنے کا تھا۔ میرے کیبن میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر ظاہر ہے راہداری میں زرد اور مدھم روشنی پھیلی ہو گی اور اس وقت اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہے۔ سارے پارسائی کے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ بہت سی بار میں نے سوچا تھا کہ اپنے کردار کو سنوارنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن ارسلا کے تصور نے، اس کے تذکرے نے میرے دل و دماغ پر دیوانگی سوار کر دی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور کوریڈور کی نیم تاریکی میں دروازے سے بھڑی ہوئی ریشمیں گٹھری کو اندر کھینچ لیا اور فوراً دروازہ بند کر دیا۔

''سو گئے تھے...... کتنی گہری نیند سو گئے تھے تم۔ میں آدھے گھنٹے سے دروازہ بجا رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ لیکن میں نے اسے تقریر کرنے کی مہلت نہیں دی۔ اس کا دہانہ باسی لپ اسٹک، تازہ شراب اور سلگتی لو دیتی ہوئی کہانی سنا رہا تھا۔ میں وحشی بن گیا اور وہ بھی جذباتی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میری گردن سے نکل کر میری کمر پر آ گئے اور وہ کسی بیل کی طرح جو ستون سے لپٹ جاتی ہے مجھ سے آ لپٹی۔ اس کی آواز نشے میں ڈوبی ہوئی تھی اور وہ میری ہر خواہش کی تکمیل کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ رنگ اور خواہشوں کی تشنگی آگ بن گئی تھی۔ باہر سمندر پر جھاگ اڑاتی ہوئی ہوا تیز و تند لہروں سے الجھ رہی تھی اور میں نجانے کیا محسوس کر رہا تھا۔ ہم آسمانوں کی طرف پرواز کرتے رہے۔ ہماری بے قابو سانسیں اور ناقابل فہم سرگوشیاں جن کی کوئی زبان نہیں تھی، ہزاروں زبانوں سے وقت کی داستان سنا رہی تھیں اور ہم جنگل میں چراغاں کر رہے تھے اور ہر شاخ پر لو دیتے ہوئے

دیئے روشن کر رہے تھے۔ اور پھر سیلاب تو ایک وقتی ہوا کے جھونکے جیسا ہوتا ہے۔ جب سیلاب گزر گیا تو وہ میرے سینے پر سر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو نجانے کیوں مجھے اپنے سینے پر تیزاب جیسے چبھ رہے تھے۔ یہ عجیب و غریب تجربہ تھا۔ نجانے کیوں وہ رو رہی تھی۔ پھر اس کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

''ڈِک! تم مجھ سے شادی کر لو، سمجھے۔ ڈِک تم مجھ سے شادی کر لو۔''

اور اس کے بعد میرے لئے خاموش رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''مائی لیڈی! میں ڈِک نہیں ہوں۔''

اس نے میری آواز سنی اور پھر جیسے بچھو نے اسے ڈنک مارا ہو۔ وہ تڑپ کر مجھ سے علیحدہ ہو گئی اور میز پر رکھے ہوئے لیمپ کی طرف جھکی۔ کچھ لمحوں میں کیبن میں روشنی ہو گئی۔ اس نے پھرتی سے اپنے بدن پر کمبل کھینچ لیا۔ مجھے یونہی لگا جیسے میں نے پتھر کی تراش کی ہوئی کسی دیوی کو دیکھا ہو جو شو مندر میں کسی گوشے میں آویزاں ہو۔ اس کے بال پسینے سے پیشانی پر چپکے ہوئے تھے اور آنسو سے تر آنکھیں دہشت سے کھلی ہوئی مجھے تکے جا رہی تھیں۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ بند کر لیا۔ شاید وہ اپنے منہ سے نکلنے والی چیخ روک رہی تھی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

''کون ہو تم...... کون ہو؟'' اس کی آواز میں غصے کی چیخ تھی۔

''ذرا سا اپنے آپ پر غور کرو مائی لیڈی! تم نے مجھے ڈِک کہہ کر مخاطب کیا تھا۔''

وہ آہستہ آہستہ بستر کے دوسری جانب سرک رہی تھی۔ میں نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر وہ پیچھے بڑھی اور کیبن کے دروازے کا بولٹ چڑھا دیا۔ پھر اس کی نگاہیں میرے چہرے پر گڑھ گئیں اور اس کی کانپتی ہوئی آواز ابھری۔

''تمہیں...... میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ شام کو تم بار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کیا تم کوئی ملاح ہو؟''

''نہیں لیڈی! ملاح نہیں، لیفٹیننٹ ہوں۔ لیفٹیننٹ خاقان جمشیدی۔'' میں نے اداکاروں کی طرح جھک کر اپنا تعارف کرایا۔ وہ غصے سے بمشکل اتنا کہہ سکی۔

''میں...... میں کیپٹن سے رپورٹ کروں گی۔''

میں نے بڑی معصومیت سے پلکیں جھپکائیں اور آہستہ سے بولا۔ ''رپورٹ؟''

''ہاں۔''

"کیسی رپورٹ مائی لیڈی...... کیسی رپورٹ؟ ہم دونوں بالغ اور صحت مند ہیں اور یہ سب کچھ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ کیپٹن کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے معزز مسافروں سے ان کے نجی معاملات کی رپورٹ مانگے۔"

"بکواس بند کرو... بکواس بند کرو تم۔" وہ غصے اور احساسِ بے بسی سے کانپ رہی تھی۔

"جو حکم مائی لیڈی!"

"میں کہتی ہوں مجھے مائی لیڈی مت کہو کمینے۔"

"جو حکم مائی لیڈی۔"

اچانک ہی وہ بستر سے کود کر کمبل لپیٹے لپیٹے دروازے کی طرف بڑھی اور الجھ کر کیبن کے فرش پر آ گری۔ اس کا بدن کھل گیا تھا جسے میں نے کمبل سے ڈھک دیا اور فرش پر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ وہ واقعی برف کی طرح سرد ہو رہی تھی۔ اس نے غرا کر کہا۔

"دیکھو، مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔" یہ کہہ کر اس نے جھٹکا دے کر اپنے ہاتھ چھڑا لئے اور سرک کر مجھ سے دور ہو گئی۔ اب وہ روہانسی سی ہوتی جا رہی تھی۔ میرے ذہن میں روشنی کی ایک لکیر اترتی چلی گئی۔

"مائی لیڈی! آپ سے ایک بات کہوں، میرا ملازم میرے سامان میں سویلین کپڑے رکھنا بھول گیا ہے اور میں بڑی مشکل میں ہوں۔ میرے پاس صرف وردیاں ہیں جو ظاہر ہے میں راستے میں نہیں پہن سکتا۔ مجھے لباس چاہئے۔"

"دیکھو تم پاگل ہو گئے ہو۔ میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں؟"

"مجھے کپڑوں کی سخت ضرورت ہے مائی لیڈی! شادی سے زیادہ مجھے کپڑے چاہئیں۔ کم از کم دو تین قمیصیں اور پتلونیں، ایک آدھ جیکٹ۔ اور یہ سودا تمہارے حق میں برا نہیں ہو گا۔ دو تین ٹائیاں سادہ سی۔ یہ کپڑے آپ کے امریکی دوست ڈک فراہم کر دیں گے۔ سمجھیں آپ؟" میرا لہجہ کچھ سخت ہو گیا۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے پھر کہا۔

"میں اس کے لئے مجبور ہوں۔ اصل میں میرے ملازم نے میرے سامان میں صرف وردیاں رکھ دی تھیں۔"

"مگر میں تمہیں یہ ساری چیزیں کیوں مہیا کروں گی؟"

"کیا مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے؟" میں نے پرانے اور گھاگ بلیک میلروں کی

طرح پہلے تو صاف صاف باتیں کیں پھر اسے بڑی دردمندی سے سمجھایا کہ مائی لیڈی! میں مجبور ہوں اور مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں ورنہ تمہارے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا۔ میرا ایک دشمن اس جہاز پر موجود ہے۔ یہ ضروری ہے کہ میں یہ یونیفارم پہن کر اس کے سامنے نہ آؤں۔ مجھے ہر صورت میں صبح سے پہلے سویلین کپڑے مل جانے چاہئیں ورنہ میں مارا جاؤں گا۔"

"مگر میں پوچھتی ہوں کہ میں تمہارے لئے یہ سب کیوں کروں گی؟"

"وہی آپ کو بتا رہا ہوں کہ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ اچانک اس طرح آ گئیں اور ہم دونوں ان منزلوں میں داخل ہو گئے جن کے بارے میں اگر یہاں موجود لوگوں کو پتہ چلے گا تو میں تو سیدھی سیدھی بات کہہ سکتا ہوں کہ میں نشے میں تھا اور یہ خاتون میرے کیبن میں آ گئی تھیں اس کے بعد میں کیا کرتا۔ لیکن اس کے بعد تمہارے دوست ڈک اور تمہارے ساتھ جو کوئی بھی ہے اس کی ذہنی کیفیت کیا ہو گی۔ اور سنو...... اب تم میرے لئے کپڑوں کا بندوبست کرو گی۔ میں ڈک کو دیکھ چکا ہوں۔ اس کے کپڑے میرے بدن پر ٹھیک آئیں گے۔ مگر یہ مسئلہ تمہیں حل کرنا ہے کیا سمجھیں۔"

"جھوٹ بول رہے ہو تم۔ بکواس کر رہے ہو۔ تم کوئی سازش کر رہے ہو۔ تم ڈک کو کسی چکر میں پھنسانا چاہتے ہو۔"

"ٹھیک ہے، اگر تمہیں میری باتوں کا یقین نہیں ہے تو میں اصرار بھی نہیں کروں گا۔ یہ لو، اپنے کپڑے وغیرہ لے جاؤ۔" میں نے اس کے سلیپنگ سوٹ کی گٹھری سی بنائی اور اس کی طرف اچھال دی۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ اسے مجھ جیسے کمینے آدمی سے اس معقولیت کی امید نہیں تھی۔ بہرحال اس نے میرے چہرے پر ناراضگی کی جھلک دیکھ لی اور مجھے اس حالت میں روٹھتے دیکھ کر اسے ہنسی آ رہی ہو گی اور میں نے اپنے خیال کی تصدیق کر لی۔ وہ پہلی بار مسکرائی اور بولی۔

"میں اپنا لباس پہننا چاہتی ہوں۔ اپنا رخ تبدیل کر لو۔"

میں نے خاموشی سے اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ "میں جا رہی ہوں۔"

"اور سنو، اس کیبن کا نمبر بائیس ہے۔ کل رات ڈک کی تلاش میں نکلو تو بھولے سے بھی اس کیبن پر دستک نہ دے دینا، او کے؟"

میں نے خاموشی سے کیبن کے دروازے کا بولٹ گرایا اور دروازے کو تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا، کوریڈور ویران اور سنسان پڑا ہوا تھا۔ اچانک وہ بولی۔ ''تم ایشیائی کتنے جذباتی ہوتے ہو۔ کیا تم عرب ہو؟''

''شب بخیر اور خدا حافظ۔'' میں نے کہا لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ میں دروازے کے پاس دروازہ کھولے کھڑا ہوا تھا۔ تب اس نے کہا۔

''لیفٹیننٹ پلیز، دروازہ بند کر دو اور ادھر آؤ۔'' اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ مجھے حکم دے رہی ہو۔ میں نے گہری سانس لے کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔ ''تمہارا کیا مسئلہ ہے؟''

''کچھ نہیں۔ تمہارے خیال میں، میں جھوٹ بول رہا تھا۔ میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں تو بس تمہارے دوست ڈِک کو پھنسوانا چاہتا تھا۔''

''میں بتاؤں قصہ کیا ہے؟'' اس نے کچھ اور گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''بولو۔''

''تم نیوی سے فرار ہو رہے ہو۔''

''ویری گڈ۔ آپ کے خیال میں میڈم! کیا فرار ہونے والے وردی پہن کر آتے ہیں؟''

''سنو، کیا واقعی تمہارے پاس کپڑے نہیں ہیں؟'' اب اس کا لہجہ بالکل بدل گیا تھا۔

''ہاں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ تم چاہو تو میرے اس کیبن کی تلاشی لے سکتی ہو۔''

''ہوں......'' وہ اپنا داہنا گال کھجانے لگی۔ پھر بولی۔ ''میں تمہیں ڈِک کے کپڑے لا دوں گی لیکن ابھی نہیں۔ صبح کسی بہانے سے میں اسے کیبن سے باہر بھیج دوں گی۔ وہ اس کیبن کے ساتھ ہی تیئس نمبر کیبن ہے۔ سمجھے؟''

''ہوں۔''

''اور اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مجھ سے اندازے کی غلطی کیسے ہو گئی تھی۔''

''شاید۔''

''اب تم سو جاؤ۔ میں صبح آؤں گی کپڑے لے کر، اوکے۔'' پھر اس نے میرے قریب پہنچ کر اچانک ہی میری گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ میں نے دیکھا کہ اس کی نیلی آنکھیں کسی نرم جذبے سے دھیمے دھیمے سے روشن ہوتی جا رہی ہیں۔ اس نے مجھے چوما اور پھر بولی۔

''شب بخیر۔ تم اچھے آدمی ہو لیفٹیننٹ۔ لیکن تمہیں بلیک میل کرنا نہیں آتا۔''

میں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور اس نے ہوا میں بوسہ اچھال دیا اور ہوا پر بہتی ہوئی کیبن سے باہر نکل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن سے بہت سا بوجھ اتر گیا ہو۔ جہاز کے دائیں بائیں رولنگ نے اعصاب پر نیند طاری کر دی تھی اور میں نامعلوم کس وقت سو گیا۔ میں نے رات شاید کیبن کا دروازہ اندر سے بند نہیں کیا تھا اس لئے صبح کوئی نو بجے آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ بستر کے قریب ردّی اخبار میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ رکھا ہوا ہے۔ پہلے تو خیال ہوا کہ شاید لانڈری کے لئے پرانے تولیے وغیرہ اکٹھے کئے گئے ہیں۔ لیکن رات کی بات اور مائی لیڈی کا وعدہ یاد آ گیا۔ میں نے بستر سے اتر کر کیبن کا دروازہ بند کیا اور جلدی جلدی اس پیکٹ کو کھولنے لگا۔ ایک عام سا سوٹ تھا جیسا کہ روزمرہ کے کاروبار میں مصروف بے شمار لوگ ہر صبح پہن کر اپنے گھروں سے نکلتے ہیں۔ میں مائی لیڈی کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ اس سوٹ میں کوئی خاص بات ہی نہیں تھی۔ اندر اس دکان کا لیبل لگا ہوا تھا جہاں سے یہ سوٹ سلا تھا اور کپڑے کے لیبل کی دوہری تہہ میں کاغذ کا ایک پُرزہ ٹھنسا ہوا تھا۔ میں نے کاغذ کھول کر دیکھا، پنسل سے ایک پرچہ لکھا ہوا تھا۔

''سنو...... یہ اور ایسے دوسرے لیبل کاٹ دینا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈِک کے لباس میں ایسے بے شمار کپڑے موجود ہیں۔ اسے پتہ بھی نہیں چلے گا۔ ٹائیاں سب امریکن ہیں، ایسی کہ اگر انہیں تم پہن لو گے تو ان کے رنگ دور بندرگاہ سے بھی چمکتے دکھائی دیں گے۔ ویسے جہاز کی کینٹین صبح نو بجے کھلے گی تمہارے لائق ٹائیاں نظر آئیں تو پیش کر دوں گی۔''

نیچے اس نے اپنا نام نہیں لکھا تھا، بس ایکس بنا دیا تھا۔ میں نے کلائی پر گھڑی دیکھی، نو بجنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ پھر میں نے پتلون قمیض پہن کر دیکھی، فٹنگ ایسی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ میرے ہی کپڑے ہیں یا درزی نے خاص میرے لئے سیئے ہیں۔

نہا دھو کر اس سوٹ کے ساتھ میں نے بحریہ کی نیلی ٹائی باندھی اور جلدی جلدی کیبن کی حالت درست کر کے مائی لیڈی کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ میں نے اس عجیب و غریب لڑکی کے لئے دل میں ایک اور لطیف جذبہ محسوس کیا۔ یہ بڑی عجیب اور سرور انگیز بات

تھی۔ نو بج کر بیس منٹ پر کوریڈور سے فرش پر کسی کے قدموں کی آواز ابھری اور میرے کیبن کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ کسی نے دستک دی۔ دھڑکتے ہوئے دل سے میں نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک وردی پوش کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"گڈ مارننگ سر! آپ کے لئے ایک پیکٹ لایا ہوں۔" اس نے رنگین فیتے سے بندھا ہوا ایک پیکٹ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اسے ایک سکہ دیا اور وہ سلام کر کے چلا گیا۔ تو وہ نہیں آئی۔ اور اس نے ٹائیاں اس لڑکے کے ہاتھ بھیجی ہیں۔ میں نے مایوسی سے سوچا اور اپنے بستر پر آ بیٹھا۔ پیکٹ میں دو بہت ہی خوبصورت ٹائیاں تھیں۔ اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے خود سے کہا۔

"مائی لیڈی! تم ایک سطر ہی لکھ کر بھیج دیتیں تو مجھے ایک اور خوشی ہو جاتی۔"

میں نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ انسان کی قرابت انسان کو کس قدر عزیز ہوتی ہے اور کبھی کبھی بالکل احمقانہ انداز میں کوئی پتھر سے پتھر دل شخص کسی کی قربت سے متاثر ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت مجھے عالیہ کے ساتھ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لیکن نجانے کیوں اس انوکھی لڑکی نے جس کا نام بھی مجھے نہیں معلوم تھا، میرے دل کے کسی گوشے کو نرم کر دیا تھا اور میں اس سے متاثر ہو گیا تھا۔ بہرحال مجھے اس سے شکوہ تھا کہ اس نے صبح کیبن میں کپڑوں کا بنڈل رکھتے ہوئے مجھے جگا کیوں نہیں دیا۔ اور اگر وہ اس وقت جلدی میں تھی تو یہ ٹائیاں لے کر خود تو آ سکتی تھی۔ میں نے ایک اور بات بھی محسوس کی اور وہ یہ کہ یہ میرا پہلا تجربہ تھا کہ مجھے ڈِک سے رقابت محسوس ہو رہی تھی۔

ابھی میں انہی خیالوں میں بیٹھا ہوا تھا کہ دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی اور نجانے کیوں میرا دل اچھل پڑا۔ شاید وہ آئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ لیکن باہر وردی پوش کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جو اس نے میری طرف بڑھا دیا اور پھر بولا۔

"سر! آپ کے لئے یہ لفافہ ہے۔" اس نے کہا اور سلام کر کے چلا گیا۔ میں نے حیرت سے اس لفافے کو دیکھا پھر اسے کھولا۔ موٹی سی نب میں سیاہ روشنائی سے ایک مختصر سا پیغام تھا۔

"لیفٹیننٹ! اگر آپ مصروف نہ ہوں تو کیبن نمبر تیرہ میں آ جائیں۔
آپ سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ شکریہ۔ (احتشام بے)"

میں جھنجلا کر رہ گیا۔ اس گدھے نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے۔ اس روز لنچ پر مجھے یہ کہہ کر بلایا کہ مجھ سے اپنی اس مہم کے بارے میں بات کرے گا اور ڈیڑھ دو گھنٹے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، مہم کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ حالانکہ مجھے خود اس تحقیقی کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر یہ کیا طریقہ اختیار کیا ہے اس نے۔ اس طرح رقعہ بھیج کر مجھے بلایا ہے۔ میں اس کا ملازم تو نہیں ہوں کہ جب چاہے گھنٹی بجا کر بلا لے۔

میں نے غصے کے عالم میں لفافہ پرزے پرزے کر دیا اور ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ پھر تھوڑی دیر تک میں سوچتا رہا اور اس کے بعد کیبن سے باہر آ گیا۔ میں لاؤنج کے بڑے پیانو پر خود کو تھوڑی دیر بہلانا چاہتا تھا۔ یہ پیانو بار کے ایک گوشے میں مجھے نظر آیا تھا اور جہاز پر سفر کرنے والے اگر بجانے کے شوقین ہوتے تھے تو اس پیانو کو بجا لیا کرتے تھے۔ چنانچہ میں بار میں آ گیا۔ یہاں اکا دکا مسافر بیئر اور ہلکے پھلکے مشروبات سے شغل کر رہے تھے۔ میں نے لاؤنج کے پردے گرائے اور پیانو پر آ بیٹھا۔ اس کے بعد میں پیانو پر ہلکی پھلکی دھنیں بجاتا رہا۔ دن کے ان روشن لمحوں میں میری اداسی بھی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ آخر میں کیا چاہتا ہوں؟ میری زندگی میں کسی لڑکی کی آمد اجنبی تو نہیں ہے۔ یا پھر میری فطرت میں ایسا کوئی نرم گوشہ پیدا ہو گیا ہے کہ میں کسی بھی شخصیت سے متاثر ہو سکتا ہوں۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ میرے ذہن میں وہ بے نقش چہرہ تھا جو اچانک ہی میرے وجود پر سوار ہو گیا تھا۔ ایلس فوری، عالیہ اور اس کے بعد یہ لڑکی مائی لیڈی، جس کا نام پتہ نہیں کیا تھا۔ یہ سب تھیں لیکن وہ بے نقش چہرہ نجانے کیوں مجھے تڑپائے ہوئے تھا اور شاید اسی نے میری یہ کیفیت کر دی تھی۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ آخر میں کیا چاہتا ہوں۔ زندگی کے اس تیز رفتار سفر میں اس لڑکی سے اچانک سرِ راہ ہی ملاقات ہو گئی ہے۔ اس کی پیاس تو شاید تپتی ہوئی زمین کی پیاس تھی جو میں نے بجھا دی۔ مگر میرے اندر یہ کیا ہوا؟ میں تو اپنے اندر چھپے اس پیاسے آدمی کو پہچانتا بھی نہیں تھا۔ بھلا یہ کیسا روگ میں نے اپنی جان کو لگا لیا ہے۔ یہ تو گھنٹے دو گھنٹے کا کھیل تھا۔ وہ لڑکی تو اب شاید مجھے مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ کیونکہ وہ ڈِک سے محبت کرتی ہے اور اسی کے دھوکے میں میرے پاس آئی ہے۔ اس کا ڈِک اس کے پاس ہو گا۔ میں تو اس رات ڈِک کا بدن بن کر آیا تھا اور وہ میرے ساتھ میرے احساس کے کسی سفر میں کیوں چلے گی۔ اس کا سفر ڈِک کی سمت تھا۔

رقابت کے شدید احساس نے مجھے جھنجلا دیا اور میں نے پیانو پر ساری انگلیاں جما دیں۔ پتہ نہیں کتنی دیر میں اپنی یادوں میں کھویا ہوا ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری دھن بجاتا رہا۔ کبھی تو یہ ان معصوم دنوں اور معصوم راتوں کا مرثیہ معلوم ہوتا تھا جنہیں میں نے خود ہلاک کر دیا تھا۔ ان تمام مردہ دنوں اور مردہ راتوں پر دو منحوس سائے اور شیطانی پرچھائیاں تھیں۔ ایک دیو قامت پرچھائیں وردان سادھانی کی تھی اور دوسری پرچھائیں سیوک سندھورتی کی۔ اس کے علاوہ ایک اور منحوس سایہ ہیگ کا تھا۔ میں اس منحوس مثلث میں کس طرح پھنس گیا ہوں۔ کیا کروں...... آہ، کیا کروں۔ ایک بات اور بھی تھی، بظاہر وردان سادھانی اور ہیگ ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے لیکن جہاز کے اس خاموش لان میں پیانو پر اُنگلیاں دوڑاتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے وردان سادھانی کی طرح ہیگ بھی بھکشو اُوم شری کی بھیجی ہوئی کوئی شیطانی قوت ہے۔ جس نے مجھے ایک ہموار اور پُرسکون جھیل سے سمندر کی سر پٹختی ہوئی پُرشور موجوں پر لا ڈالا ہے۔

میری وحشت عروج کو پہنچتی چلی گئی۔ پیانو پر انگلیاں پھیرتے ہوئے میری نگاہیں سامنے کی جانب اٹھیں تو مجھے یوں لگا جیسے پردہ آپ ہی آپ ہل رہا ہے۔ جیسے کوئی چیز اس پردے کی اوٹ میں کھڑی ہوئی ہے۔ میں نے چونک کر کتنی ہی بار آنکھیں بند کیں اور کھولیں۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ میرا وہم ہے۔ لیکن پردہ بار بار ہل رہا تھا۔ یقیناً پردے کے پیچھے کوئی پورٹ ہول کھلا رہ گیا ہے جس سے سمندر کی ہوا اندر آ رہی ہے۔ ایک جنون کے عالم میں، میں اپنی جگہ سے اٹھا اور آگے بڑھ کر بھاری پردے کو ایک جھٹکے سے ہٹا دیا۔ پورٹ ہول بے شک کھلا ہوا تھا لیکن پردہ ہوا سے نہیں ہل رہا تھا۔ بلکہ اس پردے کے پیچھے، آہ...... اس پردے کے پیچھے وردان سادھانی کھڑا ہوا تھا۔ وہ عجیب و غریب انداز میں وہاں کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں ہاتھ اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے کوئی تیراک سمندر کی لہروں کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا ہو۔

میں نے اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کی۔ نجانے کیوں اس وقت مجھے وردان سادھانی سے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوا۔ وہ حسب معمول اپنے مخصوص لباس میں ملبوس تھا، وہی گیروا لباس۔ اور اس کے چہرے پر غصے کی وہی کیفیت تھی جو میں نے جہاز کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے دیکھی تھی۔ اچانک ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں اس طرح گہری سرخ ہو رہی تھیں اور اس طرح متورم تھیں کہ لگتا تھا وہ

جیسے برسوں سے کسی شدید اذیت کا شکار رہا ہو اور ایک لمحے کے لئے بھی نہ سویا ہو۔ پھر اس کی بھاری آواز سنائی دی۔

"تم نے پرکھوں کی بھیجی ہوئی سوغات گنوا دی خاقان! اور جنم جنم کے کام پلک جھپکتے میں ملیامیٹ کر دیئے۔ ہم تم سے کیا کہیں اور کیوں کہیں۔ ہم تو یہ سمجھے تھے کہ مہان بھکشو اور ان کے داس نے ہیروں کا بیوپار کیا اور پتھر پائے۔ ہم نے تو سینڈھی سے گرمائے ہوئے سانڈ کے آگے ماتھا ٹیکا اور کرنی کا پھل پایا۔ خاقان! اپنے اندر جھانک کر تو دیکھ، کیا تیرے شریر میں بودھی ستو زندہ ہیں؟ کیا وہ سانس لیتے، بولتے یا چلتے پھرتے ہیں جنہوں نے مہا بھکشوؤں کی دھار میں دھم سنگھاسن پر دربار کیا تھا؟ بتا خاقان! بول، جواب دے مجھے۔ کیا کر دیا تو نے ہمارے ساتھ۔ بول......" یہ کہتے کہتے اس کی آواز رندھ گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ میں اس عجیب و غریب تقریر کا کیا جواب دیتا۔ خاموش کھڑا رہا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور دونوں ہاتھوں کو میرے سر کے قریب لا کر ایک محراب سی بنائی اور محراب کو نیچے کی طرف لاتے ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر وہ کسی قدر نرم لہجے میں بولا۔

"خاقان! ہم نے سیانوں کی بتائی ہوئی نشانیوں میں کوئی کھوٹ تو نہیں ملایا۔ ہم نے دھوکا تو نہیں دیا اور نہ ہی دھوکا کھایا۔ تمہارے بدن کے آس پاس سوگند اور اجالے کا ہالہ تو اب بھی ہے جسے میں وردان سادھانی یا سیوک سندھورتی دونوں نے دیکھا۔ اور جسے ہمارے گرو تک چھونے کی سکت نہیں رکھتے۔ مگر دیکھو، اس ہالے کے بیچ بدن سڑنے لگا ہے اور سینڈھی سے گرمائے ہوئے سانڈ کی کالی پرچھائیں تمہارے روئیں روئیں میں اترنے لگی ہے۔ خاقان! اب بھی سمے نہیں بیتا، وقت اپنی کہانی پھر سے دوہرا سکتا ہے۔ اپنے اندر کی واسناؤ کو نکال پھینکو اور پھر سے اس اونچائی کی سیڑھیاں طے کر لو جہاں سے تم نیچے اتر آئے تھے۔ آ جاؤ...... آؤ...... چلو مہان بھکشو تمہیں پکارتے ہیں۔ اتم سنگھارتی تمہارا کیا دھرا معاف کر دیں گے۔ آ جاؤ۔"

اور اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا یا کر سکتا، وردان سادھانی نے میرا ہاتھ پکڑا اور پورٹ ہول کی جانب رخ کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے عجیب و غریب اشارے کئے اور جیسے پانی کی لہریں کاٹتا ہوا کوئی تیراک آگے بڑھتا جاتا ہے، وہ آگے بڑھنے لگا۔ آگے کوئی رُکاوٹ نہیں تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں دُھوئیں اور جھاگ اور آوازوں سے گزر رہا ہوں اور

سمندر سنسناتا ہوا میرے گردو پیش سے گزرتا جا رہا ہے۔ یہ کیفیت چند ہی سیکنڈ رہی ہو گی۔ پھر اس کے بعد میں نے اپنے پیروں تلے سخت زمین محسوس کی اور میں نے گھبرا کر دائیں بائیں اور اوپر نیچے دیکھا۔ اوپر کھلا ہوا نیلا آسمان تھا۔ دائیں بائیں اور اِدھر اُدھر ایک مسطح اور ہموار میدان۔ ہم نرم گھاس پر کھڑے تھے اور گردو پیش میں ہری بھری جھاڑیوں کا حصار تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ کوئی جزیرہ ہو اور اس جزیرے کے مرغزاروں میں ایک بلند ٹیلا نظر آ رہا تھا اور ٹیلے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا بدھا کا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ ایک بلند بالا مجسمہ جس کی جانب وردان سادھانی نے قدم اٹھا دیئے۔ میں اس سے دو قدم پیچھے ملزموں کی طرح چلتا ہوا اس ٹیلے کے قریب پہنچا۔ تب میں نے بدھا کے مجسمے میں جنبش دیکھی۔ اس نے سفید گھنی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ایک عجیب و غریب چہرہ تھا۔ وہ ناراضگی سے زیادہ افسردہ اور تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ پھر مجھے ایک پھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"خاقان جمشیدی! وردان سادھانی نے کہنے والی ساری باتیں کہہ دیں۔ میں تم سے بس ایک بات پوچھتا ہوں، بس ایک بات پوچھوں گا۔ اور وہ یہ ہے کہ تم نے کبھی اپنے آپ کو پہچاننے کے لئے جدوجہد کی ہے یا نہیں؟ کیا تم نے ساری زندگی میں کبھی اپنے اندر جھانک کر یہ بھی دیکھا ہے کہ تم کیا ہو اور کیوں ہو؟ مہان بھکشوؤں کے دربار میں تم سے کہا گیا تھا کہ بدھی ستو! دھیان کے راستے پر تمہاری یاترا شروع ہو گئی ہے۔ تو کیا گاشر بھرم سے آنے کے بعد تم گیان کے راستے پر چلتے رہے ہو؟ اور جو کچھ ہوا ہے وہ مہتر بدھ بننے کا جتن تھا۔ سوچو ذرا، سوچو۔ اس لئے کہ اگر وہ نہ ہوا جو سیانوں نے کہا ہے تو تم خاقان! بڑی مشکل میں پھنس جاؤ گے۔ اور پھر مہان بھکشوؤں کے اس سیوک کی سکھائی ہوئی بھاونائیں بھی تمہارے کام نہیں آئیں گی۔ سوچو، جاؤ، غور کرو۔ یہاں تمہیں صرف یہ بتانے کے لئے بلایا گیا ہے کہ تم کوئی معمولی انسان نہیں ہو۔ یہ جنم مرن کے کھیل ہیں۔ سنسار کی بھاونائیں اور واسنائیں گوشت پوست اور ہڈیوں کے بنے ہوئے اس وجود کو متاثر کرتی ہیں اور وہ ہو جاتا ہے جو نہیں ہونا چاہئے سمجھے۔ چھوڑ دو اسے وردان۔ گرفت سے کام نہیں چلتا جب تک کہ منش خود اپنے بارے میں نہ سوچے۔ ہم اسے اس کا وہ مقام بتا رہے ہیں جو ہے۔ اور اگر یہ اس مقام کو پہچانے تو اسے سب کچھ مل سکتا ہے۔ زبردستی اسے کیا کیا سمجھاؤ گے۔ چھوڑ دو اس کا ہاتھ۔"

وردان سادھانی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر اسی دھوئیں اور جھاگ دار آوازوں سے گزر کر میں ایک مانوس فضا میں آ گیا۔ میرے پیروں تلے نرم قالین تھا جو جہاز کے کیبائی لاؤنج میں بچھا ہوا تھا اور میں بھاری پردے کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ کھلے ہوئے پورٹ ہول سے بھیگی ہوئی ہوا کا ایک جھونکا آیا تو میں تھکے تھکے انداز میں پردے سے ہٹ کر پیانو کے پاس آ پہنچا اور اسٹول پر بیٹھ گیا۔ میں کہاں گیا تھا؟ میں نے کس کی آواز سنی تھی؟ لاؤنج میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ یہ سب ایک خواب کہانی معلوم ہوتی تھی۔

دفعتہً ہی میں نے اپنے جوتوں پر نظر ڈالی۔ جوتوں کے تلے نم تھے اور گھاس کی ٹوٹی ہوئی ہری ہری پتیاں ان سے چپکی ہوئی تھیں۔ میں انہیں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ آہ یہ خواب کہانی نہیں بلکہ ایک سچائی تھی۔ میں نے ایک سفر کیا تھا۔ سمندر میں تیرتے ہوئے جہاز سے ان نامعلوم وادیوں کی طرف۔ یقینی طور پر میں اس ماحول سے نکل کر اس جہاز سے کہیں دور گیا تھا۔ لیکن کیا یہ عقل میں آنے والی بات تھی؟ کسی سے کہتا تو کیا کوئی یقین کر لیتا؟ نہیں، یہ ناممکن تھا۔ میرا سارا وجود یہی ہے۔ اور اگر یہ بھی وہم ہے تو پھر دنیا کی ہر چیز غیر حقیقی ہے۔ کیا واقعی مجھے سوچنا چاہئے کہ میں کون ہوں اور کیوں ہوں؟

ایک عجیب سا احساس میرے سارے وجود میں جاگ اٹھا تھا۔ ایک اجنبی احساس۔ شاید مجھے میری حیثیت بتانے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر میرے معبود! سچ کیا ہے؟ میں خاقان جمشیدی ہوں یا مہتر بدھ؟ دونوں میں سے کون ہوں؟ پھر کچھ اس طرح کی کھولت ذہن پر سوار ہوئی کہ میں اسٹول سے اٹھا اور لاؤنج سے باہر آ گیا۔ لیکن جیسے ہی میں لاؤنج سے باہر نکلا مجھے پروفیسر احتشام بے نظر آیا جو مجھے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا تھا اور اس کے چہرے پر عجیب سے نقوش پھیل گئے تھے۔ پھر وہ آگے بڑھ کر میرے قریب پہنچا اور کسی قدر شرمسار لہجے میں بولا۔

"لیفٹیننٹ، میں جانتا ہوں کہ آپ ناراض ہوں گے، بلکہ ناراض ہیں۔ دراصل بڑی گڑبڑیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر آپ کو اپنی مہم میں شرکت کے لئے دعوت دی تھی۔ گو دوسرے ساتھیوں سے صلح و مشورے کے بغیر اپنے ہی طور پر دے دی تھی۔ بعد میں جب وہ راضی نہ ہوئے تو میں نے اس بات کو روک دیا۔ اب اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ اسمتھ کے کیبن میں چلیں۔ وہاں مسٹر اینڈ مسز اسمتھ دونوں آپ کے منتظر ہیں۔ آپ یقین کریں میں بہت دیر سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔ پلیز،

پہلوں کے لئے اپنی ناراضگی دور کر کے میرے ساتھ چلئے۔“

میں نے ایک نگاہ اسے دیکھا۔ پروفیسر احتشام کے چہرے پر کچھ ایسی عاجزی تھی کہ میں اسے انکار نہ کر سکا اور اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ اس قدر شریف آدمی تھا کہ اس کی بات ٹھکرائی نہیں جا سکتی تھی۔ راستے میں اس نے کہا۔

”بات اصل میں یہ ہے کہ ان دونوں میاں بیوی نے اس مہم میں سرمایہ لگایا ہے۔ اس لئے وہ شراکت دار بڑھانے میں رضامند نہیں ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جتنے زیادہ حصے دار بڑھتے جائیں گے اسی قدر ان کا حصہ کم ہوتا جائے گا۔ مگر مسئلہ یہ نہیں تھا بلکہ نہیں اس مہم میں مقامی مزدوروں کی ضرورت پڑے گی جن سے کام لینے کے لئے خود ان کے علاوہ بھی ایک اور شخص ہونا چاہئے جو عربی زبان سے واقف ہو۔ کیا سمجھے؟“

میں نے حیرانی سے پروفیسر احتشام بے کو دیکھا۔ یہ تو خیر حقیقت تھی کہ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے مگر نجانے کیوں یہ پروفیسر احتشام مجھ پر اتنا اعتبار کرنا چاہتا تھا؟ اس کا خیال تھا کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو سیدھی راہ چلتے ہیں اور دیانت دار ہوتے ہیں۔ بڑا احمق تھا یہ شخص۔ میں اس کی بات پر دل ہی دل میں ہنس پڑا تھا۔

”میں نے ان سے کہا کہ جس شخص کو میں اس مہم میں شراکت دار بنانا چاہتا ہوں وہ بے مثال شخصیت کا مالک ہے۔“

”مگر پروفیسر! کیا آپ نے غلطی نہیں کی؟“

”کیسی غلطی؟“

”یہی کہ مجھے ایک ملاقات میں بے مثال قرار دے دیا۔“

”اصل میں اپنی فطرت کے ایک عجیب پہلو سے میں تمہیں بعد میں روشناس کراؤں گا۔ بہرحال آؤ۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ویسے میرے خیال میں یہ بڑی مضحکہ خیز صورتحال تھی۔ مجھے اس مہم کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا جس میں وہ مجھے شامل کرنا چاہتا تھا۔ نجانے اس نے کیوں یہ سمجھ لیا تھا کہ اس کی ایک سادہ سی پیشکش پر میں ان کی مہم میں شامل ہو جاؤں گا۔ یہ تو ایک احمقانہ تصور تھا۔ وہ ہوا میں تیر چلا رہے تھے اور بڑے مزے کی بات تھی کہ وہ مجھے شامل کرنا چاہتا تھا مگر دوسری طرف میری مخالفت کی جا رہی تھی۔ اور ایسا بلاوجہ ہی ہو رہا تھا جبکہ میں نے اپنی زبان سے ایک بار بھی اس مہم میں شرکت کا

اقرار نہیں کیا تھا۔ بہرحال میں پروفیسر احتشام بے کے ساتھ اس کے کیبن میں داخل ہو گیا۔ مسٹر اور مسز اسمتھ بڑے تپاک سے ملے۔ آج ان دونوں کا رویہ کافی بدلا ہوا تھا۔ میری طلب پر انہوں نے مجھے مشروب اور اپنے لئے ہلکی شراب مہیا کر لی اور ہم لوگوں نے اپنے اپنے گلاس اٹھا لئے۔ احتشام بے نے مسز اسمتھ کے اشارے پر ایک طویل داستان کا آغاز کیا اور اس سے پہلے کہا۔

”بات اصل میں یہ ہے مسٹر خاقان! کہ اپنی اس مہم کے بارے میں کچھ تفصیل بتاتے ہوئے آپ کو ایک الگ سی کہانی سنانی پڑے گی۔ آج سے کوئی ڈھائی ہزار سال پہلے قدیم مصر کے دو بڑے شہر ممفس اور تھیبز تہذیب و تمدن اور دولت و مسرت میں اس مرتبے پر پہنچ گئے تھے کہ اس دور میں ان کے مقابل کوئی دوسرا شہر نہیں تھا۔ خاص طور پر تھیبز کی عبادت گاہوں میں ہزاروں سالوں سے بے حساب زر و جواہر اکٹھے ہو رہے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ سو پچیس سال پہلے مصر پر ایرانیوں نے حملہ کیا اور ان ایرانی حملہ آوروں نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ فرعونِ مصر کو تخت سے اتار کر ایرانی فاتح نے تھیبز میں قیام کیا۔ اس شخص کا نام قنبوسی تھا اور اس نے اس لئے تھیبز میں قیام کیا تھا کہ اس کی تھکی ہوئی فوج نئے معرکوں کے لئے تازہ دم ہو جائے۔ اسی دوران قنبوس کو اطلاع ملی کہ صحرائے لیبیا کے پار شمال میں سنوسی عربوں کے شہر بھی مال و دولت سے اٹے پڑے ہیں۔ صحرائے عظیم کا یہ حصہ سورج کی مانند انتہائی گرم تھا اور یہاں پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس نے اس خوفناک ریگستان کو پار کر کے سنوسیوں کے دولت مند شہر پر حملہ کرنے کی ٹھانی اور تھیبز میں بیٹھ کر منصوبے تیار کرنے لگا۔ اتنی بڑی فوج کو صحرا کے پانچ سو میل کے اس بے آب و گیاہ ٹکڑے سے نکالنا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ انسانوں اور جانوروں کے لئے پینے کا پانی کہاں سے آتا؟ قنبوسی نے بڑی عقل مندی سے کام لیتے ہوئے تیس ہزار مٹکے پانی سے بھروا کر اونٹوں کے ایک بہت بڑے کارواں کے ساتھ ریگستان میں ایک دن کی مسافت پر پہنچا دیئے۔ ان مٹکوں کو زمین کھود کر ریت میں دبا دیا گیا تاکہ پانی شدید گرمی سے بھاپ بن کر نہ اُڑ جائے۔ کارواں واپس پہنچا، پھر پانی کے مزید تیس ہزار مٹکے لے کر دو دن کی منزل پر پہنچا اور انہیں بھی ریت میں دبا دیا گیا۔ اس طرح یہ کارواں ایک دن کی مسافت پر تیس تیس ہزار مٹکے دفن کرتا گیا اور نشانات بناتا گیا۔ پانچ سو میل کے اس ریگستانی راستے پر بڑے نخلستان تک فاصلے فاصلے

پر پانی کے ذخیرے قائم کئے گئے اور ایرانی مہم کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔

مگر جب فوج کے کوچ کا وقت آیا تو قنبوسی شدید بیمار پڑ گیا۔ چنانچہ بحالت مجبوری اس نے مصر میں فوج کی ایک بڑی تعداد اپنے ساتھ رکھی اور پچاس ہزار چنے ہوئے سواروں کی ایک مختصر فوج صحرا میں روانہ کر دی۔ اس نے سوچا کہ وہ بعد میں اس مہم میں شریک ہو جائے گا۔ وہ تھیبز کو ایک عارضی پڑاؤ سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے مصر کی عبادت گاہوں سے لوٹی ہوئی بے حساب دولت کا زیادہ تر حصہ اپنی اس مختصر فوج کے ساتھ آگے بھیج دیا جو صحرا میں پیش قدمی کر رہی تھی۔ قنبوسی فاتح عالم بننے کے خواب دیکھ رہا تھا اور ان زر و جواہر کو اس نے نئی فوجوں کو ترتیب دینے اور نئے علاقوں میں اپنی مملکتیں قائم کرنے کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ قنبوسی کے یہ پچاس ہزار جوان اس مشکل مہم پر روانہ ہوئے۔ جب انہوں نے دو تہائی سے زیادہ راستہ طے کر لیا تو راستہ دکھانے والے سنوسی راہبروں نے جان بوجھ کر انہیں غلط راستے پر ڈال دیا۔ وطن پرست راہبروں نے اس حملہ آور فوج کے ساتھ صحرا میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانا منظور کر لیا اور یوں انہوں نے اپنی بستیوں کو تباہی سے بچا لیا۔ جھلسے ہوئے ریگزار میں ایرانیوں کی فوج اس طرح گم ہو گئی جیسے گھاس کے ڈھیر میں سوئی گم ہو جاتی ہے۔ اس فوج نے بڑے نخلستان کو اپنی منزلِ مقصود بنایا تھا لیکن ایک بھی ایرانی اس نخلستان تک نہ پہنچ سکا۔ پیاس، تھکن اور زہریلی ہواؤں اور صحرا کی طوالت نے ان کے لئے موت آسان کر دی تھی۔ صحرائے عظیم نے قنبوسی فوج کو قاہرہ کے بے حساب زر و جواہر کے ساتھ نگل لیا۔ ایران کے چنے ہوئے شاہسوار ریت کے ذروں کی طرح آگ برساتے ہوئے سورج کے نیچے بجھتے چلے گئے اور آخر کار ختم ہو گئے۔ سمجھ رہے ہو نا۔"

یہ کہہ کر پروفیسر احتشام بے نے سب کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں پہلے مجھ پر اور پھر مسز اسمتھ اور مسٹر اسمتھ پر پڑیں۔ دونوں بیزاری سے جمائیاں لے رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ واقعات انہوں نے پہلے بھی کئی بار سنے ہوں گے چنانچہ ان تاریخی واقعات سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن مجھ سے نہ رہا گیا۔ مجھے واقعی اس داستان میں ایک عجیب سی کشش محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "یہ تو واقعی بڑے حیرت ناک واقعات ہیں۔ کیا آپ جو کچھ بتا رہے ہیں وہ سچ ہے پروفیسر؟"

پروفیسر احتشام بے نے کسی قدر افسردگی سے مجھے دیکھا۔ پھر بولے۔ "نہیں، میں

جھوٹ نہیں بول رہا۔ تاریخ ان واقعات کی سچائیوں کی گواہی دیتی ہے۔ ہیروڈوٹس نے اس زبردست تباہی پر بڑی تفصیلات لکھی ہیں۔ میرے پاس اس مہم سے متعلق ایسی مستند شہادتیں موجود ہیں جن سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ہیروڈوٹس اور دوسرے مؤرخین کا بیان حرف بہ حرف درست ہے۔"

"واقعی...... بڑی کمال کی بات ہے۔ اور میں خاص طور سے ایک بات ضرور کہوں گا پروفیسر احتشام بے کہ آپ نے بڑی محنت سے یہ شواہد اور تاریخ اکٹھی کی ہے۔"

"ہاں۔ اس کا بھی ایک پس منظر ہے۔" پروفیسر احتشام بے نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"بتاتا ہوں۔ میں لکسر سے کوئی ڈھائی سو میل دور دخلا کے نخلستان میں کھدائی کر رہا تھا کہ مجھے ایسے آثار ملے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ قنبوسی کی گم ہو جانے والی فوج نے وہاں پڑاؤ کیا ہے۔ کھدائی کے دوران مجھے فولاد کی یادگار تختی ملی۔ یہ دو حصوں میں ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے اس پر کھدی ہوئی تحریر اس وقت تو نہیں پڑھ سکا۔ مگر سال بھر کے بعد اس فولادی تختی پر لکھے ہوئے قدیم اشاروں کو پڑھنے کا موقع ملا تو پتہ چلا کہ یہ لوح ایرانی فاتح قنبوسی کے کسی ایک ہزاری سردار نے تیار کر کے نصب کرائی ہے۔ یہ شخص اپنے گنتی کے بچے کھچے فوجیوں کے ساتھ پیاس اور تھکن کا مارا کئی دن صحرا میں بھٹکتا رہا اور آخر کار دخلا کے اس چھوٹے سے نخلستان میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ لوٹ کر قنبوسی کے پاس نہیں جا سکتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس زبردست مہم کی ناکامی کا حال سن کر قنبوسی کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہے گی اور وہ اس سردار کو یقیناً مروا دے گا۔ اس لئے سردار اپنے بچے کھچے آدمیوں کے ساتھ نخلستان ہی میں رہ گیا۔ اس نخلستان میں کافی مقدار میں پانی موجود تھا۔ کھجوروں کے درخت بھرے پڑے تھے۔ یہاں ان لوگوں نے بود و باش اختیار کی۔ وہ یہاں زندگی گزار سکتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے یہاں جو کی کاشت بھی شروع کر دی اور کسانوں کی طرح یہاں رہنے لگے۔"

"گڈ پروفیسر! آپ ایک بات بتائیے، اس یادگاری تختی پر یہ نہیں لکھا تھا کہ شاہ قنبوسی کی فوج آخر کہاں اپنے انجام کو پہنچی؟"

پروفیسر کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ پھر اس نے مسٹر اور مسز اسمتھ کی طرف دیکھا اور کچھ سوچ کر بولا۔

"ہاں، جس سردار کی میں نے بات کی ہے اس کا نام ہیروس تھا۔ ہیروس نے ستاروں کی مدد سے اس جگہ کا تعین کیا اور لکھا کہ فوج صحرائے عظیم کے ایک خاص علاقے میں موت کا شکار ہوئی۔ سمجھ رہے ہو نا تم؟"

نجانے کیوں میرے ذہن میں کچھ سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ پروفیسر خاموش ہو گیا تھا اور میں ان سنسناتی ہواؤں کو عجیب سے انداز میں محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت اس کیبن میں مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جب میری آواز نکلی تو مجھے یہ آواز خود عجیب محسوس ہوئی۔ میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے پروفیسر! کہ یہ معلومات بے حد قیمتی ہیں اور آپ......"

میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔

"ہاں، ان معلومات کے قیمتی ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔"

پھر اس وقت مسٹر اسمتھ نے پہلی بار زبان کھولی۔ "ذرا اندازا لگاؤ میرے دوست خاقان! کہ تھیبز اور ممفس کے ہزاروں معبدوں کی بے حساب دولت آج بھی معمولی پتھروں کی طرح ریگستانوں کے نیچے دبی پڑی ہے۔"

"اسے وہاں پڑے ہوئے ہزاروں سال گزر گئے۔ اور اس جگہ کا علم صرف پروفیسر احتشام بے کو ہے۔ صرف انہیں۔ ہمیں تو انہوں نے اس فولادی تختی کا صرف آدھا ٹکڑا ہی دکھایا ہے۔" مسز اسمتھ کی آواز ابھری اور پروفیسر کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے اس وقت اس گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے فوراً ہی سوال کیا۔

"لیکن پروفیسر! آدھی تختی کہاں ہے؟"

پروفیسر کے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ ابھری اور اس نے کہا۔ "ارسلا کے پاس۔"

"ارسلا؟"

"میری بیٹی کا نام ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ وہ آدھی تختی ارسلا کے پاس قاہرہ میں ہے۔"

"وہ کیوں پروفیسر؟" میں نے بے اختیار سوال کیا۔

"میرے دوست! میں بھی انسان ہوں۔ ایک کمزور اور بے بس انسان۔ جس کے دماغ میں ایک اتنا بڑا خزانہ پوشیدہ ہے۔ مجھے اس کے لئے ایک سرمایہ کار اور ایک مضبوط منیجر کی تلاش تھی۔ سرمایہ کار یہ دونوں میاں بیوی ہیں اور منیجر تم۔ ہم تمہیں حاصل شدہ

خزانے کا دس فیصد دیں گے۔" پروفیسر احتشام نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

حقیقت یہ ہے کہ اب مجھے اس مہم سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اور کچھ نہیں تو میں ایک جان لیوا مصروفیت میں پڑ جاؤں گا۔ اس کے علاوہ سچ کہوں کہ مجھے اس عظیم الشان خزانے سے زیادہ اس بے نقش چہرے کو مکمل کرنے کا شوق تھا۔ یعنی ارسلا......!

"اوکے پروفیسر احتشام بے۔" میں نے کہا اور احتشام بے کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے خوشی سے مجھے گلے لگا لیا تھا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔"

"اب خوش ہیں پروفیسر؟"

"بہت زیادہ۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ ہر شریف انسان کو ایک شریف ساتھی کی تلاش رہتی ہے۔ اور یقین کرو میں تمہارے لئے ایک پیش گوئی بھی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا......؟"

"یہ مہم تمہارے لئے بھی بے حد خوشگوار رہے گی۔"

"کاش......" میں نے کہا۔

"کاش نہیں، حقیقتاً ایسا ہو گا۔ چلو اٹھو۔" پروفیسر نے کہا۔

"کہاں؟" میں نے سوال کیا۔

"مسٹر اور مسز اسمتھ نے وہ فولادی تختی دیکھی ہے۔ آؤ میں تمہیں بھی دکھا دوں۔ میں نے اس کا مضمون اپنے ذہن میں محفوظ رکھا ہے۔ اس آدھے حصے میں جو کچھ لکھا ہے وہ میں تمہیں بتا دوں گا۔ یا پھر یوں کرو کہ تم کوئی دس منٹ کے بعد میرے کیبن میں آ جاؤ۔ فولادی تختی کو میں نے بڑی احتیاط سے کپڑے اور ٹاٹ کی پٹیوں میں لپیٹ کر رکھا ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے یہ ضروری تھا۔"

"اوکے ٹھیک ہے۔ میں دس منٹ کے بعد آپ کے کیبن میں پہنچ جاتا ہوں۔"

میں پروفیسر کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے سوچا کہ اس عرصے میں، میں کینٹین کا ایک چکر لگا لیتا ہوں۔ کینٹین کی طرف بڑھتے ہوئے پروفیسر مجھ سے جدا ہو گیا۔ میں نے کینٹین میں داخل ہو کر سگریٹ، ایک رومال اور سیاحت سے متعلق ایک رسالہ خرید!

اور دس منٹ پورے کرنے کے بعد آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ راستے میں بے خیالی میں رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اس میں سے کوئی چیز کاغذ کی طرح لہراتی ہوئی فرش پر جا گری۔ اس کے ساتھ ہی دور دور تک چمپا کی تیز اور ناخوشگوار بو پھیل گئی۔ میں جہاں تھا، وہیں رک گیا اور میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے رسالے سے نکل کر گرنے والی چیز کو دیکھا۔ میرے سامنے وہی منحوس بھوج پتر پڑا تھا۔ وہی پراسرار پتہ۔ میرے ہاتھ سے سگریٹوں اور رومالوں کا پیکٹ چھوٹ گیا۔ میں نے جھک کر بھوج پتر اٹھا لیا، اس بھورے پتے پر سنکی ہوئی روئی کی طرح پتیاں سی پڑی ہوئی تھیں اور ان پتیوں سے ایک تصویر بن گئی تھی۔ آہ...... یہ تصویر پروفیسر احتشام بے کی تھی جس میں وہ جھکا ہوا اپنے بستر پر کچھ تلاش کر رہا تھا اور اس کی پشت پر ایک ہاتھ اٹھا ہوا تھا اور اس ہاتھ میں ایک لمبا سا خنجر نظر آ رہا تھا......

میرے پورے بدن میں شدت کی گرمی دوڑ گئی۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں ایک لمحے کے لئے ختم ہو گئیں۔ میں نے بھوج پتر کو جیب میں ٹھونسا اور رسالہ چھوڑ کر دیوانوں کی طرح پروفیسر کے کیبن کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ پروفیسر کے کیبن کا نمبر تیرہ تھا۔ میں اس وقت جہاز کے رہائشی علاقے سے گزر رہا تھا اور میرے دل و دماغ میں عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ لیکن اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ میں بھول بھلیوں میں پھنس گیا ہوں۔ نجانے کیبن نمبر تیرہ کہاں گیا؟ میں اس امید میں بے تحاشہ دوڑ رہا تھا کہ شاید میں بروقت پہنچ جاؤں اور اس ہاتھ کو روک دوں جس نے پروفیسر پر وار کرنے کے لئے خنجر تان رکھا ہے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ کاش دشمن اپنا کام نہ کر چکا ہو۔ خدا کرے میں پروفیسر کو بے خبری میں ہلاک ہونے سے بچا سکوں۔ میں زندگی میں کبھی اتنی وحشت اور اتنی تیز رفتار سے نہیں دوڑا تھا۔ میرے اندر سے ایک ہی آواز ابھر رہی تھی۔ خدا کرے...... خدا کرے یہ بھوج پتر میرے کام آ جائے۔ پہلی بار میرے کام آ جائے۔ پتہ نہیں یہ کوریڈور کس طرف مڑے گی۔

سامنے ایک بیرا ٹرے لئے آ رہا تھا۔ میں بچتے بچتے بھی بیرے سے ٹکرا گیا۔ زبردست چھناکا ہوا اور بیرے نے نجانے کیا بک ڈالا۔ میں نے آہنی دیوار کا سہارا لیا اور تیزی سے اس کیبن کا نمبر پڑھا، یہ دس نمبر کیبن تھی۔ اس کے بعد گیارہ، پھر بارہ یعنی اسمتھ فیملی کی کیبن۔ پھر تیرہ یعنی پروفیسر کی کیبن۔ اور آخر کار میں تیرہ نمبر کے نزدیک پہنچ

گیا۔ بے شک میں نے اب تک بہت سی برائیاں کی تھیں۔ لیکن میرے دل سے یہی آواز نکل رہی تھی کہ کاش آج میں ایک اچھے آدمی کو بچانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ کاش...... کاش!

میں نے دیکھا کہ میں تیرہ نمبر کیبن پر پہنچ گیا ہوں۔ میں نے دروازے سے ٹکرانے کے لئے پوری قوت سے دوڑ لگائی۔ میرا کسرتی بدن لوہے کے دروازے سے یوں ٹکرایا جیسے میں انسان نہیں ٹینک ہوں اور ہولناک جھٹکے سے تیرہ نمبر کیبن کا دروازہ کھل گیا۔ پھر میرے کندھے کے پٹھوں میں جیسے سوئیاں سی چبھ گئیں...... کیبن کا دروازہ نکل چکا تھا لیکن میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ رہے تھے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اندر کیبن میں کیا ہے۔ آنکھوں کے آگے شدید دھندلاہٹیں تھیں۔

جب میں دیکھنے کے قابل ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ ہاتھ جس نے بھوج پتر کی تصویر میں پروفیسر احتشام بے پر خنجر تان رکھا تھا، اپنا کام کر چکا ہے۔ پروفیسر احتشام بے بستر پر اوندھے منہ پڑا تھا اور اس کی پشت میں دستے تک ایک خنجر اترا ہوا تھا۔ بستر پر شدید کشمکش کے آثار تھے اور لاش سے خون ابل ابل کر بستر میں جذب ہو رہا تھا۔ میں نے دہشت زدہ انداز میں اسے چھو کر دیکھا، لاش ابھی گرم تھی۔ آہ...... تھوڑی سی تاخیر ہو گئی۔ بس تھوڑی سی تاخیر۔ کاش، میں کچھ دیر پہلے یہاں پہنچ گیا ہوتا۔

اس وقت میرے بدن میں بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ میں جھپٹ کر کیبن کے دروازے پر پہنچا اور میں نے باہر جھانکا، لیکن جس بیرے سے ٹکرا کر میں نے چائے کے برتن توڑ دیئے تھے اس کے سوا راہداری ویران پڑی ہوئی تھی۔ وہ بڑے انہماک سے جھکا ہوا ٹوٹے ہوئے برتن اکٹھے کر رہا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن وہ اسی طرح سر جھکائے اپنا کام کرتا رہا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ پکار کر اسے بتاؤں کہ کیبن میں کیا ہو چکا ہے۔ لیکن پھر خیال آیا اگر میں نے راہداری میں کھڑے ہو کر شور و غل کیا تو جہاز کے عملے کے ساتھ دوسرے لوگ بھی جمع ہو جائیں گے۔ اور شاید کیپٹن کو یہ ہنگامہ آرائی پسند نہ آئے۔ میں اپنے اور کیپٹن کے درمیان کوئی مسئلہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ میں تو ویسے ہی گلے گلے تک الجھنوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس جہاز پر میری موجودگی غیر قانونی تھی۔ میرے پاس پاسپورٹ بھی نہیں تھا اور جہاز پر میرا دشمن ہیگ موجود تھا۔ ویسے میرے دل و دماغ میں یہ بات مستقل طور پر جاگزیں تھی کہ اس قتل کا

تعلق ہیگ سے ضرور ہے۔ ممکن ہے وہ بمبئی سے پروفیسر احتشام بے کے تعاقب میں ہی روانہ ہوا ہو۔ یقینی طور پر وہ بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس بات کے امکانات بھی ہو سکتے ہیں کہ اسے بھی اس فولادی تختی کے بارے میں معلومات ہوں۔ اور ممکن ہے وہ بھی اسے حاصل کرنے کے چکر میں ہو۔ کیونکہ وہ بھی اسی ٹائپ کا انسان تھا۔ تختی میں ممفس اور تھیبز کے مندروں کی بے حساب دولت کی نشاندہی کی گئی تھی اور ہیگ کے لئے اس سے زیادہ دلچسپ بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

بہرحال کچھ لمحوں تک میں اسی کشمکش کا شکار رہا پھر میں نے سوچا کہ تھوڑی سی خاموشی اختیار کر کے احتشام بے کے کیبن کا جائزہ لیا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ آخر چکر کیا تھا؟ قاتل اگر فولادی تختی کے چکر میں تھا تو کیا اس تختی کو اڑا لینے میں اسے کامیابی حاصل ہوگئی؟

میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ میں نے پورا منصوبہ تیار کر لیا۔ دو چار منٹ تک اس کیبن کا جائزہ لینے کے بعد میں کسی کو یا اسی بیرے کو بلا لوں گا جو ابھی تک راہداری میں چائے کے برتن سمیٹ رہا ہے۔ اس واقعے کی اطلاع فوری طور پر جہاز کے عملے کو ہو جانی چاہئے ورنہ مجھ پر شبہ کیا جائے گا۔

ایک بار میں پھر کیبن میں داخل ہو گیا اور میں نے جلدی جلدی بستر کے نیچے، غسل خانے میں اور پروفیسر کی کتابوں سے بھرے دونوں سوٹ کیسوں میں اس تختی کا جائزہ لیا۔ خود پروفیسر کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ تختی کم سے کم دو فٹ چوڑی اور تین فٹ لمبی ہے۔ ایسے کسی پارسل کو ان چیزوں میں چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ مجھے یہاں اس کیبن میں تین منٹ گزر چکے تھے۔ آخر کار جب کوئی کام نہ بن سکا تو میں نے گھنٹی بجا دی اور کیبن کے بیچوں بیچ اگلے واقعات کے انتظار میں کھڑا ہو گیا میری آنکھیں اب بھی کسی پیکٹ کو تلاش کر رہی تھیں۔ نجانے کیوں یہ خیال اب بھی میرے دل میں موجود تھا کہ تختی چوری نہیں ہو سکی ہے اور ابھی تک وہ اسی کمرے میں موجود ہے۔ اور میری طرح شاید قاتل کو بھی اسے ڈھونڈنے میں ناکامی ہوئی ہے۔

ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کیبن کا دروازہ کھلا اور وہی بیرا اندر داخل ہوا جس سے میری ٹکر ہوئی تھی۔ اس نے کسی قدر ناخوشگوار نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔

''کیا بات ہے صاحب؟''

میری انگلی بستر کی جانب اٹھ گئی اور بستر پر پڑی لاش دیکھ کر بیرے کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ بڑی مشکل سے اس کے منہ سے نکلا۔

''سر...... سر...... آپ نے...... آپ نے اسے......'' یہ جملہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ دھیرے دھیرے دروازے کی طرف کھسک رہا ہے۔

''ٹھہرو، کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے ڈانٹ کر اسے کہا۔

''بس سر...... بس سر...... آپ......''

''میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں ابھی ابھی اس کیبن میں آیا ہوں۔''

''ج...... جی ہاں، ابھی آپ مجھ سے ٹکرائے تھے۔'' ویٹر دروازے تک پہنچ گیا تھا۔

''کیپٹن کو فوراً اطلاع دو۔ میں یہیں انتظار کر رہا ہوں۔''

وہ گردن ہلا کر تیزی سے دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ بیرے کو گئے بمشکل دو منٹ گزرے ہوں گے کہ برآمدے میں تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ جہاز کے کیپٹن، ڈاکٹر اور چیف پرسن نے کیبن کے اندر قدم رکھا اور میں نے انہیں اندر آنے کے لئے جگہ دی۔ کیپٹن نے اس لاش کو دیکھا اور پھر پھرتی سے پلٹ کر دروازہ بند کر لیا۔ ڈاکٹر نے ہلائے جلائے بغیر لاش کا معائنہ کیا اور کیپٹن کو اطلاع دی کہ موت پچھلے دس سے پندرہ منٹ تک ہوئی۔ اب وہ سب میری طرف متوجہ تھے اور پھر بیرے کو کیبن میں بلایا گیا۔ بیرے نے کہا۔

''صاحب! یہ سر برآمدے سے دوڑتے ہوئے گزرے اور مجھ سے ٹکرا گئے۔ اس کے بعد یہ اس کیبن کا دروازہ بجانے لگے۔ پھر دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ بعد میں انہوں نے گھنٹی بجا کر مجھے بلایا اور یہ لاش دکھائی۔''

میں نے اپنے بیان میں کہا۔ ''پروفیسر کی مجھ سے جہاز پر ہی جان پہچان ہوئی ہے۔ میں اس وقت ان کے کیبن میں ایک علمی مسئلے پر بات چیت کرنے کے لئے مدعو تھا۔ پروفیسر وقت کے حد درجہ پابند تھے۔ مجھے چار پانچ منٹ کی دیر ہو گئی تھی۔ اس لئے میں تیزی سے کینٹین سے نکلا۔ پروفیسر کے کیبن کو تلاش کرنے میں مجھے کچھ اور دیر ہو گئی۔ اس لئے میں نے راہداری میں دوڑنا شروع کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پروفیسر میرے

دیر سے آنے پر ناراض ہوں۔ میں یہاں پہنچا تو کیبن کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دستک دے کر کچھ دیر انتظار کیا۔ جب اندر سے کسی قسم کی آہٹ نہ سنائی دی تو میں نے زور سے دھکا دے کر دروازے کی چٹخنی توڑ دی۔ اندر پہنچ کر میں نے یہ منظر دیکھا۔ میں نے اس بیرے کو راہداری میں برتن سمیٹتے دیکھ لیا مگر میں چیخ پکار کر کے دوسرے مسافروں کو اکٹھا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے دوبارہ کیبن میں آ کر میں نے گھنٹی بجائی اور بیرے کو کیپٹن کی طرف بھیج دیا۔''

میں نے یہ بیان بڑی ہوشیاری کے ساتھ دیا تھا جس کا اثر یہ ہوا کہ کیپٹن کے چہرے سے ناگواری کے آثار دور ہو گئے۔ اس کی تنی ہوئی بھنویں کچھ نیچی ہو گئیں۔ میں نے شور و غل نہ مچا کر اس پر ایک طرح سے احسان کیا تھا۔ بیرے نے جو برتنوں کے گرنے سے سخت پریشان ہو گیا تھا مجھے کیبن کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے تو نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اپنے طور پر تصور کر لیا تھا کہ میں نے پہلے دستک دی ہو گی اور پھر دھکا دے کر دروازہ کھول دیا ہو گا۔ لیکن اس بیرے کے اس بیان سے میری مشکل حل ہو گئی تھی۔ اگر وہ یہ بیان دیتا کہ یہ صاحب دوڑتے ہوئے آئے اور دھکا دے کر کیبن کا دروازہ کھول دیا تو مجھے اپنے رویے کی وضاحت کرنے میں دقت ہوتی۔

ابتدائی بیانات کے بعد کیپٹن نے چیف آفیسر کو حکم دیا کہ پروفیسر کے کیبن کو مقفل کر دیا جائے۔ مجھے اور بیرے کو کیپٹن کے کیبن میں پہنچا دیا گیا تھا۔ بہرحال یہاں آتے ہی جہاز کے کیپٹن اور ڈاکٹر کا رویہ بالکل بدل گیا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ یہ لوگ مجھ سے میرے کاغذات نہ مانگ بیٹھیں۔ چیف افسر اور میرے کیبن کے ملازم کو یہ بات معلوم تھی کہ میں بحریہ میں لیفٹیننٹ ہوں اور کسی سرکاری کام سے مصر جا رہا ہوں۔ اب تک کسی کے بیانات قلمبند نہیں ہوئے تھے۔ ساری تحقیقات زبانی ہوئی تھیں۔ مگر اب کیپٹن جس طرح اپنی ڈیک پر بیٹھا تھا اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اب وہ مجھ سے تحریری بیان بھی لے گا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے سامنے شارٹ ہینڈ کی نوٹ بک اور قلم رکھا ہوا تھا۔ اور کچھ ہی لمحوں کے بعد جہاز کا ایک افسر وہ نوٹ بک اور قلم لے کر بیٹھ گیا۔ اب وہ لوگ ہمارے بیانات تحریر کرنے والے تھے۔ یہ ایسا مرحلہ تھا کہ اگر میں سمجھداری سے کام نہ لیتا تو شاید بیانات کے بعد حراست میں لے لیا جاتا۔ میں نے بڑے مؤدبانہ انداز میں کیپٹن سے کہا۔

''دراصل میں پروفیسر احتشام بے سے کچھ زیادہ واقف نہیں ہوں۔ فرسٹ کلاس میں ہی ایک انگریز جوڑا مسٹر ہنری اسمتھ اور مسز اسمتھ سفر کر رہے ہیں۔ یہ دونوں میاں بیوی پروفیسر کو استنبول سے جانتے ہیں۔ پروفیسر کے کیبن سے ملی ہوئی ان کی کیبن ہے۔ بیانات قلمبند کرنے سے پہلے اگر ان دونوں کو بھی بلا لیا جائے تو آپ کو آسانی ہو گی۔''

کیپٹن نے اس افسر کو جو سکیورٹی کے فرائض انجام دے رہا تھا، کہا۔ ''جاؤ، ان کے بیان کے مطابق مسٹر اور مسز اسمتھ کو بلا لاؤ۔''

کیپٹن کے کیبن میں بیٹھ کر میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور ان لوگوں کے چہروں سے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ سب کچھ تو میرے ساتھ مسلسل ہو رہا تھا۔ وہ بھوج پتر جب بھی مجھے نظر آتا تھا میں کسی نہ کسی مشکل میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ جبکہ وہ لوگ جو مجھے مہتر بدھ بنانے کے لئے سرگرداں تھے، مجھے کچھ اور ہی دیکھنا چاہتے تھے۔

بہرحال کچھ لمحوں کے بعد مسٹر اینڈ مسز اسمتھ اندر داخل ہو گئے۔ کیپٹن کی کیبن میں مجھے وہ دونوں یوں پریشان حال دیکھ کر حیران ہوئے اور پھر انہیں احتشام بے کی موت کے بارے میں بتایا گیا تو دونوں سکتے میں رہ گئے تھے۔ اس وقت میرے دل میں یہ خواہش ابھری کہ کسی نہ کسی طرح ان دونوں میاں بیوی کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ میں نے ابتدائی بیانات میں کیا کہا ہے تاکہ وہ بھی اسی طرح بیان دیں۔ لیکن کیپٹن ظاہر ہے اس کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے ان لوگوں سے بات چیت کرنا چاہی تو اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔

''نہیں، آپ پلیز خاموشی اختیار کیجئے۔ میں ان لوگوں کے بیانات لیتا ہوں۔''

اور پھر اس نے اس انگریز جوڑے کے بیانات لینا شروع کر دیئے۔ ہنری اسمتھ نے بتایا کہ پروفیسر سے اس کی پہلی ملاقات استنبول میں ہوئی تھی۔

''یہ ملاقات کس سلسلے میں ہوئی تھی؟'' کیپٹن نے سوال کیا۔

''پروفیسر اور اس کی بیٹی مصر کے آثارِ قدیمہ پر کوئی اہم کام کر رہے ہیں۔ ہمیں سیر و سیاحت کا شوق ہے۔ ہم دونوں نے سوچا کہ یہ موقع اچھا ہے، پروفیسر بہت دن تک مصر میں رہیں گے۔ وہاں لوگوں سے ان کے تعلقات ہوں گے۔ اس طرح ہمیں ٹھہرنے اور گھومنے پھرنے کے لئے بہت سی سہولتیں حاصل ہو جائیں گی۔ اس لئے ہم استنبول سے

انہی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

''پروفیسر کے بارے میں آپ اور کیا جانتے ہیں؟''

''پروفیسر کی بیٹی ارسلا قاہرہ میں ہے۔ اس لئے ہم نے طے کیا تھا کہ قاہرہ ہی کو اپنا ٹھکانہ بنائیں گے۔''

''ہوں...... کیا آپ بتا سکتے ہیں مسٹر ہنری کہ پروفیسر کس قسم کا آدمی تھا؟''

''بہت ہی عالم اور قابل شخص تھا یہ۔''

''کیا اس کی کسی سے دشمنی تھی؟''

''نہیں۔ ممکن نہیں ہے۔ اور ہمیں اس کے بارے میں اس طرح کا کوئی علم نہیں ہے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے کا عادی تھا اور یقینی طور پر اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔''

''ہوں، اچھا آپ یہ بتایئے کہ لیفٹیننٹ سے آپ لوگوں کی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟''

ہنری نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پھر مدھم لہجے میں بولا۔ ''اسی جہاز پر۔''

''کس طرح؟''

''پروفیسر نے لیفٹیننٹ سے ہمارا تعارف کرایا تھا۔''

''کیا لیفٹیننٹ پروفیسر سے ملنے ان کے کیبن میں جاتے تھے؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔''

''کیا لیفٹیننٹ کسی علمی مسئلے پر پروفیسر سے مشورہ لیتے رہے ہیں؟'' کیپٹن نے سوال کیا۔

''نہیں، بالکل نہیں۔''

کیپٹن نے میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔ میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ کیپٹن نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پھر روک دیا۔

''پلیز لیفٹیننٹ! آپ بالکل خاموش رہیں گے۔ یہ سوالات میں مسٹر ہنری سے کر رہا ہوں۔ آپ سے سوال کیا جائے تو جواب دیں ورنہ خاموش رہیں۔ مسز اسمتھ نے اس اشارے سے بہت کچھ سمجھ لیا۔ اس نے آہستہ سے اپنے شوہر سے کہا۔

''ہنری! پروفیسر نے جو پرانے نوادرات کھود کر نکالے ہیں ان کے بارے میں......''

ابھی مسز اسمتھ نے اتنا ہی کہا تھا کہ کیپٹن کسی قدر سرد لہجے میں بولا۔

''مسز اسمتھ پلیز! میں آپ کا بیان بھی لوں گا۔ اس وقت آپ جو کچھ بتانا چاہیں، بتا

سکتی ہیں۔''

مسز اسمتھ نے برا سا منہ بنایا۔ ہنری اسمتھ کند ذہن آدمی ضرور تھا لیکن بیوی کی باتوں کو بڑے آرام سے سمجھ لیتا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''کیپٹن معاف کیجئے گا، اس نے مجھے یاد دلا دیا۔ میں ایک بڑی اہم بات بھول رہا تھا۔''

''ہاں بتایئے کیا؟'' کیپٹن نے کہا۔

''پروفیسر نے ابھی تھوڑی دیر پہلے لیفٹیننٹ کو اپنے کیبن میں بلایا تھا۔ وہ انہیں کوئی نادر چیز دکھانا چاہتے تھے جس پر کوئی ایسی عبارت تحریر تھی......'' اسی وقت مسز اسمتھ نے فوراً اپنے شوہر کا جملہ درمیان سے اچک لیا۔ وہ تختی کی اس قیمتی عبارت کے بارے میں کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''کیپٹن! کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ آپ جارحانہ انداز میں ہم سے یہ سوالات نہ کریں اور کسی بھی طور ہمیں مجرم نہ گردانیں۔ ہم دوستانہ فضا میں اس مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہم تینوں کو جو کچھ معلوم ہے ہم رضا کارانہ طور پر آپ کو بتا دیں گے۔ اور پھر آپ اپنے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔''

مسز اسمتھ ضرورت سے زیادہ تیز معلوم ہوتی تھی۔ اس کی معنی خیز نگاہیں اپنے شوہر کو دیکھتی رہی تھیں۔ ہنری اسمتھ اپنی رو میں اس تختی کے بارے میں بتا کر جو غلطی کرنے لگا تھا مسز اسمتھ نے بروقت گڑبڑ پھیلا کر اسے روک دیا تھا۔ کیپٹن کی عقابی نگاہیں ایک ایک کر کے ہم تینوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان دونوں کا مسئلہ تو ایک لمحے میں حل ہو گیا تھا لیکن میرے لئے مشکلات پیدا ہو گئیں۔ کیپٹن دیر تک ان دونوں کے بیانات لیتا رہا اس کے بعد اس نے مجھے ہدایت کی کہ میں کسی اور شخص سے اس موضوع پر بات نہ کروں۔ اس نے کہا۔

''دیکھئے لیفٹیننٹ! آپ کا لاش کے قریب پایا جانا ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اس تفتیش میں تعاون کریں۔ اور اگر کوئی بات بتانے سے رہ گئی ہے تو براہِ کرم یاد کر کے بتائیں۔''

''جی...... میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔'' میں اس کے لہجے سے سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھ کو اس قتل میں ملوث سمجھتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے میرے خلاف اس کے پاس کوئی معقول ثبوت نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ ہم تینوں کے بیانات میں

ایک قدیم مصری یادگار کا ذکر آیا تھا۔ مسٹر اور مسز اسمتھ نے لاکھ چھپانے کی کوشش کی لیکن کیپٹن نے جرح کر کے معلوم کر ہی لیا کہ پروفیسر احتشام بے جس نادر چیز کے بارے میں مجھے بتانا چاہتا تھا وہ ایک فولادی تختی ہے اور اس تختی پر قدیم مصری تحریر میں کوئی ایسی عبارت لکھی ہے جو کسی اعتبار سے نہایت قیمتی ہو سکتی ہے اور یہ قتل اسی تختی کو حاصل کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔

"ٹھیک...... بہرحال یہ بات قابل غور ہے کہ آپ تینوں کے علاوہ اس تختی کے بارے میں اور کسی کو معلومات حاصل نہیں تھیں۔"

"آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کیپٹن، ذرا وضاحت کیجئے اس بات کی۔" میں نے اپنے لہجے کو مضبوط بنا کر کہا۔

"نہیں...... میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس وقت تک کچھ نہیں کہنا چاہتا جب تک میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں آ جاتا۔" کیپٹن نے یہ کہہ کر اپنے دو افسروں کو طلب کیا اور انہیں مقتول پروفیسر کے کیبن کی تلاشی لینے کے لئے بھیج دیا۔

یہ دونوں افسر تقریباً ایک گھنٹے کے بعد واپس آئے تھے لیکن انہیں کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ ان کے بقول پروفیسر کے سامان میں ایسی کوئی تختی نہیں پائی گئی تھی۔

"ٹھیک۔ اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ مگر آپ رُکئے ایک منٹ۔" کیپٹن نے مسٹر اور مسز اسمتھ کو جانے کی اجازت دے دی۔ مجھے اس نے نجانے کس لئے روکا تھا۔ وہ غور کرتا رہا تھا اور اس کی پیشانی شکن آلود ہو رہی تھی۔ پھر کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے، آپ بھی جایئے۔"

اپنے روکے جانے کی وجہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن بہرحال ہر چیز سمجھ میں تو نہیں آ جاتی۔ میں باہر نکلا اور سیدھا مسٹر اور مسز اسمتھ کے کیبن کی طرف چل پڑا۔ میں نے اب یہ طے کر لیا تھا کہ ان لوگوں کو ہیگ کے بارے میں جو کچھ بتا سکتا ہوں ضرور بتا دوں گا تاکہ وہ بھی صورتحال سے واقفیت حاصل کر لیں۔

میں ان کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ دونوں کے چہروں پر تشویش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ مسز اسمتھ نے کہا۔ "آہ...... یہ بہت برا ہوا۔ ایک بہت بڑا عالم، عالم ہی نہیں بلکہ ہمارے لئے خوشحالی کے دروازے کھولنے والا ایک شخص جسے ہم ایک عظیم الشان خزانے کی کنجی سمجھتے تھے، دنیا سے چلا گیا۔"

"ہاں...... بہت دُکھ کی بات ہے۔ لیکن میں اس سلسلے میں آپ لوگوں کو ایک اور شخصیت کی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی...... بتایئے؟"

"اس سلسلے میں مجھے ایک شخص پر شبہ ہے جو جہاز پر ہی موجود ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہاں۔ اس کا نام ہیگ جونس ہے۔"

"کون ہے یہ شخص؟"

"ایک بہت ہی بڑا شعبدہ باز جس نے میرے دوست این مورالس کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"کیا مطلب؟" مسز اسمتھ نے پوچھا اور میں نے ان لوگوں کو مورالس کی خودکشی کے الم ناک حادثے میں جو کردار ہیگ نے استعمال کیا تھا اس کی تفصیل بتائی۔ پھر میں نے انگریز جوڑے کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ہم باری باری ہیگ کے کیبن کی نگرانی کریں گے۔ یقینی طور پر وہ تختی ہیگ نے اڑا لی ہے۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ ہیگ کو اس بارے میں معلومات حاصل تھیں؟"

"وہ جس قدر شاطر اور چالاک آدمی ہے میں آپ کو اس بارے میں بتا چکا ہوں۔ سو فیصدی اس نے آدھی تختی پروفیسر کے کیبن سے اڑا لی ہے اور سکندریہ اب جہاں ہمارا جہاز رکے گا وہ اس فولادی تختی کو لے کر غائب ہونے کی کوشش کرے گا۔ اس لئے مسٹر اسمتھ! ہم اس کے کیبن کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ اور اگر ہیگ اس تختی کو بندرگاہ پر اترنے یا دورانِ سفر جہاز ہی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی کوشش کرے گا تو ہمیں اس کا پتہ چل جائے گا۔"

"لیکن آپ کی اس سے یہاں ملاقات ہو چکی ہے؟"

"براہِ راست نہیں۔ بلکہ یہ سمجھئے جہاز کی راہداریوں میں، ڈیک پر اور لان میں میری اس سے مڈبھیڑ ہو چکی ہے۔"

"لیکن اس نے آپ کو پہچانا نہیں؟"

"میری داڑھی اور رنگین چشمے کی وجہ سے وہ مجھے نہیں پہچان سکا ہے۔ اور ویسے بھی

میں اب چونکہ سویلین لباس میں ہوں۔ وہ مجھے سویلین کپڑوں میں بھی نہیں پہچان سکے گا۔ مجھے یقین ہے اس بات کا۔"

"آہ...... واقعی صورتحال کس قدر سنگین ہو گئی ہے۔ لیکن اس طرح تو ہمیں بڑی سخت نگرانی کرنی پڑے گی۔"

"بالکل۔"

بہر حال میں نے اپنی کیبن سے ملے ہوئے اپر ڈیک کے چھوٹے سے قطعے پر کرسی ڈالی اور اس طرح ترچھا ہو کر بیٹھ گیا کہ کیبن نمبر سترہ میں آنے جانے والے ہر آدمی کو دیکھ سکوں۔ موسم سرد ہوتا جا رہا تھا اور دھوپ بری نہیں لگ رہی تھی۔ ویسے اگر یہ موسم اس قدر خوشگوار نہ ہوتا اور ہمارا جہاز گرم استوائی علاقے سے گزر رہا ہوتا تو شاید میری نگرانی اتنی آسان نہ ہوتی۔

بہر حال میں بہت دیر تک کرسی پر بیٹھا رہا۔ اپر ڈیک کے اس مختصر قطعے پر دو تین مسافر اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم یعنی میں ہیگ کی تمام مصروفیات کا جائزہ لے رہا تھا۔ چار گھنٹوں میں اس نے دو دفعہ بیرے سے بیئر منگوائی تھی۔ پھر ایک مرتبہ ناشتہ منگوایا۔ اس کے بعد اسٹیورڈ اس کے دُھلے اور استری کئے ہوئے کپڑے لے کر آیا۔ جہاز کے عملے کے لوگ تو ضرور ہیگ کے کیبن میں آتے جاتے رہے تھے لیکن وہ خود ایک مرتبہ بھی باہر نہیں آیا اور نہ ہی باہر سے کوئی دوسرا شخص اس سے ملنے پہنچا۔

مجھے اب یہ نگرانی کرتے کرتے اکتاہٹ سی سوار ہو گئی تھی اور اس کے علاوہ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ آخر میں کب تک چیئر پر بیٹھا بیٹھا بسکٹ اور بیئر منگوا کر وقت گزاری کرتا رہتا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد میں نے مسز اسمتھ کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ مجھ سے بے تعلق قریب کے ایک ڈیک پر ایک چیئر پر آ بیٹھی اور وقت گزاری کے لئے ایک پرانا اخبار اٹھا لیا۔ اس کا مجھ سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ اس نے اخبار کی اوٹ میں آہستہ سے کہا۔

"لیفٹیننٹ! آپ دو گھنٹے کے لئے چھٹی کر سکتے ہیں۔ اس وقت میں بیٹھی ہوئی ہوں۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور کاہلی سے اٹھ کر سلیپر پہنے اور کتابیں اور رسالے اٹھا کر اپنے کیبن میں داخل ہو گیا۔ میں بری طرح تھک گیا تھا۔ چنانچہ میں نے سیدھے غسل خانے کا رخ کیا اور دیر تک غسل کرتا رہا۔ پھر میں نے لباس بدلا اور اسٹیورڈ سے کھانا لانے کے لئے کہہ دیا۔ کچھ دیر بعد اسٹیورڈ نے میری طلب کی ہوئی اشیاء لا کر

میرے سامنے رکھ دیں اور میں کھانے میں مصروف ہو گیا۔ میرے ذہن کی چرخیاں برق رفتاری سے چل رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ اس کے بعد کیا صورتحال درپیش ہو گی۔ ویسے پروفیسر احتشام بے کی موت کا مجھے دلی رنج تھا۔ میں نے اس سے بہت سی توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ خاص طور سے وہ بے نقش چہرہ جو میرے حواس پر اس طرح جم گیا تھا کہ جب تک بھلائے رکھنا چاہوں بھلاؤں، لیکن ایک لمحے کے لئے اپنی قوتِ ارادی سے کام نہ لوں تو وہ چہرہ میرے تصور پر فوراً حملہ آور ہو جائے۔ آخر ایسی کیا خاص بات تھی ارسلا میں؟ بس اس کے باپ نے اس کے وجود کی نشاندہی کر دی تھی اور میں ہوس کا مارا ایک ایسے حسین وجود کے چکر میں پڑ گیا تھا جو اپنی مثال آپ ہو۔ حالانکہ اس دوران جو کچھ بھی میرے ساتھ ہوا تھا وہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ مجھے ہر طرح یہ احساس دلانے کی کوشش کی گئی تھی کہ میں برے راستوں پر پڑ گیا ہوں اور یہ سچ بھی تھا۔ جو کچھ میں کر چکا تھا وہ بالکل الگ بات تھی۔ حالانکہ سلطان چچا نے اس بات کو بڑی آسانی سے لے لیا تھا اور انہوں نے یہی کہا تھا کہ خود ہمدان جمشیدی بھی ایک حسن پرست انسان تھے اس لئے بقول ان کے باپ پر پوت پتا پر گھوڑا۔ مگر یہاں مسئلہ بالکل مختلف تھا۔ میری کیفیت تو ایک ایسے بھٹکے ہوئے انسان کی تھی جو بے شک برائیوں کے راستے کا راہی نہ ہو لیکن کچھ پراسرار قوتیں یا پھر یہ کہنا چاہئے کہ اشبھ بھاونائیں مجھے اس راستے پر لا کر ڈال دیتی تھیں۔ بہر حال میں انہی تمام سوچوں میں گم رہتا تھا۔

مجھے علم ہوا کہ اسکندریہ کی بندرگاہ کا فاصلہ اب یہاں سے چند ہی گھنٹوں کا رہ گیا ہے۔ میں نے اپنا سوٹ کیس وغیرہ تیار کیا اور اس کے بعد باہر نکل آیا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے مسافر اس ساحل کی لکیر کا جائزہ لے رہے تھے جو اب دور سے نظر آنے لگی تھی۔ میں پُرخیال انداز میں اس لکیر کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ اسکندریہ میں یقینی طور پر ہیگ کا پورا گروہ موجود ہو گا۔ ہیگ آسانی سے اس سلسلے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس گروہ کے افراد کے حوالے وہ یہ فولادی تختی کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی کوشش ہو سکتی تھی تو صرف یہ کہ کیپٹن ہماری مدد کرے اور اس کی مدد سے کچھ کیا جا سکتا ہے ورنہ یہ بات طے تھی کہ ہیگ کے لئے اس تختی کو نکال لے جانا اب ایسا کوئی مشکل مسئلہ نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ ایک پرانا اسمگلر تھا۔

میں ڈیک پر پہنچا تو ہماری جاسوس پارٹی یعنی مسز اسمتھ اور مسٹر اسمتھ نے بتایا کہ

ہیگ پیسنجر لاؤنج کی طرف گیا ہے۔ ویسے میں بھی اس سفر کے دوران اس کی عادات و اطوار کا بغور مطالعہ کرتا رہا تھا۔ کھانے کے بعد پیسنجر لاؤنج کی طرف جانے کے معنی یہ ہیں کہ اب وہ کافی پیئے گا اس عادت کی وجہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ عام طور سے ہیگ اپنے کیبن میں ہی کھانا منگوا لیا کرتا تھا۔ مے نوشی کے لئے بھی اس نے کیبن کے گوشۂ عافیت کو ہی پسند کیا تھا۔ مگر کافی وہ ہمیشہ پیسنجر لاؤنج میں مسافروں کے درمیان بیٹھ کر پینا پسند کرتا تھا۔ میں نے مسز اسمتھ سے سوال کیا۔

''کیا وہ کافی ہاؤس جا چکا ہے؟''

''ہاں، اسے وہاں گئے ہوئے دس منٹ ہو چکے ہیں۔''

وقت بہت کم تھا۔ لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ چاہے اب کچھ بھی ہو، میں پروفیسر کے قاتل کو قانون کے حوالے کر کے رہوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ تختی ابھی تک ہیگ کے کیبن میں موجود ہے۔ میں یہ بھی کر سکتا تھا کہ کیپٹن کو ہیگ کے بارے میں تفصیلات بتا دیتا اور اسے ہیگ کے کیبن کی تلاشی لینے پر آمادہ کر لیتا۔ لیکن یہ ایک خطرناک کھیل ہوتا۔ یہ ایک طرح سے ہیگ کی نگاہوں میں آ جانے والی بات تھی۔ وہ بہت بڑا عیار مجرم تھا۔ اگر وہ اس عرصے میں اس فولادی تختی کو اپنے کیبن میں منتقل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے تو میں الٹا مشکل میں پھنس جاؤں گا۔ جبکہ میں محتاط کھیل کھیلنا چاہتا تھا۔ بہرحال مسز اسمتھ نے مجھ سے کہا۔

''اب مجھے بھی اجازت دو۔ چونکہ اسکندریہ کا راستہ بہت کم رہ گیا ہے اور میں اپنا سامان پیک کرنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... آپ جایئے مسز اسمتھ۔'' میں نے کہا۔

میرے ذہن میں جو منصوبہ بن رہا تھا وہ بہت خطرناک تھا۔ لیکن اب چونکہ وقت بہت کم رہ گیا تھا اس لئے خطرے کی پرواہ زیادہ نہیں کرنی چاہئے۔ میں کیبن نمبر سترہ کا جائزہ لینا چاہتا تھا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ جہاز پر کتنے افراد ہیں جو ہیگ کے ساتھی ہیں اور اس کے لئے کام کر رہے ہیں۔ میں نے دائیں بائیں دیکھ کر یہ اطمینان کر لیا کہ جہاز کے عملے کا کوئی شخص یا ہیگ کا ملازم تو مجھے نہیں دیکھ رہا؟ اور پھر میں سترہ نمبر کے کیبن کے دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے دروازے پر قسمت آزمائی کی تو وہ کھل گیا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ پھر میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ کیبن میں ہر

سلیقے اور ترتیب سے سب چیزیں جمی ہوئی تھیں۔ چھوٹے بڑے ٹرنک ایک قطار میں رکھے ہوئے تھے۔ گویا ایک طرح سے ہیگ اسکندریہ کی بندرگاہ پر اترنے کے لئے اپنی تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ چھوٹے ٹرنکوں اور پیکٹوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے بڑے صندوقوں اور بنڈلوں وغیرہ کا جلدی جلدی جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ان میں سے کوئی صندوق اس طرح کا نظر نہیں آ رہا تھا جس سے یہ خیال ہوتا کہ اس میں فولاد کی وزنی تختی چھپائی گئی ہے۔ پلنگ کے نیچے، وارڈروب میں، غرض میں نے ہر جگہ تلاش کر لیا لیکن پروفیسر کی اس منحوس فولادی تختی کا کہیں پتہ نہ چلا۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا اور جہاز بندرگاہ سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اب ہیگ مسافروں کے لاؤنج میں اپنی کافی ختم کر چکا ہو گا اور کسی بھی وقت وہ کیبن میں واپس آ سکتا ہے۔ میں نے کیبن کے ایک گوشے میں بیت کی بنی ہوئی ایک چوڑی اور خاصی اونچی چوکور ٹوکری دیکھی جو استعمال شدہ کپڑے اور چادریں وغیرہ رکھنے کے لئے جہاز کے ہر فرسٹ کلاس کیبن میں موجود ہوتی ہے۔ ہیگ کے سامان سے الگ تھلگ بیت کی ٹوکری یا ٹوکری نما صندوق بالکل غیر متعلق یا غیر اہم نظر آتا تھا۔ سامان کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے کسی کی عقل میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ اسے بھی دیکھ لیا جائے۔ میں نے صندوق کا ڈھکنا ہٹایا اور دور تک میلے کپڑوں کا ڈھیر کنگھال ڈالا۔ کپڑوں کے انبار کے نیچے کوئی کھردری سی چوکور سی چیز کپڑے میں لپٹی پڑی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس بھاری بھرکم چیز کو ایک ہاتھ سے اٹھانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس بھاری پیکٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔

اچانک ہی راہداری میں تیز قدموں کی چاپ سنائی دی۔ قدموں کی یہ چاپ کیبن کے دروازے پر آ کر رک گئی تھی۔ میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ میں نے اس بڑی اور عظیم الشان ٹوکری میں کپڑوں کے پیچھے غوطہ لگایا اور اس کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ استعمال شدہ کپڑوں کی گھٹی گھٹی بو ناقابل برداشت تھی۔ میں ہل جل بھی نہیں سکتا تھا اس لئے کہ بیت کا صندوق چرچراتا اور آنے والا میری موجودگی سے باخبر ہو جاتا۔ جو کوئی بھی تھا، وہ سیٹی پر کوئی اسپینی دھن بجا رہا تھا۔ پھر اس نے منہ ہی منہ میں کچھ کہا اور اسپینی زبان میں گالی بکی۔ ایک لمحے کے اندر مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ ہیگ نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں نے

اس کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزارا تھا۔ بظاہر وہ ایک انتہائی مہذب آدمی نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے اسپینی موسیقی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اسے عربی موسیقی کی ناجائز اولاد کہتا تھا۔ کیبن میں آنے والا کوئی اور ہی تھا، ممکن ہے ہیگ کا کوئی ملازم ہو۔ بہرحال یہ ملازم باتھ روم میں داخل ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد ہی باہر نکل آیا۔ پھر چابی کا گچھا بجاتا ہوا الماری کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے زور سے الماری کے پٹ کھولے اور پھر بند کر دیئے۔ اب وہ بیت کے اس صندوق کے پاس کھڑا تھا۔

میں تہہ در تہہ میلے کپڑوں کے درمیان پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہیگ کے ملازم نے اس صندوق کو زوردار ٹھوکر ماری۔ میں دم سادھے بیٹھا ہوا تھا۔ خدایا، یہ کچھ اور آگے نہ بڑھ آئے۔ اگر وہ میلے کپڑوں کے ڈھیر نکالنا چاہے گا تو پھر میں اس کے سامنے عریاں ہو جاؤں گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ لمحے بھر کے لئے صندوق کے پاس کھڑا رہا، پھر چابیوں کا گچھا ہلاتا ہوا دروازے کی جانب بڑھا۔

میں ڈر رہا تھا کہ یہ خبیث کہیں واپس کیبن میں نہ آ جائے۔ اس لئے کہ اب اس نامعقول جگہ میرا شدید دم گھٹنے لگا تھا۔ خاص طور سے کپڑوں کی ناخوشگوار بو ماحول کو بری طرح خراب کئے ہوئے تھی۔ تقدیر بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ امید و بیم کی کیفیت پیدا کرتی ہے اور پھر خود ہی اسے ختم کرتی ہے۔

ہیگ کے ملازم نے کیبن کا دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ چلو جان چھوٹی۔ لیکن یہ اطمینان ایک لمحے سے زیادہ کا نہیں تھا۔ اس لئے کہ ملازم نے دروازہ بند کرنے کے بعد اسے باہر سے مقفل کر دیا تھا۔ آہ...... میں نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ایسا بھی ہو جائے گا۔ جس بات سے میں ڈر رہا تھا وہی ہو گئی۔ اسکندریہ پہنچنے سے پہلے ہیگ سے الجھنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں بھیڑیئے کو خود اس کے بھٹ میں ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت حالات نے مجھے اس کے رحم و کرم پر لا ڈالا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد ملازم کے ساتھ وہ کیبن میں آئے گا۔ اس تختی کو جہاز سے اتارنے کی تدبیر کرے گا۔ کیا عجیب بات تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ تختی اس قدر وزنی ہو گی اور اسے حاصل کر کے لے جانے کے لئے خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لازمی بات ہے کہ ہیگ کو بھی اس سلسلے میں خاصی پریشانی ہو گی۔ لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ کیبن میں میری موجودگی سے میری اصل شخصیت اس پر ظاہر ہو

جائے گی۔ کلکتے میں تو ہیگ نے اپنی دانست میں مجھے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ میں بچ نکلا۔ لیکن اس دفعہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا اس لئے کہ میں اس کے تازہ ترین جرم کی رونمائی کر رہا ہوں۔ اور یہ بات بھی اس کے لئے انتہائی خوفناک تھی کہ مجھ جیسا آدمی اس کے پیچھے لگ جائے جو اس کے پچھلے جرائم کے بارے میں سب کچھ جانتا ہو۔

اس وقت میں اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ مجھے بیت کے صندوق سے اس تختی کو نکالنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ میں وحشت میں کیبن کے دروازے پر زور آزمائی کرنے لگا۔ کیونکہ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ کسی بھی لمحے ہیگ اور اس کا نوکر آ سکتے تھے۔ ابھی میں دروازے پر زور آزمائی کر ہی رہا تھا کہ دور سے قدموں کی چاپ اور دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اسپینش میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا کہ یقینی طور پر وہ ہیگ اور اس کا ملازم ہیں۔ مجھے اور کچھ تو نہ سوجھا، سیدھا باتھ روم میں جا گھسا اور اندر سے چٹخنی لگا دی۔ اپنی دانست میں، وقتی طور پر ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو گیا تھا۔ لیکن میرے کان اور آنکھیں باہر ہی لگی ہوئی تھیں۔

آہ...... میرا اندازہ درست تھا۔ ہیگ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ملازم بھی تھا۔ میں سانس روکے ہوئے تھا اور میرا دم بری طرح گھٹ رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے سانسوں کی آواز تک سن سکے۔ وہ دونوں کیبن میں آئے اور اس کے بعد سامان اٹھاتے اور رکھتے رہے۔ غالباً اپنا سامان سیٹ کر رہے تھے۔ پھر ہیگ باہر چلا گیا، اس کا ملازم منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا کیبن میں اِدھر سے اُدھر آ جا رہا تھا۔ پھر یکایک اس نے باتھ روم کے دروازے کو دھکا دیا مگر دروازے اندر سے بند تھا۔ وہ حیران ہو گیا اور اس نے جیسے خود سے کہا۔

”اندر کون ہے...... کون ہو سکتا ہے؟ ارے اندر کون ہے؟“ اس نے زوردار آواز لگائی اور میں بری طرح گھبرا گیا۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ کموڈ کے اوپر کوئی ڈیڑھ فٹ چوڑا روشن دان تھا جس سے سمندر کی بھیگی ہوئی ہوائیں آ رہی تھیں۔

”باتھ روم میں کون ہے؟“ اب کے ملازم نے بہت غصے سے پوچھا اور دروازے پر مکے برسانا شروع کر دیئے۔ پھر کسی کی تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ آنے والا کیبن

میں داخل ہوا اور اس کی آواز اُبھری۔

''کیا شور مچا رکھا ہے تم نے...... کیا ہو گیا ہے؟''

آہ...... یہ آواز ہیگ کی ہی تھی۔ میں اس آواز کو ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔

''سر! باتھ روم میں کوئی ہے۔ میں چیف افسر کو بلاتا ہوں۔ کوئی ہمارے کیبن میں چوری کرنے کے لئے گھسا ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''نہیں سر! آپ دیکھ لیجئے، باتھ روم کا دروازہ اندر سے بند ہے۔''

''ہوں، اگر ایسی بات ہے تو اطمینان رکھو۔ وہ بچ کر نہیں جا سکتا۔ چلو آؤ...... باہر آؤ۔ اور کیبن کو تالا لگا دو۔ تم دوڑ کر چیف افسر کو بلا لاؤ میں یہاں دروازے پر کھڑا ہوا ہوں۔''

پھر وہ دونوں باہر نکل گئے اور دروازہ مقفل ہو گیا۔ آہ...... اس وقت پھر میری حالت بری طرح خراب ہو گئی تھی۔ چیف افسر کو بلانے کا مقصد یہ تھا کہ مجھ پر نہ صرف چوری کی نیت سے ایک مسافر کے کیبن میں داخل ہونے کا الزام لگے بلکہ کیپٹن کو پوری طرح یقین ہو جائے کہ احتشام بے کے کیبن میں داخل ہونے والا اور اس پر حملہ کرنے والا مجرم میں ہی ہوں۔ بڑی خوفناک صورتحال پیش آ گئی تھی اور میں بری طرح گھر گیا تھا۔

بہر حال ناچار میں نے کموڈ پر کھڑے ہو روشندان سے باہر نظر ڈالی، یہ روشن دان اس ڈیک کے جس حصے پر کھلتا تھا وہ نسبتاً کم آباد تھا۔ میں نے وقت کے ساتھ دوڑ لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ چاہے کچھ ہو جائے، مجھے روشندان کے ذریعے باہر کودنا ہو گا۔ میں صرف اسی صورت میں بچ سکتا ہوں۔ روشندان سے باہر نکلنے میں اب دیر نہیں کرنی چاہئے کیونکہ چیف افسر کے پہنچنے پر ڈیک کے اس حصے کو بھی گھیر لیا جائے گا۔ وہ اس صورتحال کو کچھ زیادہ بہتر طریقے سے سمجھتا ہے۔

میں ابھی روشندان سے سر نکالے باہر کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ دروازے کے دوسری طرف راہداری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔

آہ...... وہ آ گئے تھے...... وہ آ گئے تھے......!

***

میرا پورا بدن پسینے سے تر تھا۔ میں جانتا تھا کہ چیف افسر آتے ہی اپر ڈیک کے اس حصے کو گھیرنے کے لئے آدمی بھیج دے گا جس پر روشن دان کھلتا ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ اس وقت بھی دو تین ملاح چکر لگا کر اس طرف آ رہے ہوں۔

میں نے روشن دان کے فولادی فریم پر انگلیاں جمائیں اور زور لگا کر روشن دان سے آدھا باہر کی طرف لٹک گیا۔ اندر کیبن میں اب بہت سے لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر انہوں نے غسل خانے کے دروازے سے زور آزمائش شروع کر دی۔ میں نے بازوؤں کا سارا زور لگا کر باہر کی طرف چھلانگ لگا دی۔ ڈیک چیئر پر کوئی موٹی امریکن عورت کسی رسالے سے چہرہ ڈھانپے پیر پھیلائے اونگھ رہی تھی۔ میں اس کے پیروں کے قریب جا گرا تھا۔ اس نے ہڑبڑا کر رسالہ دور پھینک دیا اور ہلکی سی چیخ مار کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ یہ سمجھی کہ اونگھتے میں اس نے جو پیر پھیلا دیئے تھے تو میں گزرتے ہوئے اس کے پیروں سے الجھ گیا ہوں۔ وہ بری طرح گھگیانے لگی۔

''آئی ایم سوری سر! آئی ایم ویری سوری...... آئی ایم سوری۔ آپ میرے پیروں سے الجھ کر گر پڑے۔ سر! آپ کو چوٹ تو نہیں لگی؟'' وہ معذرت آمیز لہجے میں بولی۔

میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے کہا۔ ''نہیں میڈم نہیں۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں خود ہی دیکھے بغیر چل رہا تھا۔ اور پھر آپ کے پیروں سے الجھ کر گر پڑا۔ آپ کے اپنے پیروں میں تو چوٹ نہیں لگی؟''

''نہیں، بہت بہت شکریہ تمہارا شریف آدمی۔'' اس نے کہا۔ میں نے ایک بار پھر گردن خم کر کے اسے خدا حافظ کہا اور مڑے بغیر سیدھا اس زینے سے نیچے کے ڈیک کی طرف اتر گیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے ایک بار پھر مجھے نئی زندگی مل گئی ہو۔ یہاں تک کہ میں اپنے کیبن تک پہنچ گیا اور کیبن میں داخل ہو کر میں نے اس طرح اپنے آپ کو زمین پر گرا دیا

جیسے موت کے جبڑوں سے نکل کر باہر آیا ہوں۔ کچھ لمحے اسی طرح میں نے گزارے، پھر دفعتہً ہی مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے اپنا حلیہ دیکھا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا حلیہ درست کیا اور اس کے بعد میں تقریباً دوڑتا ہوا اپنے کیبن سے باہر نکلا اور مسٹر اینڈ مسز اسمتھ کے پاس پہنچ گیا۔ چند لمحے پہلے جو واقعات رونما ہوئے تھے وہ دونوں اس سے ناواقف تھے۔ البتہ دونوں نے میری اس کیفیت کو محسوس کر لیا تھا جو اس وقت مجھ پر طاری تھی۔ مسز اسمتھ نے چونک کر کہا۔

"خیریت ڈیئر خاقان! کیا بات ہے؟"

"میں اس آدھی تختی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔"

"کیا؟" دونوں اچھل پڑے۔

"ہاں۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"ہیگ کے کیبن میں۔"

"وہاں کس جگہ؟"

"اس کے کیبن میں میلے کپڑوں کے صندوق میں چھپی ہوئی ہے۔" میں نے جواب دیا اور دونوں کا رنگ زرد ہو گیا۔

"تب ہمیں یہ کرنا چاہئے مائی ڈیئر! کہ ہم اسی وقت کیپٹن کو تمام حالات سے آگاہ کر دیں اور ہیگ کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرا دیں۔"

"کیا بات کر رہے ہو..... تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس طرح کیا ہیگ اور اس کے گروہ کا کھیل سمجھ میں آ جائے گا؟" مسز اسمتھ نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"سنو..... اگر اس مسئلے پر پولیس مداخلت کرتی ہے تو تختی کو بطور ثبوت اس کی تحویل میں دے دیا جائے گا اور تفتیش، مقدمے اور گواہی کے چکر میں اتنا عرصہ لگ جائے گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پروفیسر احتشام بے کی موت سے ہم شدید نقصان سے دوچار ہوئے ہیں مگر یہ بات تم جانتے ہو کہ تختی کا دوسرا آدھا حصہ ارسلا کے پاس قاہرہ میں محفوظ ہے اور ارسلا قدیم مصری علامتوں کو سمجھتی ہے اور تختی کا پورا مضمون اور تمام اشارے بتا کر خزانے تک پہنچ سکتی ہے۔ سارا کھیل بگڑ جائے گا اگر ہم نے اس وقت

تختی کو کسی طرح پولیس کی تحویل میں دے دیا۔ پھر پولیس یہ بھی جاننے کی کوشش کرے گی کہ تختی کا راز کیا ہے۔ اور سارا کھیل ہی ختم ہو جائے گا۔"

میں نے حیرت سے مسز اسمتھ کو دیکھا۔ پروفیسر کے قاتل کو گرفتار کروانے سے زیادہ اسے اس بات سے دلچسپی تھی کہ جیسے بھی بن پڑے ہیگ سے تختی کا آدھا ٹکڑا واپس حاصل کیا جائے۔ مگر کچھ لمحے سوچنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔

"لیفٹیننٹ! میں آپ کو اس مہم میں حاصل ہونے والی دولت میں سے ایک چوتھائی حصے کی پیشکش کرتی ہوں۔ آپ کا کام صرف یہ ہے کہ تختی کا یہ نصف حصہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے ہیگ سے واپس لے لیں۔ کہئے، آپ کو یہ سودا منظور ہے؟"

مجھے سودا اس لئے تو بھلا کیا ہی منظور ہوتا کہ اس کے بدلے بھی مجھے اس نامعلوم خزانے کا چوتھائی حصہ ملے گا لیکن ہیگ سے ٹکر میرے لئے بہترین چیز تھی۔ میں اس عورت کی ذہنیت سے کچھ تکدر کا شکار ضرور ہوا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیگ اس وقت ہمارا مشترکہ دشمن تھا اور میں اسے کیفر کردار تک پہنچانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اگر ہیگ سے مقابلہ کرنے کے لئے دولت کی پیشکش نہ ہوتی تو بھی میں یہی کرتا جس ارادے سے ہندوستان سے چلا تھا۔

"میں جائزہ لیتا ہوں۔" میں نے کہا اور ان دونوں کے پاس سے واپس آ کر ہیگ کے کیبن کی طرف چل پڑا۔ وہاں میں نے جو کچھ دیکھا وہ مجھے چکرا دینے کے لئے کافی تھا۔ ہیگ کا سارا سامان راہداری میں قطار سے رکھا ہوا تھا اور اس کا ملازم قلیوں کی ایک مختصر فوج کے ساتھ اپنے آقا کے سوٹ کیسوں، پیکٹوں اور پلندوں کو اٹھا کر لے جانے کے لئے تیار تھا۔ ادھر ہیگ کمر پر ہاتھ جمائے کھڑا تھا اور ہیگ کے قریب اس کا پرانا دوست اور اسکندریہ کا تاجر جو خود بھی ترکی تھا اور جس کا نام ہشمان ذکری تھا، کھڑا ہوا تھا۔ یہ تاجر قیمتی سگار منہ میں دبائے کھڑا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اس شخص کو میں نے پہلی بار کلکتے میں دیکھا تھا۔ وہ اور جاپانی اسمگلر ایکاٹو، وائسرائے ہند کے سکیورٹی افسر این مورالس کی خودکشی سے ایک دن پہلے کلکتے میں وارد ہوئے تھے۔ جس وقت ہیگ مجھے اور این مورالس کو خفیہ کاغذات چرانے وائسرائے کے چیمبر میں بھیج رہا تھا اس وقت یہ اس کے ساتھ تھا۔

یہ لوگ بل ویدا ہاؤس کے کمپاؤنڈ کے باہر ہمارا انتظار کرتے رہے تھے اور پھر جب ہم ٹبر میں پھنس گئے تھے تو یقیناً یہ چلے گئے ہوں گے۔ اب اتنا طویل عرصہ گزرنے کے بعد

اور اس قدر المناک حادثات سے بچ بچا کر میں ایک بار پھر اپنے ان دشمنوں کو اپنے گرد گھیرا ڈالتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

بہر حال میں سکون سے چلتا ہوا اس ہجوم کے قریب سے گزرا۔ ہیگ کمبخت ہشمان ذکری سے عربی میں گفتگو کر رہا تھا اور بڑی عمدگی سے عربی بول رہا تھا۔ میں نے ان کے قریب سے گزرتے ہوئے دونوں کے کچھ ادھورے فقرے سنے۔ ذکری، ہیگ سے کہہ رہا تھا۔

"ہماری لانچ دس منٹ کے بعد روانہ ہوگی۔ اگر تمہارے آدمی نے سارا سامان نکال لیا ہو تو" اس نے سارا سامان کہتے ہوئے معنی خیز انداز میں ہیگ کی طرف دیکھا اور ہیگ نے مسکرا کر پُراطمینان انداز سے گردن ہلائی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا ہے۔

یہ لوگ پروفیسر احتشام بے کی تختی کو جہاز سے نکال کر لے جانے کے تمام انتظامات کر چکے ہیں۔ آہ...... ہیگ مجھ سے زیادہ صاحب اختیار ہے۔ میں تو صحیح معنوں میں اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکا۔ لیکن اس نے اپنے اردگرد کا سارا ماحول مضبوط کر رکھا ہے۔ اس کمبخت ذکری بے کو میں نے پورے سفر کے دوران ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ نجانے کون کون اس خوفناک اسمگلر کے ساتھ ہو۔ میں کہیں جلد بازی کا شکار تو نہیں ہو گیا؟ جو کچھ میں نے کیا ہے وہ اس قدر مضبوط نہیں ہے کہ ہیگ کو آسانی سے شکست دے سکے۔ بہر حال اگر میں نے اس وقت فوراً ہی کچھ نہ کیا تو ہیگ اور ہشمان ذکری یہ بازی بھی جیت جائیں گے۔ حالانکہ وہ عورت جہاز کے حکام کو پروفیسر کی تختی کے بارے میں نہیں بتانا چاہتی تھی۔ مگر اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ اب جہاز اسکندریہ کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے اور چند ہی لمحوں کے بعد وہ بندرگاہ میں داخل ہو جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ وہ بندرگاہ میں آہستہ آہستہ داخل ہو رہا تھا۔ ابھی تک مسافروں کو اترنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن گھنٹے بعد مسافروں کو اترنے کی اجازت مل جائے گی۔ یہ شخص جس کا نام ہشمان ذکری ہے، اسکندریہ کا ہی رہنے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہیگ کا کوئی دوست اسی کی طرح با اختیار اور دولت مند آدمی ہوگا۔ جہاز کے گودی پر لگنے اور مسافروں کے اترنے سے پہلے ہی وہ ہیگ کا سارا سامان اپنی لانچ میں منتقل کرنے آیا ہے۔ اسے اگر اس وقت نہ روکا گیا تو مصر کی سرزمین پر اس جیسے بااثر

آدمی پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ ہوگا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں صرف اپنی عقل کے مطابق کام کروں۔ چنانچہ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر چیف افسر کو ڈھونڈ نکالا۔ یہ شخص ایک شریف صورت آدمی تھا۔ میں نے جلدی جلدی اسے ہیگ اور ہشمان ذکری کی کارروائیوں کے بارے میں آگاہ کیا اور وہ حیران رہ گیا۔

"آپ کے خیال میں جہاز پر ہونے والے قتل میں اس شخص کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا نہیں، سو فیصدی ہے۔ اور میں اس سلسلے میں مکمل ذمے داری قبول کرتا ہوں۔"

"سر! کیپٹن صاحب کا حکم ہے کہ کوئی بھی مسافر سامان کی تلاشی دیئے بغیر جہاز سے نہیں اتر سکتا۔ کم از کم مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی بااثر کیوں نہ ہو، جہاز کے گودی پر لگنے سے پہلے اور تلاشی دیئے بغیر کوئی سامان جہاز سے نیچے نہیں اتار سکتا۔"

"کیا تمہیں اس بات کا یقین ہے؟"

"سو فیصدی۔" اس نے جواب دیا اور ٹہلتا ہوا ہیگ کے سامان کی جانب چل پڑا۔ ہیگ کا سارا سامان اس راہداری سے ہٹایا جا چکا تھا۔ یہاں سے چیف افسر ڈیک پر پہنچا۔ میں مسلسل چیف افسر کا تعاقب کرتا رہا تھا۔ تب میں نے دیکھا کہ مصری کسٹمز کی ایک لانچ جہاز کے ساحل کے ساتھ لگی ہوئی ہے اور خلاصیوں نے چھوٹا گین وے ڈال کر دونوں کو ملا دیا ہے۔ گویا ہیگ کا سامان اب لانچ پر لادے جانے کے لئے تیار تھا۔ ادھر میں نے دیکھا کہ ہیگ اور ہشمان ذکری سامان کے پاس کھڑے ہوئے ہیں۔

دفعتہً ہی چیف افسر نے ان کے قریب پہنچ کر کچھ کہا اور ساتھ ہی سامان کی جانب اشارہ کیا۔ اسی وقت ہشمان بے نے مصنوعی حیرت سے چیف افسر کو دیکھا پھر انگلی کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔ اس کی ایک آنکھ پر چشمہ لگا ہوا تھا۔ اس نے آنکھ سے چشمہ اتار کر اپنی ریشمی ٹائی سے صاف کیا اور دوبارہ چشمہ لگا کر چیف افسر کو اس طرح دیکھا جیسے کسی عجیب وغریب چیز کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ پھر اس کی گونج دار آواز ابھری۔

"ہوں...... تو تم چیف افسر ہو۔ غالباً اس جہاز پر نئے آدمی معلوم ہوتے ہو اسی لئے مجھے نہیں جانتے۔"

"میں کسی کو نہیں جانتا جناب! کیپٹن کا حکم ہے کہ کسی مسافر کو سامان کی تلاشی لئے بغیر نہ اتارا جائے۔ اور پھر ابھی جہاز گودی پر نہیں لگا ہے۔ ویسے بھی کوئی مسافر امیگریشن کی

اجازت کے بغیر جہاز نہیں چھوڑ سکتا۔"

ہشمان بے کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے ہیگ کو دیکھا۔ ہیگ اس کا اشارہ سمجھ کر آگے بڑھا اور اس نے چابیوں کا گچھا نکال کر چیف افسر کی طرف بڑھا دیا۔ پھر بولا۔

"یہ رہی چابیاں اور یہ ہے میرا سامان۔ آپ جلدی چیک کر لیں۔ چلئے، اپنا کام کیجئے۔"

چیف افسر ایک لمحے کے لئے گڑبڑا گیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر چابی لینے کی کوشش نہیں کی اور الجھی ہوئی نگاہوں سے ہشمان ذکری کو دیکھنے لگا۔ ہشمان ذکری نے ہاتھ آگے بڑھا کر ہیگ کے ہاتھوں سے چابیاں لے لیں اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ میں اسکندریہ کے میئر کی حیثیت سے اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ اس سامان میں کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے۔ بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے؟" اس نے کھینچ کر اس کے شانے پر اپنی چھوٹی انگلی مارتے ہوئے کہا اور اس کے بعد چابیاں اپنی جیب میں رکھ لیں۔ پھر وہ عرب قلیوں کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"سامان لانچ میں پہنچا دو۔" اور اس کے بعد اس کی نگاہیں بندرگاہ کا جائزہ لینے لگیں۔ وہ چیف افسر اور جہاز کی دوسری سکیورٹی کے عملے سے بالکل بے تعلق ہو گیا تھا۔ چیف افسر نے جیب سے رومال نکال کر پسینہ خشک کیا۔ اس کے ہونٹوں سے بڑبڑاہٹ سی نکلی۔

"میئر...... اسکندریہ کا میئر۔"

ہشمان ذکری، ہیگ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا اور ٹہلنے والے انداز میں چھوٹے گین وے کی طرف چل پڑا۔ میں نے گہری نگاہوں سے چیف افسر کا جائزہ لیا۔ وہ بے چارہ سہم سا گیا تھا۔ میں نے دانت پیسے۔ ہر جگہ یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں سیدھا کیپٹن کے پاس جا کر اسے تمام صورتحال سے آگاہ کر دوں اور ان بدمعاش اسمگلروں کو روکنے کی کوشش کروں۔

چیف آفیسر معمولی سے انداز میں اِدھر سے اُدھر دیکھنے لگا۔ دوسری طرف ہشمان ذکری کے عرب قلیوں نے ہیگ کا سامان لانچ پر بار کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں بے چینی سے کیپٹن کو تلاش کرنے لگا اور پھر تیزی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ مجھے نظر آ گیا تھا۔ میں نے

اس سے کہا۔

"آپ کو معلوم ہے اِدھر کیا ہو رہا ہے مسٹر کیپٹن؟"

کیپٹن نے اس انداز میں مجھے دیکھا جیسے اسے میری یہ مداخلت ناگوار گزری ہو۔ لیکن بہرحال وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میرا تعلق برٹش بحریہ سے ہے۔ اس نے کہا۔

"کیا بات ہے جناب؟"

"اِدھر دیکھئے۔ وہ سامان اس لانچ پر کیسے بار کیا جا رہا ہے؟"

"وہ سامان اسکندریہ کے میئر ہشمان ذکری کا ہے۔"

"تو کیا اسکندریہ کے میئر پر جہاز کا قانون لاگو نہیں ہوتا؟"

"وہ دراصل وہ......"

"سنیے مسٹر کیپٹن! مقتول پروفیسر کی فولادی تختی مسٹر ہیگ کے سامان میں موجود ہے اور اس وقت وہ مصری کسٹم کی لانچ پر پہنچائی جا رہی ہے۔"

"کیا آپ ٹھیک کہتے ہیں؟" اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ میں نے ایک لمحے میں محسوس کر لیا تھا کہ وہ کچھ کرنے سے جی چرا رہا ہے۔ پھر بھی میرے کہنے پر وہ تیزی سے مین ڈیک پر پہنچا۔ اتنی دیر میں ہیگ کا سارا سامان لانچ میں پہنچا دیا گیا تھا اور چھوٹا گین وے ہٹایا جا رہا تھا۔ میں نے لانچ پر نگاہ ڈالی۔ ہیگ لانچ میں نظر نہیں آیا۔ وہ شاید انجن روم میں چلا گیا تھا۔ دوسری جانب ہشمان ذکری پُر اطمینان انداز میں کمر پر دونوں ہاتھ رکھے لانچ کے اندر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اوپر جھانکتے ہوئے کیپٹن کو دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ کیپٹن کے چہرے پر بے چارگی نظر آ رہی تھی۔ میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"آپ نے کچھ کیا نہیں کیپٹن۔ وہ لوگ اس تختی کو لے جا رہے ہیں۔ اور یقیناً احتشام بے کا قاتل بھی ان میں شامل ہے۔"

لانچ اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی تھی۔ کیپٹن کچھ سٹپٹایا ہوا تھا۔ اس نے جاتی ہوئی لانچ کو دیکھا پھر اپنے اردگرد ماتحتوں پر نگاہیں ڈالیں اور اس کے بعد تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آواز ابھری۔

"سنیے مسٹر! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کسٹم کی یہ لانچ میری اجازت سے جہاز سے لگی ہے اور اسکندریہ کے میئر مجھ سے اجازت لے کر اپنے ایک معزز مہمان کو اتارنے آئے تھے۔ آپ پتہ نہیں کس شبہے کا شکار ہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہوئی ہے جس پر آپ اعتراض

کریں۔"

میں نے دانت پیستے ہوئے کیپٹن کو دیکھا۔ میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ پتہ نہیں ہشمان ذکری کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے۔ ویسے یہ بات سوچنے کی تھی کہ کیا ہشمان اتنا طاقتور آدمی ہے کہ اس اہم جہاز راں کمپنی کا کیپٹن اس کے مقابلے میں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا؟ شدید غصے کے عالم میں، میں نے غصے سے کہا۔

"حالانکہ آپ جانتے ہیں کیپٹن! کہ آپ نے جان بوجھ کر پروفیسر احتشام بے کا قاتل چھوڑ دیا ہے۔"

"سر! بے شک آپ کا تعلق ایک اہم بحری محکمے سے ہے۔ لیکن کم از کم اس جہاز پر آپ صرف ایک مسافر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ اس سے زیادہ مجھے آپ کے سلسلے میں کوئی ہدایات نہیں کی گئی ہیں۔ میں کیا جانتا ہوں اور کیا نہیں جانتا یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ اور سنیے، آپ کتنے اعتماد سے یہ بات کہہ رہے ہیں کہ اس لانچ سے پروفیسر احتشام بے کا قاتل فرار ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ قاتل کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ چنانچہ آپ میری اجازت کے بغیر جہاز چھوڑنے کی کوشش نہ کریں۔ پروفیسر کے کیس میں مجھے ابھی آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

کیپٹن نے یہ الفاظ کہے اور گھوم کر ایک طرف ہو گیا۔ میرے ہوش و حواس رخصت ہوئے جا رہے تھے۔ ایسی بے بسی اور ایسی شکست زندگی میں بہت کم ہی نصیب ہوئی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ جائز نہیں ہے۔ کیپٹن وہاں سے چلا گیا تھا۔ پروفیسر کا قاتل آزاد تھا۔ اور میں جو قانون کی مدد کرنا چاہتا تھا، اس بیوقوف شخص یعنی جہاز کے کپتان کی بزدلی یا سازش کی وجہ سے الٹا پھانس دیا گیا تھا۔

میری نگاہیں چیف آفیسر پر پڑیں جس کی ہمدرد آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا جیسے وہ مجھے قابلِ رحم سمجھتا ہو۔ بہرحال اس کے بعد وہ بھی گھوم کر واپس چلا گیا۔ میں تنہا کھڑا رہ گیا تھا اور اس وقت میرے سارے وجود میں گڑگڑاہٹ ہو رہی تھی۔ کیسی تکلیف دہ بات تھی۔ میں نے جب بھلائی کرنی چاہی تو چاروں طرف سے مصیبتوں اور مصائب نے مجھے آن گھیرا اور اب تو مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے ہاتھوں پیروں میں رسیاں باندھ دی گئی ہوں۔ آہ...... یہ سچائی کے پہلے راستے پر میرے لئے بدترین شکست تھی۔ جتنی شدید جدوجہد میں نے کی تھی وہ میرے لئے عذاب بن گئی تھی اور اب میں خود پھنس گیا تھا۔

کپتان کے الفاظ ہلکے پھلکے نہیں تھے۔ میری ذات میں تو کچھ ایسے معاملات تھے جس میں، میں بری طرح پھنس سکتا تھا۔ اور اب یہ خیال دل میں بار بار جنم لے رہا تھا کہ میں شیطانی راستے پر ہی پھل پھول سکتا ہوں۔ میں نے برائی کے راستے پر چلتے ہوئے بہت سی مشکلیں آسان ہوتے دیکھی تھیں۔ اور اب جبکہ میں نے ایک سفاک قاتل کو گھیرا اور اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہا تو ہر چال الٹ رہی ہے۔

میں اپنے پاؤں بے جان محسوس کرنے لگا اور اس احساس کی شدت نے مجھے دلی طور پر بہت ہی افسردہ کر دیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور خالی ڈیک کی ایک چیئر پر سر جھکا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ ہے دھیان کا وہ راستہ جس پر میں نے اب اپنی یاترا شروع کی ہے۔ میں وہ روایتی باتیں نہیں کروں گا کہ نیکیوں کے راستے دُشوار گزار ہوتے ہیں اور ان میں کانٹے ہی کانٹے ہوتے ہیں۔ نیکیوں کے سفر پر حوصلہ شکن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا اور نیک بندوں کو امتحانات دینے پڑتے ہیں۔ راہِ حق پر سفر کرنا ایک مشکل کام ہے۔ لیکن کیا میں راہِ حق پر سفر کرتے ہوئے ان تمام مصائب کا سامنا کر سکتا ہوں جو میرے راستے میں آئیں گے؟ ممکن نہیں ہے۔ میں تو ایک عام سا دنیا دار آدمی ہوں، اچھا کام کرنا چاہتا ہوں اور عام آدمیوں کی طرح یہ چاہتا ہوں کہ اگر میرے لئے آسانیاں نہ بھی پیدا ہوں تو کم از کم مجھے نت نئی ناکامیوں کا سامنا تو نہ کرنا پڑے۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا اور آہستہ آہستہ میرے ذہن میں ایک چہرہ ابھرنے لگا۔ بالکل اس طرح جیسے سورج اُفق کی پہاڑیوں کے پیچھے سے سر نکالتا ہے۔ وردان سادھانی کا چہرہ اُبھر رہا تھا۔ مجھے وہ لمحات یاد آئے جب میں نے اس جہاز کے لاؤنج سے نامعلوم سمتوں کا سفر کیا تھا اور وردان سادھانی کے روبرو پہنچا تھا۔ وردان سادھانی کے چہرے پر رنج و ملال کی جو کیفیت تھی وہ میری نگاہوں سے ابھی تک دور نہیں ہوئی تھی۔ عجیب بات ہے، وہ کیسا وجود ہے۔ عالمِ عدم میں ہے یا عالمِ وجود میں؟ کیا کہہ سکتا ہوں میں۔ وہ پراسرار قوتوں کا مالک، بدھ مت کا پیروکار جس کے بارے میں یہ بات میرے علم میں لائی گئی ہے کہ وہ بدھ مت کا ایک اور فرقہ ہے جو اپنے طور پر اپنی برتری کا پرچار کرنا چاہتا ہے۔ وردان سادھانی کیا چاہتا ہے؟ اس کا صحیح طور سے اندازہ مجھے اب بھی نہیں ہو سکا تھا۔ وہ مجھے نیکیوں کے راستے پر بھی گزارنا چاہتا تھا اور برائیوں کے راستے پر بھی وہ میرا ہمسفر ہے اور دونوں حالتیں اسے قبول ہیں۔ پتہ نہیں وہ میری تباہی کے درپے ہے یا مجھے اس

نئے فرقے کا روحانی پیشوا بنانا چاہتا ہے؟ اس نے میرا انتخاب کس لئے کیا تھا یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھے انوکھی روحانی قوتوں سے نوازنا چاہتا ہے۔ اگر ایسی بات ہے وردان سادھانی، تو اب ان حالات میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے تیری ضرورت ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اب میں جس صورتحال سے دوچار ہوں اس میں تو میری مدد کر سکے؟

''کیوں نہیں...... یہ بالکل ممکن ہے۔'' ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے یہ آواز کھلے سمندر کے رُخ سے آتی ہوئی محسوس کی تھی۔ میں ہڑبڑا کر ڈیک چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا اور میری گردن چاروں طرف گھومنے لگی۔ میرے عقب میں کوئی نہیں تھا۔ ابھی میں سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ بھکشو کی آواز پھر سنائی دی۔

''اچھائی تو اچھائی ہوتی ہے بودھی ستو! اور کون کہتا ہے کہ ہم نے تمہیں اکیلا چھوڑ دیا۔ تم نے بہت سوچ بچار کے بعد جیسا اچھا کام چنا ہے اس میں ہم اور تمہارے پرکھوں کی آتمائیں تمہارا ساتھ دیں گی، سمجھے؟ اچھائی تو اچھائی ہی ہوتی ہے۔''

یہ آواز کچھ ایسی تھی جیسے کوئی ریڈیو پر بول رہا ہو۔ میں نے ہوش و حواس کے عالم میں یہ آواز سنی تھی اور مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ گویا مجھے میرے سوال کا جواب دیا گیا تھا۔ ایک عجیب سا احساس دل میں پیدا ہو گیا۔ مشکل آتی ہے تو ان پراسرار قوتوں کے علاوہ کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ میں نے ایک لمحے کے اندر یہ فیصلہ کر لیا کہ اس انداز کی آواز کو جو وردان سادھانی نے سنائی ہے سنتا رہوں گا اور اس پر عمل بھی کروں گا۔

بہرحال یہ میرے مقاصد سے نہیں ٹکراتی تھی۔ یہ پہلی اچھی آواز ہے جو وائسرائے چیمبر کے قیامت خیز ہنگامے کے بعد میں نے سنی ہے۔ اور اس کے بعد میرے اندر ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے دنیا بہت چھوٹی ہو گئی ہو اور میں اسے ایک چھوٹے سے گلوب کی شکل میں دیکھ رہا ہوں۔ وہ میرے اشاروں پر ناچ رہی ہو۔ میں نے حقارت سے جہاز کے برج کی طرف دیکھا۔ یہ کیپٹن اگر ہیگ اور ہشمان ذکری سے خائف ہے یا بکا ہوا ہے تو اب یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں تو خود اب اتنی توانائی رکھتا ہوں کہ آسانی سے اسے زمین پر لٹا سکوں۔ میں جس مقصد سے مصر تک آیا ہوں وہ بھی یہی ہے کہ اپنی رُسوائی اور تباہی کا بدلہ لوں اور اپنا حساب بھی چکاؤں اور پروفیسر احتشام کا انتقام بھی لوں گا۔ ان حالات میں بھی اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب میں اس قدر بے بس نہیں ہوں جتنا

اب سے چند لمحے پہلے تھا۔ یہ آواز یہ آواز مجھے بلاسبب سنائی نہیں دی ہے۔ اب جو کچھ بھی ہو گا میرے حق میں ہو گا۔

''ہاں...... اب جو کچھ بھی ہو گا تمہارے حق میں ہی ہو گا۔ بے فکر رہو۔''

مجھے یوں لگا کہ جیسے کوئی میرے برابر کھڑا ہوا ہو اور میری ہر سوچ اس کے علم میں ہو۔ وہ مجھے احساس دلا رہا ہو کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ مجھے گا شر بھرم کی پہاڑیوں کے دھار کا وہ تجربہ یاد آیا جب میں وردان سادھانی کے ابدی چشمے پر کھڑا اپنے آپ میں نئی قوتوں کو سمو رہا تھا۔ میں نے آبشار کی گونج بھی سنی اور دل ہی دل میں دوہرایا۔

''نموست...... نمو بدھا۔''

میرے بدن پر لرزہ سا طاری تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے سارے وجود میں سرور و کیف کی کیفیت ابھر رہی ہو۔ ہاں، میں اب بالکل ہی الگ کیفیت میں تھا۔ آہستہ آہستہ میری حالت بہتر ہوتی چلی گئی۔ میں کچھ دیر تک اسی طرح کھڑا رہا اور پھر میری نگاہیں جہاز پر ہونے والی کارروائیوں کا جائزہ لینے لگیں۔

امیگریشن پولیس کی لانچیں اور اسکندریہ کے بڑے بڑے ہوٹلوں کے گائیڈ موٹر بوٹوں میں جہاز کی طرف بڑھ رہے تھے۔ برابر سے ایک سیاہ فام نکل کر آیا اور ہمارے جہاز کے برابر کھڑا ہو گیا۔ ایک ٹگ ہمارے جہاز کو دھکیل کر گودی پر لگانے لگا تھا۔ ہمارے جہاز کے گرد ہوٹلوں کے موٹر بوٹ اس طرح گردش کر رہے تھے جیسے مٹھائی پر مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔ شوخ رنگوں میں پینٹ کئے ہوئے ان موٹر بوٹوں پر رنگ برنگے جھنڈے لہرا رہے تھے اور ان پر ہوٹلوں کے ناموں کے بڑے بڑے بینر لگے ہوئے تھے۔

میں مایوسی اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں ریلنگ پر کھڑا بندرگاہِ اسکندریہ کی یہ ہنگامہ آرائی دیکھتا رہا۔ مجھے اب بھی احساس تھا کہ کیپٹن کی بزدلی سے ہاتھ آیا ہوا شکار نکل گیا ہے۔ ہیگ ایک بار پھر مجھ پر کاری ضرب لگا گیا تھا۔ وہ ہاتھ سے نکل گیا تھا اور اب اسکندریہ کے بھرے پُرے شہر میں اس کی تلاش میں مجھے بھٹکنا پڑے گا۔ خیر کچھ وقت اور سہی۔ ہیگ کی لانچ دور کرنوں کے جنگل میں گم ہونے والی تھی۔ میں نے حسرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور خالی خالی آنکھوں سے جہاز کے گرد گھومنے والی موٹر بوٹوں کو دیکھنے لگا۔ اچانک ہی مجھے ایک آواز اپنے کانوں میں سنائی دی۔ کوئی مجھے پکار رہا تھا۔

''خاقان صاحب! خاقان صاحب!'' انجنوں کے شور میں پکارنے والے کی آواز مجھے

صاف سنائی دے رہی تھی۔ اور یہ میرا وہم نہیں تھا۔ میں نے ہڑبڑا کر ادھر دیکھا، ایک شخص سفید سوٹ میں ملبوس قریب ہی کی ایک موٹر بوٹ پر کھڑا مجھے متوجہ کر رہا تھا۔ اس کی آواز پھر سنائی دی۔ ”خاقان صاحب! میں ہوں، آپ کا دوست۔ مجھے پہچانئے۔ میں ہوں آپ کا دوست، رحمان یزدانی۔“

میں نے اپنے ذہن پر زور دینے کی کوشش کی اور میرے منہ سے مدھم سی آواز نکلی۔

”رحمان یزدانی...... میں تو اسکندریہ میں رہنے والے کسی رحمان یزدانی کو نہیں جانتا۔“

مجھے یوں لگا جیسے یہ چہرہ میرا دیکھا ہوا ہو۔ یزدانی...... یزدانی...... میں سوچنے لگا۔ موٹر بوٹ پر کھڑے ہوئے اس شخص نے مجھے پھر مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں رحمان یزدانی ہوں، سلطان میاں کا ساتھی۔ اب بھی نہیں یاد آیا آپ کو؟ ارے میرا اور آپ کا تو بچپن سے ساتھ رہا ہے۔“

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا اور مجھے ماضی کے بہت سے واقعات یاد آ گئے۔ بابا جان اور سلطان میاں کے ساتھ میں کتنی ہی بار شکار کو گیا تھا۔ اس وقت سلطان میاں کے ساتھ رحمان یزدانی ہوا کرتا تھا وہ ان کا شکاری دوست تھا۔ میں ایک دم چیخا۔

”میں نے تمہیں پہچان لیا ہے یزدانی! ارے باپ رے باپ، تم پر تو جیسے عمر ٹھہر گئی ہے۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تم میں۔ کیسے آئے ہو؟“

”بس آپ کو لینے آیا ہوں۔ آپ بوٹ پر آ جائیے۔ میں بوٹ کو قریب لگواتا ہوں۔“

رحمان یزدانی نے اس طرح کہا جیسے یہ سب آسان سی بات ہو اور جہاز سے فرار ہونا کوئی مشکل عمل نہ ہو۔ میں نے اس کے الفاظ حیرت سے سنے اور اس کے بعد چاروں طرف حیرت سے دیکھا تو رحمان یزدانی بولا۔

”سوچئے مت۔ آئیے، لانچ پر کود جائیے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں وہی کروں جو یزدانی کہہ رہا ہے۔ ویسے ایک لمحے کے لئے میرے بدن میں تھرتھراہٹ سی دوڑ گئی تھی۔ یہ سلطان میاں بھی معمولی آدمی نہیں معلوم ہوتے۔ ان کے ہاتھ کتنی دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ میں نے جہاز سے کودنے کا فیصلہ کر لیا۔ موٹر بوٹ قریب آ کر تقریباً جہاز سے لگ گئی۔ میں ریلنگ کو تھام کر باہر کی طرف جھول گیا اور سر جھکا کر نیچے دیکھا، موٹر بوٹ مجھ سے دس بارہ فٹ نیچے ڈول رہی تھی۔ میں نے کودنے کی کوشش ہی کی تھی کہ میں نے دیکھا چیف آفیسر اور

امیگریشن کا ایک سارجنٹ میری طرف دوڑتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔

”ارے مسٹر، ٹھہرو ٹھہرو...... کہاں جا رہے ہو؟“ چیف افسر دھاڑا۔ پولیس سارجنٹ بھی میری جانب دوڑ رہا تھا۔ میں نے تیزی سے سر گھما کر نیچے موٹر بوٹ کو دیکھا، یزدانی ہاتھ ہلا کر مجھے کودنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

اچانک ہی سارجنٹ نے اپنا ریوالور نکال لیا اور بولا۔ ”رُک جاؤ لیفٹیننٹ! نہیں تو......“ اس نے دھمکانے کے لئے میرا نشانہ لیا اور میں نے چھلانگ لگانے کا ارادہ کیا تو مجھے یوں لگا جیسے جہاز نے میرے پاؤں پکڑ لئے ہوں۔ میرا جوتا ریلنگ کے پار اور لوہے کے ستون میں پھنس گیا تھا۔ امیگریشن پولیس کا آدمی اور جہاز کا چیف افسر مجھ سے بمشکل تمام پچاس قدم کے فاصلے پر تھا۔ یہ منحوس جوتا اگر نہ نکلا تو میں مارا جاؤں گا۔ نیچے سے یزدانی مجھے پکار رہا تھا اور اوپر سے پولیس والا یعنی وہ سارجنٹ جو چیخ کر کہہ رہا تھا۔

”لیفٹیننٹ، رُک جاؤ...... ورنہ گولی مار دی جائے گی۔ رُک جاؤ۔“

وہ دونوں اب مجھ سے بیس پچیس فٹ کے فاصلے پر تھے کہ میں نے پوری طاقت لگا کر جھٹکا دیا۔ میرا پیر ریلنگ کے ستون اور تاروں کے رسے سے آزاد ہو گیا تھا اور دوسرے لمحے میں نے پیچھے کی طرف جھولا دے کر ہاتھ چھوڑ دیئے۔ سارجنٹ اپنا ریوالور لہراتا رہ گیا۔ میں بڑے بے ڈھنگے انداز میں بوٹ پر گرا تھا۔ یزدانی نے بھی چیخ کر موٹر بوٹ کے ڈرائیور سے کہا اور موٹر بوٹ گولی کی طرح اچھل کر کھلے سمندر کی طرف روانہ ہو گئی۔ جہاز کے عرشے پر امیگریشن اور جہاز کے عملے کے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ بیس منٹ تک ہم لانچوں اور ماہی گیر کشتیوں کے ہجوم میں راستہ تلاش کرتے رہے، پھر ایک قدیم محراب والا پل نظر آیا۔ دور سے میں اسے بھی لوہے کا پل سمجھا تھا مگر اس پر تو برسوں سے کائی جمی تھی اور سمندری کیڑے اپنا گھر بناتے رہے تھے۔ اس پل کے نیچے سے گزر کر ہم ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سمندر کا پانی پتلی نہر کی شکل میں اندر گنجان بستی میں چلا گیا تھا۔ کچھ دور اس سمندری نہر میں چلتے رہنے کے بعد موٹر بوٹ ایک اور پتلی سی نہر کی جانب مڑ گئی۔ یزدانی کی موٹر بوٹ کا ڈرائیور ان راستوں سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتا تھا۔

کوئی دس منٹ تک ان بھول بھلیوں میں چلنے کے بعد موٹر بوٹ ایک مضبوط سلاخوں والے ایک بہت بڑے پھاٹک کے سامنے رک گئی۔ زنگ اور سمندری کائی سے پھاٹک کی سلاخیں اس حد تک خراب ہو گئی تھیں کہ اچھا خاصا لوہے کا دروازہ پتھر یا لکڑی کا دروازہ

معلوم ہوتا تھا۔ آخر کار ڈرائیور نے انجن بند کر دیا اور موٹر بوٹ کے چھوٹے سے تختے پر کھڑے ہو کر دو انگلیاں منہ میں دے کر زور سے سیٹی بجائی۔ اس لق و دق سنگیں عمارت میں کہیں دور ایسی ہی سیٹی جوابی طور پر سنائی دی اور پھر اوپر کی ایک خستہ حال کھڑکی سے کسی سیاہ فام نے جھانک کر نیچے دیکھا اور کچھ کہا۔ اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ لیکن پھر دو تین منٹ تک ہمیں انتظار کرنا پڑا، پھر گڑگڑاہٹ کے ساتھ یہ وزنی پھاٹک آہستہ آہستہ اوپر اٹھنا شروع ہو گیا۔ اوپر کسی طرح کی قلیلیں لگائی گئی تھیں جن کی مدد سے یہ منوں وزنی پھاٹک اٹھایا جا رہا تھا۔ پھر اندر سے کمر کمر پانی میں چلتا ہوا وہی سیاہ فام آگے آیا اور اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا بانس دبا ہوا تھا جس کے سرے پر لوہے کا ایک ہُک لگا ہوا تھا۔ اس نے موٹر بوٹ کے کسی تختے پر یہ ہُک پھنسایا اور بار برداری کے بیل کی طرح آگے جھک کر اس نے بوٹ کو کھینچنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں موٹر بوٹ اس عمارت کے نیم تاریک ماحول میں پہنچ گئی۔ پھر سیاہ فام نے ایک سوئچ آن کیا اور چھوٹے سے بلب کی زرد روشنی سے اس آبی گیراج کی فضا اور زیادہ اُداس ہو گئی۔ اس نے دوبارہ پھاٹک گرا دیا اور پھر یزدانی نے مجھ سے کہا۔

''آؤ۔''

ہم لوگ موٹر بوٹ سے نیچے اترنے لگے۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ سیاہ فام اندر سے ایک بہت بڑی ترپال گھسیٹتا ہوا آیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ ترپال اب یقیناً موٹر بوٹ پر ڈال دی جائے گی اور اس طرح قصہ ختم ہو جائے گا۔ میں بڑی محویت سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا کہ یزدانی میرے اس تعجب کو دیکھ کر ہنسا اور بولا۔

''خاقان صاحب! اب یہ بوٹ امیگریشن کے باپ کو بھی نہیں ملے گی۔ ہفتے دو ہفتے کے بعد یہ نئے رنگ و روغن کے بعد نیا نمبر لے کر یہاں سے باہر جائے گی اور اپنا کام شروع کر دے گی۔''

''لیکن یزدانی! جہاز کے قریب تو یقیناً تمہارے بہت سے جاننے والے بھی ہوں گے اور انہوں نے تمہیں فرار ہوتے ہوئے بھی دیکھ لیا ہو گا۔''

''سو فیصدی۔ میرے بہت سے شناسا قرب و جوار میں موجود تھے اور میری کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔''

''تو پھر......؟''

''وہ سب جانتے ہیں کہ یہ بوٹ رحمان یزدانی کی ہے۔''

''تو کیا وہ امیگریشن والوں کو نہیں بتا دیں گے؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ اسکندریہ کی بندرگاہ ہے جناب خاقان صاحب! کیا سمجھ رہے ہیں آپ۔ یہاں رحمان یزدانی کسی گمنام ملازم کا نام نہیں ہے۔ میرے پیشے کے لوگ بہت نیک اور ایماندار ہوتے ہیں۔ وہ کبھی کسی کو ایسی کوئی بات نہیں بتاتے۔ ہم لوگ ایک دوسرے کی مخبری نہیں کرتے۔ اگر امیگریشن والوں نے بھی مجھے پہچان لیا ہے تو بھی کوئی فکر کی بات نہیں۔ وہ ہمارا اور ہم ان کا خیال کرتے ہیں۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔''

میں نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی۔ رحمان یزدانی کی عمر بہت زیادہ تھی یعنی اس وقت وہ سلطان میاں کے ساتھ ان کا دست راست ہوا کرتا تھا جب میری عمر کچھ بھی نہیں تھی اور میرے والد زندہ تھے۔ لیکن آج بھی وہ اتنا ہی چست و چالاک اور تندرست نظر آتا تھا۔ بہرحال اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بولا۔

''آئیے۔''

یہ کہہ کر وہ مجھے ایک تنگ و تاریک راستے سے لے چلا۔ سرزمین مصر پر میرا یہ سفر ختم ہوا تھا لیکن اس کے بعد نجانے کیسے کیسے ہنگامے میرے منتظر تھے۔ زینے طے کرتے ہوئے مچھلی کی بدبو، سیلن، تاریکی اور کیڑے مکوڑوں کی مسلسل آوازیں ہمارا استقبال کرنے لگیں۔ ہم ان آوازوں سے گزرتے ہوئے عمارت کی دوسری منزل پر پہنچے اور پھر ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ انتہائی وسیع و عریض کمرہ تھا۔ لیکن عجیب و غریب حیثیت کا حامل۔ دیواروں کا پلستر، رنگ و روغن کب کا اکھڑ گیا تھا۔ ننگے فرش پر جابجا دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ تنگ و تاریک سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے گھٹن کا سا احساس ہوتا تھا۔ لیکن کمرے میں سمندر کے رخ پر دو کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں جس سے یہ گھٹن ختم ہو گئی تھی۔

بہرحال ہمیں اس کمرے میں نہیں رُکنا پڑا۔ چونکہ کمرے کے اندرونی حصے میں ہی ایک اور زینہ بنا ہوا تھا جو اوپر کی سمت جاتا تھا چنانچہ ہم کچھ لمحوں کے بعد اس عمارت کی تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ اس بار جس کمرے میں ہم داخل ہوئے تھے اس میں کھڑکیوں کے نیچے دو چوکیاں سی بنی ہوئی تھیں جن پر بجھے بجھے سے رنگوں میں روایتی مصری ڈیزائن والی چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ فرش پر جابجا ریشمی غالیچے اور مخمل کے تکیے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ لکڑی کے نقشین کام کی کرسیاں اور اسی طرح کی تپائیاں رکھی ہوئی

تھیں۔ تپائیوں پر پیتل کے بہت ہی خوبصورت برتن سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ لمبی گردن والی صراحیاں اور پیالے دیکھ کر مجھے کشمیری آرٹ کے وہ ایمپوریم یاد آ گئے جہاں سے ملازمت کی مدت پوری کر کے وطن لوٹنے والے انگریز دو چار سو روپے کا سامان خرید کر جہاز میں سوار ہو جاتے تھے اور گھر پہنچتے تو اپنے دوستوں کو اکٹھا کر کے بیٹھتے اور ڈینگیں مارتے کہ یہ پیالہ مہاراجہ کپورتھلا نے اپنی سالگرہ پر مجھے تحفے میں دیا تھا۔ اس پیالے میں احمد شاہ ابدالی شربت پیا کرتا تھا۔ یا یہ کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بیٹے کی صراحی ہے۔ اور یہ اکبر بادشاہ کا وہ مشہور حقہ ہے جو اکثر مغل پینٹنگز میں نظر آتا ہے۔ یہ یقینی طور پر ایسے ہی عمل کے محرک ہوتے ہیں۔ بہرحال میں اپنے طور پر سوچتا رہا کہ یہ مصر ہے اور میں اسکندریہ کے فش ہاربر میں ایک باحیثیت مکان کے آرام دہ کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں۔

ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ وہی سیاہ فام شخص کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں دو چھوٹے چھوٹے بنڈل تھے۔ اس نے ایک بنڈل مجھے اور دوسرا رحمان یزدانی کو تھما دیا۔ رحمان یزدانی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"آیئے خاقان صاحب! غسل کا پانی تیار ہے۔ آپ غسل کر لیجئے اور اس کے بعد کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ غسل خانے بھی مکان کی طرح قدیم اور ٹھاٹھ دار تھے۔ میں نے غسل خانے میں بند ہو کر اپنے کپڑے اور منی بیلٹ اتاری اور کھونٹیوں پر لٹکا دی۔ گرم پانی اور خوشبو دار فرانسیسی صابن سے نہاتے ہوئے میں اپنی موجودہ حالت کے بارے میں سوچتا رہا۔ عارضی طور پر ہیگ اور اس کا ساتھی ہشمان میرے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ پروفیسر احتشام کی فولادی تختی ان سفاک مجرموں کے قبضے میں جا چکی تھی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں بھی بے بس ہو گیا تھا۔ اگر سلطان چچا اپنا کمال نہ دکھاتے اور رحمان یزدانی بروقت موٹر بوٹ لے کر نہ پہنچ گیا ہوتا تو پتہ نہیں مجھ پر کیا بیت رہی ہوتی۔ اگر جہاز کا کپتان مجھے نقصان پہنچانے پر تل ہی جاتا تو پھر میں اس وقت امیگریشن پولیس کی حراست میں ہوتا۔ مگر تقدیر نے مجھے بچا لیا تھا اور اس وقت میں اس قلعہ نما مکان میں بیٹھا غسل میں مصروف تھا۔

بہرحال غسل سے فارغ ہوا اور یزدانی مجھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں بہت ہی عمدہ قسم کا لذیذ کھانا میرا منتظر تھا۔ رحمان یزدانی میرے ساتھ ہی تھا اور خوش تھا۔ میں رحمان

یزدانی پر غور کرنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شخص نے عمر کو کھا لیا تھا۔ میں اس وقت بھی اسے اتنا ہی جوان دیکھ رہا تھا جتنا اس وقت جب یہ سلطان چچا کا شکاری تھا اور سیتا گڑھی میں ہمارے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ بہرحال بہت سے واقعات یاد آ رہے تھے۔ یزدانی کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو بہت زبردست طریقے سے فٹ رکھے ہوئے ہے۔ اس کا قد و قامت بہت لمبا تھا۔ جسم بھی اسی مناسبت سے چوڑا چکلا تھا۔ بہرحال اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے یہ پتہ چلا کہ وہ مسلسل سلطان چچا سے منسلک رہا ہے اور اپنے بارے میں بتاتے ہوئے اس نے یہ بھی کہا کہ بمبئی بڑی عجیب جگہ تھی۔ سیدھے سادھے سپاٹ میدان میں ہر طرف آدمی ہی آدمی۔ نہ جنگل نہ پہاڑ۔ مزا نہیں آیا تھا۔ بہرحال اس نے بتایا کہ اسکندریہ میں اس کا دل لگ گیا ہے۔ میں نے اسے وہ واقعات یاد دلائے جو شکار کے دوران پیش آئے تھے تو وہ ہنسنے لگا، پھر بولا۔

"بس خاقان! زندگی اسی کا نام ہے۔ ویسے میں سچ بتاؤں تمہیں، انسان کو جو کچھ مل جاتا ہے وہ اسے سچ مچ تسلیم نہیں کرتا۔ آج یاد کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ سیتا گڑھی میں جو مزے تھے وہ کہیں اور نہیں۔ بس یوں سمجھ لو کہ سیتا گڑھی ہمیشہ یاد آتا ہے۔"

"ہاں یقیناً۔ ویسے میں تمہیں دیکھ کر واقعی خوش ہوا ہوں۔ ایک لمحے کے لئے تو میں تمہیں پہچان بھی نہیں سکا۔ مجھے معاف کرنا، اصولی طور پر تو تمہیں اب ایک بوڑھا آدمی ہونا چاہئے تھا۔ مگر تم نے تو جیسے دوسرا جنم لیا ہے۔"

پھر ہم نجانے کیسی کیسی باتیں کرتے رہے۔ بچپن میں ہمارے ایک اور ساتھی تھے، یہ سلطان چچا کا بھتیجا تھا اور اسے پرنس کہا جاتا تھا۔ پرنس بہت پُرخلوص اور پینترے باز، لڑکیوں کے معاملے میں انتہائی ناقابل اعتبار اور خوش باش بلکہ مست آدمی تھا۔ بہت چھوٹی سی عمر سے لڑکیوں کے چکر میں رہنے لگا تھا اور ابھی تک وہی عیش و عشرت ہو رہی تھی۔

یزدانی نے کہا۔ "مگر کمال کی شخصیت تھی یہ پرنس بھی۔"

"کہاں ہے آج کل؟" میں نے سوال کیا۔

"کیا بتائیں بس کہاں ہے۔"

"کیوں خیریت، کیا ہوا؟"

"بڑی لمبی کہانی ہے۔ پھر کسی وقت سناؤں گا۔ ویسے پرنس قاہرہ میں ہیں اور مزے کر رہے ہیں۔ میرا مطلب مصر میں ہی ہیں۔"

پرانی باتیں بھی کیا چیز ہوتی ہیں۔ جب یزدانی نے مجھ سے اس بارے میں سوال کیا تو میں نے اسے مختصراً بتایا کہ میں بھی اپنے دشمن سے ایک پرانا حساب چکانے آیا ہوں۔

"دشمن...... بدلہ؟" یہ الفاظ سن کر یزدانی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ہاں۔"

"قصہ کیا ہے؟"

"بس میرا ایک دوست پروفیسر احتشام بے قتل ہو گیا تھا۔" پھر میں نے اسے فولادی تختی کی چوری اور اسکندریہ کے میئر ہشمان ذکری کے ساتھ ہیگ کے فرار کی تفصیلات بتا دیں۔ یزدانی خاموشی سے یہ واقعات سنتا رہا۔ ذکری کے نام پر وہ چونکا اور پوچھنے لگا۔

"اسکندریہ کا میئر ذکری، وہ جو خوبصورت سوٹ پہنتا ہے اور فرنچ کٹ داڑھی ہے؟ ایک آنکھ کا چشمہ لگاتا ہے اور موٹا تازہ ہے؟"

"بالکل وہی۔"

"کیا اس نے جہاز کے آدمیوں سے کہا تھا کہ وہ اسکندریہ کا میئر ہے؟"

"ہاں۔"

یزدانی نے ایک زبردست گالی دی اور پھر بولا۔ "وہ میئر ویئر کچھ نہیں ہے، اسمگلر ہے حرامی ایک نمبر کا اور یہاں قاہرہ میں اس کا منشیات کا بہت بڑا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ محلوں میں رہتا ہے۔ ایک محل اس کا اسکندریہ میں ہے اور قاہرہ میں ایک عالی شان ہوٹل ہے۔ ویسے ہے بڑا بااثر اور خبیث آدمی۔ نجانے کتنے افراد کو قتل کر چکا ہے۔ پولیس اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ باقاعدہ پولیس کو بھتہ دیتا ہے وہ۔ خیر، کوئی ایسی بات نہیں۔ اللہ کا فضل ہے، ہمارا بھی یہاں ایک باقاعدہ گروہ ہے۔ ہشمان ذکری جیسوں کو اڑا کر رکھ دیں گے۔"

"یزدانی بھائی! میں ہشمان ذکری پر نہیں بلکہ براہِ راست ہیگ پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہوں اور اس سے پہلے وہ تختی حاصل کرنا چاہتا ہوں جو یہ دونوں جہاز سے چرا کر لائے ہیں۔"

یزدانی کچھ دیر سوچتا رہا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ خود پتہ نہیں کون کون سے دھندوں میں پھنسا ہوا ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے وہ اسکندریہ میں دشمنیاں بڑھا لے۔ اور پھر یہ اصول کی بات تھی کہ ہیگ میرا دشمن تھا، مجھے خود ہی اپنا حساب چکانا چاہئے۔ اور یہ الفاظ میں نے یزدانی سے کہے تو وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا، پھر بولا۔

"بات اصل میں یہ ہے خاقان صاحب! کہ وقت انسان کو کتنا ہی تبدیل کر دے، اگر

اس کے اندر ظرف ہے تو وہ اپنا ماضی نہیں بھول سکتا۔ آپ کا دشمن میرا دشمن ہے۔ آپ بڑے گھر کے آدمی ہیں۔ میں تو آپ کا ملازم تھا لیکن آپ نے مجھے دوست بنایا ہے تو دوستی کا حق بھی ادا کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ ہیگ ہشمان ذکری کے ساتھ ہی ہو گا۔ بہرحال کچھ نہ کچھ کریں گے۔"

"ایک بات اور رحمان یزدانی! میں پروفیسر احتشام کے ساتھ ہی اس انگریز جوڑے مسٹر اینڈ مسز اسمتھ کو تلاش کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اسکندریہ میں ایسے ہوٹل کم ہی ہیں جن میں غیر ملکی ٹھہرتے ہیں۔ ہم انہیں چند ہی گھنٹوں میں تلاش کر لیں گے۔"

"میں یہی چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔"

یزدانی کچھ سوچنے لگا۔ پھر اچانک اس کی نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔ وہ کسی خاص خیال کے تحت مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوال کیا۔ "خاقان! آپ نے داڑھی کتنے عرصے سے رکھی ہوئی ہے؟"

"پہلے میں کلین شیو رہتا تھا۔ بس ذرا تھوڑی سی گڑبڑ کے بعد یہ حلیہ اختیار کیا تھا۔"

"جہاز پر ہیگ نے آپ کو پہچانا تو نہیں تھا؟"

"جہاز میں، میں شاہی بحریہ کے لیفٹیننٹ کی وردی میں تھا اور داڑھی نے میرا حلیہ مکمل کر دیا تھا۔ میں چشمہ بھی پہنتا تھا۔ اس کے علاوہ ہیگ سے میرا سامنا بھی بہت کم ہوا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اس عرصے میں اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔" میں اسے بتا رہا تھا اور وہ میری صورت دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے گردن ہلائی اور بولا۔ "ابھی آتا ہوں۔"

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ کمرے میں واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں شیونگ کٹ اور بڑا سا آئینہ تھا۔

"یہ......"

"ہاں، اسے صاف کر دو۔"

"مگر اس سے ایک مسئلہ ہے۔"

"کیا؟"

"وہ مجھے خاقان کی حیثیت سے پہچان لے گا۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن کم از کم تمہیں اس حیثیت سے نہیں پہچانا جائے گا جو تمہاری

موجودہ حیثیت ہے۔ امیگریشن پولیس بھی جو تمہارے جہاز سے اچانک فرار ہو جانے کی وجہ سے تمہاری تلاش میں ہو گی، تمہیں شناخت نہیں کر سکے گی۔ اس طرح تم اسکندریہ میں آزادی سے گھوم پھر سکو گے۔"

"اوکے.....'' میں نے اس سے اتفاق کیا اور ایک بار پھر میں بغیر داڑھی کے نظر آنے لگا۔ مجھے خود اپنا وجود ہلکا پھلکا اور ایک عجیب سی کیفیت کا حامل محسوس ہوا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ بہرحال یہ بہتر ہے۔

"اب ایسا کرو کہ کم از کم دو گھنٹے آرام کرو۔ اس کے بعد باہر نکلیں گے۔ آؤ میں تمہیں تمہارے آرام کی جگہ دکھا دوں۔"

جس کمرے میں مجھے پہنچایا گیا تھا وہ بھی ہر لحاظ سے ایک آرام دہ کمرہ تھا۔ بستر پر لیٹ کر بہت سی یادیں ذہن سے گزرنے لگیں۔ لیکن میں نے اپنی قوتِ ارادی کا ساتھ حاصل کر کے نیند کو اپنے قریب بلا ہی لیا تھا۔

※☆※

دو گھنٹے تک آرام کے بعد خود یزدانی نے مجھے جگایا۔ وہ خود بھی لباس وغیرہ تبدیل کر چکا تھا۔ اس نے میرے لئے بھی لباس کا بندوبست کر دیا تھا۔

بہرحال تیاریاں ہوئیں اور ہم عمارت کے دوسرے رُخ پر روشن سیڑھیوں سے اتر کر چوڑی گلی میں پہنچے جس میں پتھروں کا فرش کیا گیا تھا۔ یزدانی کے مکان کے سامنے ایک لمبی سی سیاہ رنگ کی موٹر کار کھڑی تھی اور وہی پراسرار سیاہ فام ملازم ایک کپڑے سے گاڑی کے شیشے چمکا رہا تھا۔

"واہ...... یہ کار شاندار ہے۔"

"بس اس سلسلے میں آپ یوں سمجھئے کہ سلطان صاحب نے میری بھرپور مدد کی ہے۔ ویسے کبھی کبھی پرنس بھی اسکندریہ آ جاتے ہیں اور وہ بھی دو چار دن کے لئے۔ لیکن جب بھی آتے ہیں کسی لڑکی وڑکی کے چکر میں آتے ہیں۔"

میری زبان پر ایک لمحے کے لئے یہ الفاظ آنے لگے کہ میں پوچھوں کہ آخر ان لوگوں کا دھندا کیا ہے مگر اس وقت یہ مناسب نہیں تھا۔ مجھے سب سے پہلے مسٹر اور مسز اسمتھ کی تلاش تھی جو کم از کم مجھے یہ بتا سکتے تھے کہ جہاز سے میرے فرار ہونے کے بعد کیا حالات پیش آئے۔

آخر کار یزدانی نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور ہم پیچ در پیچ راستوں سے گزرنے لگے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پوری بستی میں یزدانی کے مکان جیسا اور کوئی شاندار مکان نہیں تھا۔ ویسے پختہ مکانات بھی تھے، پتھر کی عمارتیں بھی دو تین نظر آئیں لیکن وہ قلعہ نما مکان جس میں، میں نے پناہ لی تھی سب سے مختلف تھا۔ بہت ہی بلند و بالا اور شاندار حیثیت کا مالک۔ کچے مکانات اور جھونپڑیاں بے شمار تھیں۔ گلیوں میں نیم برہنہ سیاہ فام حبشی اور مصری بچے لمبے لمبے کرتے پہنے دوڑتے پھر رہے تھے۔ یزدانی کی گاڑی دیکھ کر بچوں کا ایک غول پیچھے لگ گیا۔ وہ نجانے کیا کیا چیخ رہے تھے۔ یزدانی ہاتھ ہلا ہلا کر انہیں جواب بھی دے رہا تھا۔ پھر کسی اور چوراہے سے کچھ اور لڑکے اس ہجوم میں آ ملتے، کچھ پیچھے رہ جاتے۔ غرض یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ کھجور کی چٹائی کے سائبانوں کے نیچے لوگ ٹوکریاں اور مٹی کے برتنوں میں سودا سلف سجائے بیٹھے تھے۔ یہ ماہی گیروں کی اس بستی کا بازار تھا۔ کھیاں، شور، گرد و غبار۔ ویسے یہ بستی خاصی غربت زدہ لگ رہی تھی۔ یزدانی کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے اسکندریہ کی گنجان بستیوں کی سیر کرا رہا ہو۔ ویسے مصر کے اس علاقے میں بے پناہ غربت تھی۔

آخر کار ماہی گیروں کی بستی ختم ہوئی اور اس کے ساتھ ہی گرد و غبار، مچھلی کی بو اور گھٹن کا احساس بھی ختم ہو گیا۔ اب ہماری کار کشادہ سڑکوں سے گزرتی ہوئی اسکندریہ کی نئی بستی سے گزر رہی تھی۔ یہاں موٹر کاریں، گھوڑا گاڑیاں، اونٹ گاڑیاں شانہ بشانہ چل رہی تھیں۔ مصری اور مغربی لباس پہنے مقامی لوگوں کے ہجوم آہستہ روی کے ساتھ سڑک کے کنارے آ جا رہے تھے۔ اسکندریہ کا یہ علاقہ خاصا اچھا لگا۔ مصر کی تیز دھوپ سے سنولائے ہوئے چہرے کوئلے کی طرح سیاہ چمکدار، کھلے ہوئے گندمی رنگ کے چہرے اور سفید فام چہرے جو مصری بھی تھے اور مغربی ملکوں سے آئے ہوئے آباد کار بھی، بھانت بھانت کے لباس پہنے ہوئے لوگ۔

آخر کار یزدانی نے ایک شاندار ہوٹل کے سامنے گاڑی روک لی اور پھر بڑی دیر کے بعد خاموشی ٹوٹی۔ "خاقان! آپ یہاں ٹھہریں، میں یہاں آپ کے دوست ہنری اسمتھ اور اس کی بیوی کا پتہ کر کے آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا اور اس کے بعد میری نگاہیں قرب و جوار کا جائزہ لیتی رہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا عجیب و غریب وقت گزر رہا ہے۔ ہر لمحہ نئی حیثیت کا

حال، ہر لمحہ عجیب و غریب کہانیاں لئے ہوئے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہے، قسمت کے کھیل ہوتے ہیں یہ۔

تھوڑی دیر کے بعد یزدانی واپس آ گیا اور میں نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ بولا۔ ''نہیں، وہ لوگ یہاں نہیں ہیں۔ آیئے، دوسرے ہوٹل میں چلتے ہیں۔''

بہر حال ہم ایک اور شاندار ہوٹل میں پہنچ گئے جس کے دروازوں پر باوردی دربان مجسموں کی طرح منجمد تھے۔ شام ہونے والی تھی اور مقامی لوگ لمبی لمبی کاروں اور بگھیوں سے اتر اتر کر آ رہے تھے۔ ہماری کار اس ہوٹل کے سامنے آ کر رکی تو ایک لمبا تڑنگا دربان لپکا اور دروازہ کھول کر جھکا۔ اس نے بڑے ادب سے یزدانی کو سلام کیا تھا۔ یہ کوئی عام سلام نہیں تھا، اس کا مطلب تھا کہ یزدانی یہاں کے مستقل گاہکوں میں ہوگا۔ اس نے گھسے ہوئے پختہ مصری لہجے میں اس سے کوئی بات کی اور اس کے بعد اندر داخل ہونے لگا۔ لیکن پھر اچانک ہی رک کر اس نے مصری دربان سے کہا۔

''یہاں ایک انگریز جوڑا آیا ہوا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ مسٹر ہنری اسمتھ اور مسز اسمتھ آج ہی ہندوستان سے یہاں پہنچے ہیں۔''

ہنری اسمتھ کے نام پر دربان ذرا جھکا اور بولا۔ ''میں ہوٹل کے مرکزی ہال سے ابھی معلوم کر کے آتا ہوں۔''

''بہت شکریہ۔'' یزدانی نے کہا اور وہ شخص یزدانی کی بات معلوم کرنے کے لئے چل پڑا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد واپس آ کر بولا۔

''وہ لوگ اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ کمرہ نمبر سات سو چھ۔ اور کوئی حکم آقا؟''

''بہت بہت شکریہ۔''

''لیکن وہ اس وقت موجود نہیں ہیں اور کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ آپ آرام سے تشریف رکھئے، میں آپ کا سلام پہنچا دوں گا۔''

یزدانی نے اس کی محنت کا معاوضہ ادا کیا اور کچھ رقم ادا کی جسے جیب میں رکھ کر اس نے سلام کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ ہم مرکزی ہال سے ملحقہ لیونگ روم میں پہنچ گئے۔ یزدانی نے کافی منگوالی اور ہم دونوں مسٹر اور مسز اسمتھ کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ اسکندریہ پر بحیرہ روم کی شاندار شام اتر رہی تھی۔ خاصی رونق تھی۔ دوہری ٹھوڑیوں والے آفندی تھل تھل کرتے جسموں پر نئی تراش کے سوٹ چڑھائے سرکاری حکام، سرخ بنات کی ترپوش پہنے یا

سیاہ بالوں کو تیل سے چپکائے غیر ملکی پرفیوم کی خوشبوئیں اڑاتے ہوئے ہر طرح کے لوگ یہاں آ جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ گٹھے ہوئے جسموں والی یہودی اور ترک حسینائیں تھیں جو فرانسیسی انداز کے بھڑکیلے اور سنجیدہ لباس پہنے یورپین عورتوں سے زیادہ یورپین بنی ہوئی بات بات پر اترا رہی تھیں۔

ہم دونوں بہت دیر تک یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ پھر جب وہاں سے اکتاہٹ ہوئی تو باہر نکل آئے۔ یزدانی نے کاؤنٹر پر جا کر معلوم کیا تو پتہ چلا کہ سات سو چھ کے مہمان ابھی تک واپس نہیں آئے۔ چنانچہ ہم دونوں وقت گزاری کے لئے باہر نکل آئے اور اسکندریہ کی روشنی دیکھنے لگے۔ رحمان یزدانی تو اس ہنگامہ خیز بندرگاہی شہر کے ماحول میں اس قدر رچ بس گیا تھا جیسے پانی میں مچھلی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہاں کافی مقبول حیثیت کا شخص ہے۔ قیمتی لباس اور ہیرے جڑی انگوٹھیاں پہنے کتنے ہی مصری باشندے اسے پہچان کر لپکتے اور مصافحہ کرتے۔ کوئی آدھے ہی گھنٹے میں درجن بھر ملاقاتیوں سے صاحب سلامت ہوئی۔ تین چار نے اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت بھی دی اور اسے سگار پیش کئے۔ بھڑک دار کپڑوں میں ملبوس بنی سنوری کئی مصری، یہودی اور ترک حسینائیں اٹھلاتی ہوئی آئیں اور رحمان یزدانی سے ایک آدھ فقرہ کہہ کر اور ایک آدھ فقرہ سن کر تتلیوں کی طرح پر مارتی ہوئی گزر گئیں۔ تب رحمان یزدانی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

''آپ کو تو یہ سب کچھ عجیب لگ رہا ہوگا۔ اصل میں اس طرح کے ہوٹل ایسی عورتوں کا زبردست اڈا ہوتے ہیں۔ یہ جو بے شمار چڑھی مونچھوں والے مرد اور سرخ، سنہری اور سیاہ لٹوں والی عورتیں نظر آ رہی ہیں، ان کے ظاہری ٹھاٹھ باٹھ پر نہ جایئے، ان میں کتنی ہی عورتیں ان بڑی مونچھوں والے دلالوں کے قبضے میں ہیں۔ چار چار چھ چھ گھوڑوں کی بگھیوں میں آنے والی کتنی ہی خواتین رات ڈھلے یہاں سے گاہک پھانس کر اپنے عالیشان محلوں کی خلوتوں میں لوٹ جاتی ہیں اور ان پر خرچ کئے ہوئے قیمتی کھانوں، شراب اور دوسری چیزوں کا پورا پورا حساب وصول کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک بات میں آپ سے کہوں، یہ مصر کا اصل چہرہ نہیں ہے، یہ ایک بندرگاہی شہر کا سب سے بڑا ہوٹل ہے اور کسی بندرگاہی شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں اس شہر کے اور ملک کے نمائندہ لوگ نہیں پہنچتے۔ مصر کے کسان، سپاہی، عالم، دانشور اور اہل دل نیم تاریک گھروں میں اس نامراد شہر پر شام اترتی ہوئی دیکھتے ہیں اور صبح کے سورج کی لو لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ تو سطح نیل پر بہتا ہوا کچرا

ہے جو مدتوں یورپ کے کونوں کھدروں میں سڑتا رہا، پھر نیل کے مقدس پانی پر آ ٹھہرا اور اگلے سیلاب تک سڑتا رہے گا۔ مگر یقین کیجئے خاقان! مصر دریائے نیل کی ایک ایسی انگڑائی کا انتظار کر رہا ہے جو بین الاقوامی غلاظت کا یہ انبار بحیرہ روم کو لوٹا دے گی۔ مصری ملاحین اور مصری عالم اور مصری سپاہی اور مچھیرے اس زندہ سرزمین کی عظمت کو واپس چھین لیں گے۔ یہ تمام خوبصورت دلے اور یہ نرم و نازک فاحشائیں اگلے سیلاب کے بعد دیکھنے تک کو نہیں ملیں گی۔ انہیں آج رات جی بھر کر دیکھ لیجئے اور ویسے اگر دل کو لگے تو حکم کیجئے، وہ چھ فٹا دربان جسے میں نے ابھی تھوڑے سے نوٹ دیئے ہیں، آپ کے انگریز دوستوں کے آنے تک اسے کسی کمرے میں پہنچا دے گا اور کمرے کو باہر سے مقفل کر دے گا۔ ابھی ملاحظہ کر لیجئے، جی چاہے تو فرصت سے کھایئے۔ جیسا آپ پسند کریں۔'' اس کی آواز کی تلخی کو میں نمایاں طور سے محسوس کر رہا تھا۔ میں نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھا پھر کہا۔

''رحمان یزدانی! آپ کو بزرگ کہنے کو تو دل نہیں چاہتا لیکن آپ کے لہجے کی تلخی کا کچھ اندازہ ہے مجھے۔ کیا کہنا چاہتے ہیں، براہِ کرم صاف الفاظ میں کہئے۔''

''خاقان! میں نے اتنی مختصر زندگی میں یہاں کے لاتعداد رنگ دیکھے ہیں۔ تین بار میں گھناؤنی بیماریوں میں مبتلا ہوا ہوں اور اب یہی فیصلہ کیا ہے میں نے بلکہ یہ میرا بہترین تجربہ ہے کہ ہماری چھوٹی سی سیتا گڑھی اس کائنات کا سب سے حسین علاقہ ہے۔ وہاں نیکیاں بستی ہیں۔ میری سیتا گڑھی ایسے ہزاروں بین الاقوامی شہروں سے لاکھ درجے اچھی ہے۔ یہاں فاحشائیں آپ کا قیمتی لباس دیکھ کر آپ سے ٹکراتی ہوئی، قہقہے مارتی ہوئی گزرتی ہیں۔ میری سیتا گڑھی میں ماں بہنیں سر پر چادر ڈال کر کبھی کام سے گلیوں میں نکلتی ہیں تو بڑے سے بڑا بدترین انسان دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو جاتا ہے کہ میری ماں، میری بیٹی، میری بہن گزر جا یہاں سے۔ ہم تیرے گاہک نہیں، تیرے محافظ ہیں۔ دنیا ہمیں پسماندہ ملک کا شہری کہتی ہے لیکن ہمارے ہاں ابھی انسان زندہ ہیں۔ انسان تو یہاں بھی ہیں مگر برائیوں نے انہیں یرغمال بنا لیا ہے۔ بس کیا کہا جائے۔ تم دل ہی دل میں ہنس رہے ہو گے خاقان! اور سوچ رہے ہو گے یہ شخص کتنی پارسائی کی باتیں کر رہا ہے۔ تمہیں خود بھی اندازہ ہو گا کہ میں یہاں مسواک اور وضو کے لوٹے نہیں بیچتا، حشیش اور کوکین سپلائی کرتا ہوں جو یورپ کے بازاروں میں اور فاحشاؤں کے اڈوں پر پہنچتی ہے اور میں اس کی رقم وصول کرتا ہوں۔ میں بھی ثواب نہیں کما رہا، عذاب جھیل رہا ہوں۔ مگر اتنا جانتا ہوں میں کہ

چمکدار مونچھوں والے دلال اور لال سنہری زلفوں والی طوائفیں کچھ ہی دن کے مہمان ہیں۔ آخر میں وہی لمبے کرتوں والے نیم برہنہ بچے جو ماہی گیروں کی بستی میں ہماری موٹر کے ساتھ دوڑ رہے تھے ان شہروں کو ان گندگیوں سے پاک کریں گے اور انہیں آباد کریں گے۔ خاقان! میں جان بوجھ کر اس مکان میں رہتا ہوں کیونکہ ابھی تک مجھے اپنا وہ کچی اینٹوں کا مکان یاد ہے جہاں میرے ماں باپ نے دم توڑا تھا۔ وہ ٹیڑھی میڑھی گلیاں میری زندگی کی سب سے بڑی یادگاریں ہیں جن میں دس برس کا رحمان یزدانی روتا ہوا گزرتا تھا۔ وہ ایسی ہی کوئی بستی تھی جس میں، میں رہتا ہوں۔ بس میں نجانے کہاں سے کہاں روتا ہوا چلا جاتا تھا اور ایک دن میں روتا ہوا جا رہا تھا کہ جب سلطان صاحب مجھے ملے اور دعائیں دوں انہیں، میرے پاس تو دعاؤں کے لئے بھی الفاظ نہیں ہیں، وہ مجھے پرانی گاڑی سے اتر کر دیکھنے آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے میرا نام پوچھا، میرے گاؤں کا نام پوچھا اور جب میں نے اپنی کچی اُردو میں انہیں بتایا کہ میرے ماں باپ کو کسی نے مار ڈالا ہے اور میرا کوئی وارث نہیں ہے تو انہوں نے میرے ماں باپ کے قاتلوں کو ماں کی گالی دی تھی اور مجھے گاڑی میں بٹھا لیا تھا۔ تھرمس کی بوتل سے گرم چائے انڈیل کر مجھے پلائی تھی اور کہا تھا، رحمان بیٹا! روتا کیوں ہے؟ تو مرد ہے سالے! اور مرد رویا نہیں کرتے۔ چل میرے ساتھ، میں تیرے اندر کی کیفیت خوب سمجھتا ہوں۔ تو میرے ساتھ چل...... چل میرے ساتھ۔''

رحمان یزدانی کی آواز بھرا گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور میں نجانے کیسی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جس شخص کے ساتھ میں نے اپنے بچپن کا ایک اچھا خاصا وقت گزارا ہے وہ اندر سے ایک انوکھی کہانی کا شکار ہے۔ یہ وقت اور انسانوں کا ایسا سماں رکھتا ہے۔ اس شخص نے زندگی کے ایسے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ نجانے کیوں ایک لمحے کے لئے میرے دل میں اس کے لئے بے پناہ محبت کا احساس ہوا۔ ہم لوگ ٹیرس پر جھکے ہوئے خاموشی سے جگمگاتے ہوئے اسکندریہ اور لمحہ لمحہ مرتی اور زندہ ہوتی ہوئی زندگی کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد ہوٹل کا وہی ملازم ہمارے پاس پہنچ گیا اور اس نے گردن خم کر کے کہا۔

''مسٹر اسمتھ تو ابھی نہیں آئے لیکن ان کی مسز، سلام نوری کے ساتھ ابھی بار میں آ کر بیٹھی ہیں۔''

''سلام نوری؟'' رحمان یزدانی کے منہ سے نکلا۔ مصری دربان یہ اطلاع دے کر چلا گیا

تھا۔ میں جن حالات کا شکار تھا ان کا تقاضا تھا کہ میں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاؤں۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ سلام نوری کوئی ایسی شخصیت نہ ہو جو میرے لئے نقصان دہ بن جائے۔ پولیس کا آدمی بھی ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے اسکندریہ کی پولیس مجھے تلاش کر رہی ہوگی۔ لیکن مسز اسمتھ سے ملاقات کرنا بھی ضروری ہے۔ میں نے رحمان یزدانی سے کہا۔

''ہاں، اب بتاؤ کیا مشورہ ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''کیا مسز اسمتھ سے اس وقت ملنا مناسب ہوگا؟ ویسے سلام نوری کے بارے میں کیا کہتے ہو، کیا یہ شخص پولیس کا آدمی ہے؟''

''سلام نوری۔ اگر یہ پولیس کا آدمی ہے تو میں یقیناً اس کو جانتا ہوں گا۔ ایسا کرو یہاں رُکو، میں دربان سے پوچھتا ہوں وہ لوگ کہاں بیٹھے ہیں۔''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک میں نے بائیں سمت دیکھا، اس طرف باتھ روم بنے ہوئے تھے اور باتھ روم کے دروازے سے جو کوئی باہر نکلا تھا اسے دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ ہنری اسمتھ تھا جس کی حالت بہت خراب نظر آرہی تھی۔ اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی، بال بکھرے ہوئے تھے اور لباس پر بے پناہ شکنیں تھیں۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی ہوگئی تھی، کالر کا بٹن کھلا ہوا تھا۔ ویسٹ کوٹ کے نیچے سے قمیض کا دامن باہر نکلا ہوا نظر آیا۔ میں پھرتی سے اٹھا۔ رحمان یزدانی ابھی دور نہیں گیا تھا، مجھے دیکھ کر رکا۔ میں نے آگے بڑھ کر ہنری اسمتھ کا ہاتھ تھاما تو وہ آہستہ سے بولا۔

''چھوڑ دو مجھے...... میں کہتا ہوں کہ مجھے چھوڑ دو۔''

اس کے منہ سے شراب کے بھبکے اُڑ رہے تھے اور اس کی آنکھوں کا خالی خالی پن بتاتا تھا کہ اس نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔ اس کی پتلیاں سکڑی ہوئی تھیں اور آنکھیں بے نور تھیں۔ میں نے نرمی سے اسے آواز دی۔

''ہنری! مجھے پہچانتے نہیں ہو؟''

''کسی کو نہیں جانتا میں اس کائنات میں۔ پوری کائنات میں کسی کو نہیں جانتا۔''

رحمان یزدانی میرے قریب آگیا۔ اس نے کہا۔ ''کون ہے یہ؟''

''یہی ہنری اسمتھ ہے۔''

''اوہ......'' رحمان یزدانی نے سر ہلایا اور پھر اس نے ہنری اسمتھ کے شانے پر ہاتھ رکھا

اور اسے تقریباً دھکیلتا ہوا باتھ روم میں داخل ہوگیا۔ میں بھی ان دونوں کے ساتھ باتھ روم میں آگیا تھا۔ رحمان یزدانی نے اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔

''تم مجھے لوٹنا چاہتے ہو...... واقعی تم بھی مجھے لوٹنا چاہتے ہو۔ کمال ہے، سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ سب مجھے لوٹتے رہتے ہیں۔ میرے پاس اب ایک دھیلا بھی نہیں ہے، میں نے اپنی گھڑی وارمین کو دے دی ہے۔ میرے پاس بالکل پیسے نہیں ہیں۔ پیسے تو کبھی ہوتے ہی نہیں ہیں۔ وہ کتیا کی بچی مجھے پیسے نہیں دیتی۔ جانتے ہو نا وہ کتیا کی بچی کون ہے۔ میری بیوی، میری بیوی۔''

بہرحال یہ عجیب وغریب صورتحال تھی۔ شراب کے نشے میں انسان سچ بولتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہنری اسمتھ کی بیوی نے اس کو بڑا کنگال کر کے رکھا ہوا ہے۔ بہرحال یہ میاں بیوی میرے دوست اور ہمدرد تھے۔ ہیگ کے خلاف میں نے جو محاذ بنایا تھا وہ اس کا حصہ تھے۔ ہنری کو یہ سمجھانا بڑا مشکل کام تھا کہ ہم چور اچکے نہیں ہیں۔ بہرحال بڑی کوششوں سے یہ کام سرانجام دیا گیا اور ہنری کسی قدر رام ہوگیا۔ اس نے خود کو ہمارے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ چنانچہ رحمان یزدانی نے گرم پانی میں تولیہ بھگو کر اسمتھ کا منہ دھلایا، لباس درست کر کے اس کے بال سنوارے۔ وہ کھڑا کھڑا کانپ رہا تھا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ یہ شخص بہت بیمار ہے۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا اور بولا۔

''ہنری! میں لیفٹیننٹ ہوں، تمہارا دوست! ہم ایک ہی جہاز میں بمبئی سے آئے تھے۔ میں نے داڑھی صاف کر دی ہے۔ ہم دوست بن گئے تھے اور تم لوگوں نے مجھے پروفیسر اختشام کے منصوبے میں شریک ہونے کی دعوت دی تھی۔ یاد آیا کچھ؟''

اس کی پتلیاں پھیلنا شروع ہوگئیں اور اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ارے ہاں...... ہاں تم...... تم تو وہ ہو، خاقان جمشیدی...... خاقان جمشیدی۔''

میں بری طرح چکرا کر رہ گیا۔ میرا خیال ہے کہ جہاز پر میرے اصل نام سے اس سے بات چیت نہیں ہوئی تھی بلکہ میں خالی لیفٹیننٹ ہی کہلاتا رہا تھا۔ اسے میرا اصل نام کیسے معلوم ہوا؟ میں نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

''یہ نام تمہیں کس نے بتایا...... بولو، میرا یہ نام تمہیں کس نے بتایا؟''

وہ خوف سے کانپنے لگا اور پھر بولا۔ ''جانے دو، پلیز مجھے جانے دو۔ چھوڑ دو مجھے۔''

میں اس کے کان کے قریب ہو گیا اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ہنری اسمتھ! پلیز مجھے اس نام کے بارے میں بتاؤ۔ تمہیں یہ نام کس نے بتایا؟''

وہ آنکھیں جھپکانے لگا۔ اس کا ذہن جیسے اب تک دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ پھر اس نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔ ''کیا تم خاقان نہیں ہو؟''

''میں کہتا ہوں تم یہ نام کیوں لے رہے ہو؟ میری بات کا جواب دو۔ تم نے کس سے یہ نام سنا؟ کس نے بتایا تمہیں یہ نام؟ اور اگر تم یہ بات نہیں بتاؤ گے کہ تمہیں یہ نام کس نے بتایا تو ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں یہیں اسی باتھ روم میں گردن دبا کر مار دوں۔''

اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آئے۔ اور پھر اس نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

''اُسی نے...... اُسی نے بتایا تھا۔''

''کس نے......؟'' میں غرایا۔

''اُسی نے۔ وہ اس وقت بھی میری بیوی کے ساتھ بار میں بیٹھا ہوا ہے۔''

میرے ذہن میں پھر ایک بار چھناکا ہوا تھا اور رحمان یزدانی بھی چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگا تھا۔ چونکہ مصری دربان نے ابھی کسی سلام نوری کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ شخص بھی شاید اسی کا ذکر کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا۔

''کون ہے وہ...... کیا نام ہے اس کا؟''

''سلام...... سلام...... سلام نوری۔ مگر تم دیکھ لینا میں اس کتے کو قتل کر دوں گا۔ اس نے میری بیوی مجھ سے چھین لی ہے۔ اور مجھے ترسا دیا ہے۔ تم دیکھنا میں قتل کر دوں گا اسے۔''

''بیوی چھین لی ہے؟''

''ہاں اس نے مجھے ترسا دیا ہے۔ میں نے خوشامد بھی کی، غصہ بھی کیا۔ مگر اس کے دل میں تمہیں معلوم ہے یہ لت اسی نے لگائی تھی۔ پہلے تو اس نے مجھے اس کا عادی کر دیا اور اب اتنی سی بات پر......''

ہنری اسمتھ ہانپنے لگا۔ وہ واش بیسن کا سہارا لئے جھول رہا تھا۔ رحمان یزدانی اس کی بے ربط باتیں غور سے سنتا رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور اس نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ لگا کر ہنری کا چہرہ اوپر اٹھایا، پھر دوسرے ہاتھ سے کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح اس کے پپوٹے اٹھا کر دیکھے، پھر آستین الٹ کر بازو دیکھا۔ ہنری نے ناگواری سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ تب رحمان یزدانی نے ہنری کے کان کی طرف منہ لے جا کر کہا۔

''مسٹر اسمتھ! وہ روزانہ تمہیں کتنی دیتا ہے؟''

''کتنی......'' ہنری اسمتھ نے کھڑے کھڑے جھولتے ہوئے جیسے رحمان یزدانی کو پہلی بار دیکھا، پھر ڈوبتی آواز میں بولا۔ ''صرف دو وائل۔''

''دو وائل؟'' رحمان یزدانی نے حیرت سے کہا۔

''ہاں صرف دو وائل۔'' وہ مدھم لہجے میں بولا۔

''تمہیں کب سے نہیں ملی؟''

''جہاز پر دی تھی اور بس۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے رحمان یزدانی کی طرف دیکھا۔ ''پتہ نہیں کیا چکر ہے رحمان۔''

''مجھے اندازہ ہو رہا ہے یہ شخص مارفین کا عادی ہے۔ کہتا ہے سلام نوری نے اسے اس نشے کی لت لگائی ہے اور شاید اس کی بیوی سے تعلقات قائم کر لئے ہیں۔ سفر کے دوران وہ اسے مارفین دیتا رہا ہے لیکن اب کسی وجہ سے بند کر دی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی یہ حالت ہے۔''

میرے ذہن میں بجلی کے کوندے لپکنے لگے۔ یہ شخص سلام نوری جو کچھ بھی ہے، اگر جہاز پر ہمارے ہی ساتھ آیا ہے تو اسے بھی ساری باتیں معلوم ہوں گی۔ مسز اسمتھ چالاک عورت ہے اور اس نے اس کو بھی اس مسئلے میں الجھا لیا ہو گا۔ مسز اسمتھ سے اگر اس کا کوئی معاملہ ہے تو ہیگ کے قبضے سے فولادی تختی حاصل کرنے میں یقیناً وہ مسز اسمتھ کی مدد کر رہا ہو گا۔ بہر حال مجھے اس نشے باز اسمتھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں نے رحمان یزدانی سے کہا۔

''اگر تم چاہو تو اسے سنبھالو، میں ان دونوں کے پاس جاتا ہوں اور جہاز کے حالات معلوم کرتا ہوں۔'' پھر اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ یہ شخص یعنی سلام نوری میرا اصل نام جانتا ہے، اس کا مطلب ہے کہ اس نے یقیناً مجھے ہندوستان میں اور پھر جہاز پر دیکھا ہو گا۔ اسے ضرور معلوم ہو گا کہ میں جہاز سے فرار ہوا ہوں اور اسکندریہ کی پولیس مجھے تلاش کر رہی ہے۔ ان معلومات کے ساتھ یہ آدمی میرے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ لیکن اسمتھ کا دوست ہونے کی وجہ سے اسے ہیگ کے خلاف مؤثر طور پر استعمال بھی تو کیا جا سکتا ہے۔

میں شدید کشمکش کا شکار تھا اور رحمان یزدانی میری صورت دیکھ رہا تھا۔ آخر کار میں نے طے کر لیا کہ میں سن گن لوں گا۔ میں نے رحمان یزدانی کو تفصیل سے ساری باتیں بتائیں

اور رحمان یزدانی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، ہوسکتا ہے۔ مگر پتہ نہیں یہ شخص کون ہے۔“

اس نے مسٹر اسمتھ کو ایک جگہ بٹھا دیا۔ اسمتھ کی حالت بدستور خراب تھی۔ میں نے کہا۔

”جس طرح اس مصری شخص نے سلام نوری کا نام لیا، اس کا مطلب تھا کہ وہ اسے جانتا ہے۔“

”مگر پتہ نہیں میں اسے کیوں نہیں جانتا۔ اس نام کا کوئی شخص پہلے کبھی اسکندریہ میں نہیں دیکھا گیا۔ میں یہ نام پہلی مرتبہ سن رہا ہوں۔ اگر یہ مارفین، حشیش وغیرہ سے متعلق ہے تو میں بھی اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی تک بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئی ہیں۔“

”تو پھر ایسا کرو کہ پہلے تم اسے دیکھ لو اور اپنا اطمینان کرلو۔ اس کے بعد میں اس سے مل لوں گا۔“

”ہاں، یہی مناسب ہے۔ تم یوں کرو کہ اس کے پاس ٹھہرو، میں اسے جا کر دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر یزدانی مجھے اور اسمتھ کو باتھ روم میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ اس عرصے میں ہنری اسمتھ سے اور پوچھ گچھ کرلی جائے۔ میں نے اس سے بہت سے سوالات کیے مگر اس کی کیفیت خاصی خراب تھی۔ بہت جھنجھوڑنے اور چیخ پکار کرنے پر اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور نیند اور ٹوٹتے ہوئے نشے کے عالم میں کہا۔

”کہیں سے مجھے ایک ہی وائل لادو۔ میں مر رہا ہوں۔ مر جاؤں گا۔“ وہ اسٹول پر اس طرح ٹکا ہوا تھا کہ میں ڈر رہا تھا کہ گر ہی نہ جائے۔ میں اسے تھامے کھڑا رہا اور یزدانی کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد باتھ روم کے دروازے پر مخصوص کھٹکا ہوا اور میں نے دروازہ کھول دیا۔ رحمان یزدانی اندر آیا تو سخت ہیجان کے عالم میں تھا۔ اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی اور تیزی کے ساتھ اردو میں بولا۔

”خاقان! اسے جلدی سے یہاں سے نکال کر دوسری منزل پر کمرہ نمبر تیس میں پہنچانا ہے۔ یہ کام تم کرلو، میں ایک بیرے کو بھیج رہا ہوں۔ تم ایسا کرنا کہ اسے لے کر وہاں پہنچو اور بیرے کے آنے تک باتھ روم کا دروازہ بند رکھو۔ او کے۔“ اس نے میرے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا اور جس تیزی سے وہ آیا تھا اسی تیزی سے چلا گیا۔ میں ششدر رہ گیا تھا۔ یا الٰہی! یہ نیا کھیل کیا ہے؟ رحمان یزدانی تو بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ یہ اسے کیا ہوگیا؟ ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ چند ہی لمحوں کے بعد پھر وہی مخصوص دستک

ہوئی اور دوسری طرف سے کسی نے مصری لہجے میں انگریزی میں کہا۔

”سیّدی پاشا...... سیّدی پاشا! دروازہ کھولو۔“

ایک لمحے تک میں نے سوچا اور اس کے بعد دروازہ کھول دیا۔ ایک وردی پوش بیرہ جو انتہائی شاندار جسامت کا مالک تھا، باتھ روم میں آگیا۔ اس نے مجھ سے کچھ پوچھے بغیر ہنری اسمتھ کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے کھڑا کیا۔ اس کا ایک بازو اپنی گردن میں حمائل کیا اور اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر آہستہ آہستہ قدم چلاتا ہوا اسے باتھ روم سے باہر لے چلا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی بیرا ہے جسے رحمان یزدانی نے بھیجا ہوگا۔ ہنری اسمتھ سوتا جاگتا، کسی قدر لڑکھڑاتا بیرے کے شانے پر پورا بوجھ ڈالے چلا آرہا تھا۔ یہی شکر تھا کہ وہ اس وقت خاموش تھا۔ میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر پیچھے پیچھے چل پڑا۔ مرکزی ہال سے گزرتے ہوئے ہم راہداری میں پہنچے جہاں اوپری منزلوں تک سامان پہنچانے کے لئے پرانے طرز کی لفٹ لگی ہوئی تھی۔ لفٹ میں پہنچتے ہی اسمتھ نے بڑبڑانا شروع کردیا۔

”میں تم سب کو جانتا ہوں۔ سب اسی کے گرگے ہو۔ آہ...... وہ اُس کے ساتھ میرے بستر میں سورہا ہوگا۔ اور تم لوگ...... میں جانتا ہوں تم لوگ مجھے چھت پر سے دھکا دے دو گے۔ بس ایک وائل۔ تمہیں خدا کا واسطہ مجھے ایک وائل لادو۔“

لفٹ میں اس کی بڑبڑاہٹ مجھے بڑی عجیب لگ رہی تھی اور مجھے غصہ بھی آرہا تھا۔ میں نے اس دن پر لعنت بھیجی جس دن پروفیسر احتشام سے مڈبھیڑ ہوئی تھی اور اس منحوس انگریز جوڑے سے میرا تعارف ہوا تھا۔

بہر حال دوسری منزل کا کمرہ نمبر تیس ایک بیڈ والا کمرہ تھا۔ بیرے نے چابکدستی سے ہنری اسمتھ کا لباس تبدیل کیا اور اسے بستر پر لٹا کر کمبل سے ڈھک دیا۔ ہنری بڑبڑاتا جارہا تھا۔ اب وہ پیلا پڑ رہا تھا۔ کوکین نہ ملنے کی وجہ سے اس کی حالت خراب ہوتی جارہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں اکڑتے جارہے تھے اور ہونٹوں پر کف جمع ہورہا تھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ کئی سال سے مارفین کا عادی ہے اور شاید یہ پہلا موقع ہے کہ اسے مارفین نہیں ملی۔

بیرا خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اس نے شروع سے اب تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا سوائے اس وقت جب مجھے آواز دینے کے لئے سیّدی پاشا، سیّدی پاشا کہا تھا۔

میں خاموشی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کمرے کے دروازے

پر دستک سنائی دی اور اس دستک کا انداز مخصوص تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو رحمان یزدانی اندر آ گیا۔ کمرے میں آتے ہی اس نے ہنری کی نبضیں ٹٹولیں، اس کی آنکھیں دیکھیں اور پھر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ پھر اس نے کرسی کھینچ کر ایک طرف کی اور اس کے بعد اس پر آ بیٹھا۔

''سب کچھ...... سب کچھ وہی ہے جس کا مجھے شبہ تھا مائی ڈیئر خاقان! تمہارے خلاف کوئی زبردست سازش ہو رہی ہے۔''

''سازش؟'' میں نے سوالیہ انداز میں رحمان یزدانی کو دیکھا۔

''ہاں سازش۔'' وہ بدستور پراسرار لہجے میں بولا۔ نجانے کیا معاملات تھے، اس کی سرگرمیاں میرے لئے ناقابل فہم تھیں۔ پھر اس نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور مجھے سگریٹ پیش کر کے اپنی اور میری سگریٹ سلگائی۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے اسے مسلسل خاموش پا کر کہا۔

''کچھ تو بتاؤ مجھے۔ میں کس کیفیت کا شکار ہوں، تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔''

''جو شخص بار میں مسز ہنری اسمتھ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے وہ سلام نوری نہیں ہے۔'' رحمان یزدانی نے انکشاف کیا۔

''تو پھر......؟''

''وہ بحیرہ روم کے اس علاقے کا سب سے بڑا اسمگلر ذاکر قباشی ہے۔''

''خوب۔ ظاہر ہے میں اسے نہیں جانتا۔'' میں نے جواب دیا۔

''ذاکر قباشی سے میری پرانی دشمنی ہے۔ کچھ تو تجارتی معاملات ہیں اور کچھ دوسرے چکر۔ کتنی ہی بار مجھے اس کے ہاتھوں شدید نقصان اٹھانا پڑا ہے۔''

''مگر میرے خلاف کیا سازش کی جا رہی ہے؟ ابھی تم نے مجھے بتایا تھا۔''

''پتہ چل جائے گا۔ پہلی بات تو یہ بتانا ضروری ہے کہ ہشمان ذکری کا تعلق ذاکر قباشی سے ہے۔'' رحمان یزدانی نے کہا اور میں سچی بات ہے چکرا کر رہ گیا۔ الٰہی، دنیا بھر کی مشکلات میری ہی تقدیر میں لکھی گئی ہیں؟ پھر میں نے آہستہ سے کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟ کیونکہ یہ شخص ذاکر قباشی تو ہنری اسمتھ اور اس کی بیوی کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ وہ اگر ہشمان ذکری کا ساتھی ہے تو یہ دونوں میاں بیوی ذکری اور ہیگ کے خلاف میری مدد کیوں کر رہے ہیں؟ نہیں یار! کچھ اور ہی گڑبڑ ہے۔ یقینی طور پر کچھ اور ہی

گڑبڑ ہے۔ میرا دماغ ان باتوں کو تسلیم نہیں کر رہا۔''

رحمان یزدانی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال یہ معمہ حل ہو جائے گا۔ تم یہ سمجھ لو کہ یہاں تمام چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں اور اس ہوٹل میں بھی اسٹاف میں میرے کارندے گھسے ہوئے ہیں۔ یہ بیرا جو ابھی ابھی اس انگریز کو لاد کر لایا ہے میرا ہی آدمی ہے۔ ابھی چند منٹ میں اپنے آدمیوں سے مجھے یہ سن گن ملی ہے۔ اس سے مجھے کچھ اور ہی شبہ ہو رہا ہے۔ بہرحال میں نے اس سلسلے میں فوری کارروائی شروع کر دی اور خود بھی ایک منصوبہ بنا لیا ہے۔ کیا سمجھے؟'' یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک ڈبہ نکالا۔ شاندار پیکنگ میں دو وائل رکھے ہوئے تھے جو یقیناً مارفین کے ہوں گے۔ رحمان یزدانی نے کہا۔ ''ذاکر قباشی اور مسز اسمتھ ابھی تک یہاں موجود ہیں۔ ہم اس حرام زادے کو......'' اس نے بستر کی طرف اشارہ کر کے ہنری کی نشاندہی کی اور کہا۔ ''ہم اسے یہاں بند کر جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کسی طرح چھپ کر قباشی کو پہچان لو۔ ہمیں اس طرح جانا ہو گا کہ وہ یا مسز اسمتھ تمہیں یا مجھے نہ دیکھ سکیں۔''

میں بہرحال شدید اعصابی کھنچاؤ کا شکار تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسمگلر قباشی جو ہشمان ذکری کا ساتھی ہے آخر اس جوڑے کو کہاں سے جانتا ہے اور کیسے جانتا ہے؟ جہاز پر تو میں نے ان لوگوں کو کسی عرب کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ بہرحال یہ میرے سوچنے کی باتیں تھیں اور میں درحقیقت خود اپنے بارے میں سوچتا تھا تو بھی احساس ہونے لگتا تھا کہ میں دنیا کا سب سے پراسرار آدمی ہوں۔

رحمان یزدانی کھڑا ہو گیا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ پھر کمرے کو مقفل کرنے کے بعد لفٹ کا انتظار کرنے لگے۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ گراؤنڈ فلور پر اتر کر ہم مرکزی دیوار کے ملحقہ دروازے سے بیرونی گیلری میں نکل آئے۔ یوں لگتا تھا جیسے رحمان یزدانی اس ہوٹل کے چپے چپے سے واقف ہے۔ گیلری کے نیم تاریک ماحول میں ہم ایک ایسی کھڑکی کے پاس جا کر رُکے جو اس طرف کھلتی تھی جہاں بار تھا اور بار تقریباً کھلا ہوا تھا۔ رحمان یزدانی کھڑکی کے پردے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور اندر جھانکنے لگا۔ میں بھی اس کے برابر ہی جا کھڑا ہوا تھا۔ اور چند ہی لمحوں کے بعد اس مختصر سے ہال میں، میں نے مسز اسمتھ کو بیٹھے ہوئے دیکھ لیا۔ مگر وہ تنہا تھی اور اس وقت جھلمل کرتے ہوئے اس سیاہ گاؤن میں محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی عورت ہے۔ جہاز میں تو اس نے اپنا حلیہ کچھ عجیب سا بنا

رکھا تھا۔ میں نے اسے اتنا دل آویز کبھی نہیں پایا تھا جتنی وہ اس وقت لگ رہی تھی۔ اس وقت شاید اس نے اپنے آپ کو اس قدر دل آویز بنانے کی کوشش کی تھی۔ انتہائی حسین میک اپ تھا اس کا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی مسز اسمتھ ہے۔ اس کے بال بھی نئے انداز سے سنوارے گئے تھے اور کھلے گلے کے گاؤن میں اس کا بدن اس قدر دلکش لگ رہا تھا کہ انسانی نگاہیں اس پر سے ہٹنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ مجھے تو وہ اس وقت خود بھی بہت اچھی لگ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ جہاز پر تو ڈھیلے ڈھالے لمبے اور پرانے طرز کے کپڑے پہنتی تھی مگر اسکندریہ کے اس ہوٹل میں اس رات فتنہ بن کر آنے کا مقصد کیا تھا؟ یقیناً وہ کوئی بے مقصد عورت نہیں تھی اور جانتی تھی کہ انسانی ذہن کو کس طرح گرفت میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت جب وہ جہاز میں تھی اس نے ایک بار بھی اس طرح کا کوئی اظہار نہیں کیا تھا۔ رحمان یزدانی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''وہ ہے...... وہ ہے...... دیکھو، وہ ہے۔''

میں چونک پڑا۔ ''کون......؟'' میں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

''ذاکر قباشی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ دائیں ہاتھ پر تیسری میز کے پاس سیاہ رنگ کے سوٹ میں ملبوس۔'' اس نے کہا اور میں اس طرف دیکھنے لگا۔ نازک اندام عورتوں کے جھرمٹ میں نفیس تراش کے سیاہ رنگ کے سوٹ میں جو شخص لمبے تڑنگے قد و قامت کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اسے دیکھ کر میں اس قدر بدحواس ہوا کہ میں نے رحمان یزدانی کا بازو پکڑ لیا اور اس قدر سختی سے بھینچا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔

''ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو...... یہ...... یہ......'' اس نے کہا۔

''میرے خدا...... میرے خدا...... یزدانی، یہ ہیگ ہے۔ وہی حرامی جس کے پیچھے لگ کر میں نجانے کتنی صعوبتیں اٹھا کر یہاں تک پہنچا ہوں۔''

رحمان یزدانی کے چہرے پر نجانے کیوں اطمینان کے آثار نظر آئے۔ میرے ان الفاظ سے وہ خود متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھے شبہ تھا۔ یقین کرو مجھے شبہ تھا کہ ہیگ اور قباشی ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ گڈ...... ویری گڈ۔ اب آؤ ذرا ہنری اسمتھ سے کچھ دل کی باتیں ہو جائیں۔'' رحمان یزدانی نے مجھے بازو سے پکڑا اور گیلری کے سرے کی طرف چل پڑا جہاں لکڑی کے زینے اوپر کی سمت جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے مسز اسمتھ کی جو کیفیت دیکھی تھی، وہ کیفیت بے شک نشہ ٹوٹنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ لیکن

اس وقت ان حالات نے مجھے اس طرح چکرا کر رکھ دیا تھا کہ میں اندر سے اپنی کیفیت خود اس سے بہتر محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ایسی الجھنوں نے مجھے گھیر لیا تھا جو بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ ذاکر قباشی، ہیگ کا دوسرا نام ہے۔ ہیگ مجھ سے کلکتے میں متعارف ہوا تھا۔ اس نے وائسرائے کے چیمبر سے خفیہ کاغذات چرانے کے لئے مجھے استعمال کیا تھا۔ اور میں اس کی پیدا کی ہوئی مصیبت سے بچ بچا کر بمبئی آیا تھا اور اتفاقی طور سے میں نے اسے دیکھ لیا تھا اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اپنی دیوانگی کا شکار ہوا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے جہاز میں سوار ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا تعاقب کرتا ہوا مصر تک آ گیا تھا۔ اپنی دانست میں، میں نے بڑی چالاکی سے کام لیا تھا۔ جہاز پر بھیس بدل کر گھومتا پھرا تھا اور مطمئن تھا کہ ہیگ مجھے نہیں پہچان سکا۔

بہرحال اچانک ہی مجھے ایک بات یاد آئی۔ ایک بار میں اس کمپنی کے دفتر میں گیا تھا جہاں سے ہیگ نے اس جہاز میں اپنے لئے بکنگ کرائی تھی اور کلرک نے شاید اسے سلام نوری کہا تھا۔ اس وقت میں ان الفاظ کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ یہ نام اگر یاد آتا تو بڑی الجھنوں سے بچ جاتا۔ ذاکر قباشی کے بارے میں تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بہرحال ہیگ کی شخصیت کے بارے میں میرے سارے اندازے اب تک غلط ہی رہے تھے۔ میں نے اسے ایک عام قسم کا مجرم سمجھا تھا۔ لیکن یہاں مصر میں آ کر مجھے اس کی اصل شخصیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ذاکر قباشی کے نام سے وہ یہاں کا بہت بڑا اسمگلر تھا اور انگریز میاں بیوی اور پروفیسر کا قتل اور یہ تختی تمام باتیں اتنی الجھی ہوئی تھیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کون سا رخ اختیار کروں۔ اپنے طور پر کیا کر رہا ہوں۔ جو کچھ کر رہا ہوں اس کا کوئی نتیجہ بھی ہے یا نہیں؟ ہاں البتہ ایک بات ضرور تھی اور وہ یہ کہ اگر ادھر اسکندریہ میں یہ شخص مجھے نہ مل جاتا یعنی رحمان یزدانی تو نجانے مجھ پر کیا گزرتی۔ اس کے اثر و رسوخ اور اس کی اسکندریہ میں رہنے والوں کے بارے میں معلومات اس وقت میرے اس قدر کام آ رہی تھیں کہ میں دنگ رہ گیا تھا۔ واقعی کمال کی شخصیت تھی رحمان یزدانی کی بھی۔ اس قدر ذہین، اس قدر سمجھدار کہ تصور نہ کیا جا سکے۔ وہ لمحات بھی مجھے یاد تھے جب وہ میرے بابا جان اور سلطان چچا کے ساتھ ہمارے درمیان ہوا کرتا تھا۔ مگر اس وقت اس کی یہ کیفیت نہیں تھی۔ اب تو میں یقیناً موت سے بال بال بچ گیا تھا اور اب جبکہ میں نسبتاً محفوظ تھا اور پسینے پسینے ہو رہا تھا کہ میں جو زندہ ہوں، وہ چند خوشگوار اتفاقات کی بدولت ہے ورنہ میرا جو

کچھ ہوتا دنیا اس کا تماشہ دیکھتی۔ اب مجھے نہیں معلوم تھا کہ رحمان یزدانی نے اگلا منصوبہ کیا بنایا ہے۔ اس نے مارفین کے انجکشن مجھے دکھائے تھے۔ ظاہر ہے وہ انجکشنوں کو ہنری اسمتھ سے پوچھ گچھ کے لئے استعمال کرے گا۔

بہر حال جب ہم کمرے میں واپس پہنچے تو ہنری اسمتھ اسی طرح بستر پر نیم مردہ پڑا ہوا تھا۔ رحمان یزدانی نے کمرہ اندر سے مقفل کیا اور بستر کے سرہانے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میری نگاہ اس کے چہرے کی طرف اٹھی تو مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو رہا تھا۔ بہر حال اس نے میز پر سے پانی کا گلاس اٹھایا اور چلو بھر پانی اسمتھ کے منہ پر چھینٹے کے طور پر مارا۔ اسمتھ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں، رحمان یزدانی نے جیب سے وہ ڈبہ نکالا اور دونوں وائل اپنی ہتھیلی پر رکھ کر دور سے اسے دکھائے اور بولا۔

''اسمتھ، دیکھو یہ کیا ہے۔ میں تمہاری چیز لے آیا ہوں۔'' یہ بھی ایک کمال کی بات تھی۔ پتہ نہیں یہ انسان کیسی کیسی صفات کا مجموعہ ہے۔ میں نے دیکھا اسمتھ جو مردہ پڑا ہوا تھا، تڑپ کر اٹھنے کی کوشش میں تکیے پر دوہرا ہو گیا۔

''لے آئے...... لے آئے تم۔ کیا یہ تمہیں نوری نے دی ہیں؟''

رحمان یزدانی نے اسے گھور کر دیکھا اور بولا۔ ''کیوں، نوری تمہارا باپ ہے؟ یہ وائل تمہارے لئے خاقان لائے ہیں۔''

ہنری اسمتھ کی نظریں رحمان یزدانی کے ہاتھ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''آہ...... کتنے اچھے ہیں میرے دوست۔ لاؤ، یہ مجھے دے دو۔ میں مر رہا ہوں۔ میں مر جاؤں گا اگر یہ مجھے نہ ملی تو۔ لاؤ دے دو۔'' وہ زور لگا کر ذرا سا اٹھا اور مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔

''دے دو...... خدا کے واسطے یہ مجھے دے دو۔''

''ابھی نہیں میری جان، ابھی نہیں۔ جہاں اتنی دیر صبر کیا ہے وہاں تھوڑی دیر اور سہی۔ خاقان صاحب تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔''

''بعد میں کر لینا، یہ تو دے دو مجھے۔''

''نہیں ہنری، پہلے باتیں ہوں گی۔''

''آہ...... کیوں ستا رہے ہو مجھے؟'' وہ روہانسا ہو گیا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہر چیز کی کوئی قیمت ہوتی ہے۔ ہمارے تم سے کوئی تعلقات ہیں ہیں، کوئی رشتہ نہیں ہے ہمارے درمیان۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہر انسان ایک دوسرے ے لئے اسی وقت یہ سب کچھ کرتا ہے جب اس کا اپنا کوئی لالچ ہوتا ہے۔ تم ایسا کرو پہلے اری باتوں کے جواب دو۔ اس کے بعد تمہاری چیز تمہیں مل جائے گی۔''

ہنری نے اسے دیکھا اور پھر غصیلے لہجے میں کہا۔ ''دے دو مجھے۔ دے دو۔ کیوں تنگ کر ہے ہو حرام زادے، کتے۔ میں مر جاؤں گا۔ تمہیں میری موت کا احساس نہیں ہے؟''

''تو مر جاؤ۔'' رحمان یزدانی نے مٹھی بند کر کے کہا اور لاتعلقی سے فرش کی طرف دیکھنے ا۔ اسمتھ کا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر آگے کی طرف جھکا اور بولا۔

''رحم کرو...... رحم کرو میرے حال پر مسٹر...... مسٹر خاقان! اسے سمجھاؤ، مجھے یہ دلوا دو۔ یہ یوں مجھے......'' یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔ اس کی آواز میں سسکیاں پیدا ہو گئیں۔ میں اٹھا اور ں کے بستر کے قریب جا کھڑا ہوا۔

''ہنری! ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں، ہم تمہارے دوست ہیں۔ بڑی مشکل سے ہاری چیز لے کر آئے ہیں۔ مگر سنو ہم جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں وہ ہمیں بتا دو۔''

''آہ...... سنو تو سہی۔'' اس کی گردن آگے کی طرف ڈھلک گئی۔ کچھ دیر تک وہ اسی رح گردن جھکائے بیٹھا رہا، پھر بولا۔ ''دیکھو، جو کچھ تم پوچھو گے وہ میں تمہیں بتا دوں ا۔ یہ دے دو مجھے۔ بتا دوں گا۔'' پھر وہ گردن ہلا کر ایک طرف کو جھک گیا۔ رحمان یزدانی ی اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر اٹھایا اور چیخ کر کہا۔

''میں آخری بار پوچھ رہا ہوں اسمتھ! ہمیں ذاکر قباشی کے بارے میں ساری باتیں بتا گے تو یہ دونوں خوراکیں تمہیں مل جائیں گی۔ نہیں تو تم یہیں اس کمرے کے بستر پر ڈیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ گے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔'' اتنا سفاک تھا رحمان دانی کا لہجہ کہ مجھے اس پر حیرت ہوئی۔ میرے علاوہ بھی اپنا اپنا ایک مزاج رکھتے ہیں۔ ن کے لہجے نے اسمتھ پر اثر کیا۔ یا تو وہ بالکل مرنے کے قریب ہو رہا تھا یا پھر کوشش کر ے سرہانے سے ٹک کر بیٹھ گیا اور کمزور آواز میں بولا۔

''میں کسی ذاکر قباشی کو نہیں جانتا۔''

''کیا تم سلام نوری کو جانتے ہو؟''

''ہاں سلام نوری...... سلام نوری...... مگر ذاکر قباشی؟''

"وہی جسے تم سلام نوری کہہ رہے ہو، وہی ذاکر قباشی ہے۔ اس علاقے کا سب سے بڑا اسمگلر اور منشیات کا سوداگر۔" رحمان یزدانی نے کہا اور ہنری اسمتھ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ رحمان یزدانی پھر بولا۔ "تم اسے کب سے جانتے ہو؟"

"دو سال سے۔ مگر تم اس کے بارے میں مجھ سے کچھ نہیں پوچھو۔"

"کیوں؟"

"اسے پتہ چل گیا کہ میں نے تمہیں کچھ بتایا ہے تو وہ مجھے مار ڈالے گا۔"

"سنو ہنری اسمتھ! اس کی فکر نہ کرو۔ اس کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ یہ میں کہہ رہا ہوں، میں رحمان یزدانی۔ وہ اب تمہیں کبھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ میں اسکندریہ میں اکیلا نہیں ہوں، سمجھے۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔"

ہنری اسمتھ کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ وہ واقعی تکلیف میں تھا۔ وہ آہستہ سے بولا۔

"سنو رحمان یزدانی! تم آج تو مجھے میری خوراک دے دو گے مگر کل کی، اگلے ہفتے کی اور اگلے مہینے کی کون ضمانت دے گا؟ یہ تو عجیب شہر ہے۔ میں نجانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا ہوں۔ کسی نے مجھے گھاس نہیں ڈالی۔ قباشی یا سلام نوری وہ جو کوئی بھی ہے مجھے میری خوراک تو دیتا رہے گا۔ تمہارا کیا ہے، آج کے بعد تمہاری شکل بھی نظر نہیں آئے گی۔"

رحمان یزدانی ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اچھا سنو، اگر میں تمہیں ایک مہینے کا کوٹا ابھی اسی وقت دے دوں تو کیسا رہے گا؟ پھر تو ہماری تمہاری باتیں ہوں گی؟"

رحمان یزدانی نے کہا اور اسمتھ کی بجھی ہوئی آنکھوں میں جیسے روشنی جلنے لگی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر حریصانہ لہجے میں بولا۔

"لاؤ...... لاؤ...... ایک مہینے...... ایک مہینے کی خوراک۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔" مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ رحمان یزدانی کے پاس اس چھوٹے سے پیکٹ کے علاوہ اور کچھ بھی ہے۔ اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا پیکٹ نکالا اور اسے لاپرواہی سے بستر پر پھینک دیا۔ ہنری اسمتھ نے چیل کی طرح پیکٹ پر جھپٹا مارا تھا۔ وہ آگے کی طرف جھکا۔ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پیکٹ تک پہنچنے بھی نہیں پائے تھے کہ توازن بگڑ گیا اور وہ بستر پر منہ کے بل لڑھک گیا۔

"نہیں میری جان! اتنی جلدی نہیں...... اتنی جلدی نہیں۔ اتنی قیمتی چیز اتنی آسانی سے کیسے ملتی ہے۔" یہ کہہ کر رحمان یزدانی نے بستر پر پڑے پیکٹ کو اچک لیا اور واپس اپنے

کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ وہ چوہے بلی کی طرح ہنری اسمتھ سے کھیل رہا تھا اور ہنری اسمتھ کی شکل دیکھنے کے قابل تھی۔ اس نے کہا۔

"ایسا کرو مجھے ایک گولی ہی دے دو، میں سب کچھ بتا دوں گا۔" وہ حرام زادہ قباشی، وہ ہمارا دوست نہیں ہے۔ سنو، میں بتاتا ہوں، میں کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ مجھے اور میری بیوی کو وہ جواہرات کی اسمگلنگ میں استعمال کرتا ہے۔ دو برس پہلے ہمارا کاروبار بمبئی میں تھا۔ ہم ہندوستان سے پرانے نوادرات خریدتے تھے اور یورپ میں بڑی بڑی قیمت پر فروخت کرتے تھے۔ اس نے بھی ہم سے کئی مرتبہ سامان خریدا تھا۔ ایک دفعہ وہ ہمارے پاس آیا اور اس نے کانسی کی بہت سی مورتیاں خریدیں۔ اس نے ہمیں اس کی منہ مانگی قیمت دی اور پھر کہا کہ اگر ہم اس کا ساتھ دیں تو سال بھر میں اتنی دولت حاصل کر سکتے ہیں کہ ہزار زندگیاں ملیں تو بھی اس کا دسواں حصہ اکٹھا نہیں ہو سکتا۔ ہم نے اس کی بات سے دلچسپی لی تو اس نے بتایا کہ ان مورتیوں کو چابکدستی کے ساتھ کاٹ کر ان میں خفیہ خانے بنا دیئے جائیں گے اور ہیرے، یاقوت، زمرد اور دوسرے قیمتی پتھر اس میں بھر دیئے جائیں گے۔ پھر یہ مورتیاں یورپ میں مختلف پتوں پر پارسل کر دی جائیں گی۔ اس نے بتایا کہ منافع کی رقم کا آدھا ساجھا ہو گا۔ چوتھائی ہمیں پیشگی ملے گا اور چوتھائی مال پہنچ جانے کے بعد ملے گا۔ میں تو ذرا ہوشیار رہا تھا مگر وہ کمینی، وہ فوراً رضامند ہو گئی۔ میں اپنی بیوی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ لالچی عورت، آہ...... جس نے زندگی میں کبھی عورت کی بات مانی، میں نے اسے پنپتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ رضامند ہو گئی میں نے شروع شروع میں مداخلت کی مگر خیر سال بھر تک ہم نے بے حساب دولت کمائی اور اس دوران میں جو کچھ گنواتا رہا، ان میں میری بیوی بھی تھی۔ اس نے میری بیوی پر ڈورے ڈالے اور مجھے مارفین کا چسکا لگا دیا۔ سمجھ رہے ہو نا، اب میری بیوی اس کی داشتہ ہے اور میں اس کا غلام۔ ہندوستان اور انگلستان کے بینکوں میں ہمارے پاس بے تحاشہ دولت ہے مگر کس کام کی...... جہاز پر...... جہاز پر......" وہ رکا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا تو رحمان یزدانی نے کہا۔

"اسمتھ! جہاز پر ایک شخص قتل ہوا تھا۔ ہمیں اس کے بارے میں بتاؤ۔"

"ارے وہی پروفیسر احتشام۔ بیوقوف پروفیسر احتشام۔ اسے اسی شخص نے قتل کیا۔ اس کا نام تم ذاکر قباشی لے لو یا سلام نوری یا پھر ہیگ۔"

"کیوں قتل کیا؟"

"اصل میں پروفیسر، خاقان کو خبردار کر دینا چاہتا تھا۔"

"کس بات سے خبردار کرنا چاہتا تھا وہ خاقان کو؟" رمضان یزدانی نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ذاکر قباشی...... ذاکر قباشی اسے قتل کرنا چاہتا ہے، یعنی خاقان کو اس نے جہاز پر دیکھ لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انڈین کسٹمز کے آدمی ہیں اور جہاز پر ہی مال برآمد کرنا اور ہمیں پکڑنا چاہتے ہیں۔ اس نے بتایا تھا کہ خاقان اسے ہیگ کے نام سے جانتا ہے اور کسی پرانی دشمنی کی وجہ سے اسے نقصان پہنچانے کے لئے جہاز پر سوار ہوا ہے۔ خاقان کے خلاف منصوبہ تیار کرنے کے لئے ہم لوگ رات کو پروفیسر کے کیبن میں داخل ہوئے تھے۔ وہ حرام زادہ میری ہی کیبن میں سوتا تھا اور شام کو کافی لاؤنج میں مجھے میری خوراک پہنچایا کرتا تھا اور آدھی رات گزرنے کے بعد میرے کیبن میں آجاتا تھا۔ صبح میری آنکھ کھلتی تو میں فرش پر پڑا ہوتا اور وہ میری بیوی کے ساتھ۔ آہ...... میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کتنی ہی راتوں میں جاگتا ہوتا تھا اور...... اور......"

اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ رحمان یزدانی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا اور پھر بولا۔

"تختی کا کیا چکر ہے؟"

"تختی...... کون سی تختی؟" اس نے کہا۔

"وہی مصری خزانے والی تختی۔"

"وہ تو...... وہ تو اسی ذاکر قباشی کی حرام زدگی تھی۔ ہیروڈوٹس سے یادداشتوں کے واقعات لے کر اس نے احتشام کو یہ پوری کہانی سنائی تھی۔"

یہ تمام باتیں ہو رہی تھیں اور میں اس کے ایک ایک لفظ پر غور کر رہا تھا لیکن اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے کہا۔ "پروفیسر احتشام کو ایسی کیا مجبوری تھی کہ اس نے مجھے بہکانے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا؟"

اسمتھ میری طرف گھوما۔ اس نے کہا۔ "اس نے قاہرہ میں پروفیسر کی نوجوان بیوی کو روک رکھا ہے۔"

"کیا؟" میں اچھل پڑا۔

"ہاں۔ اس نے اس کی بیوی کو روک رکھا ہے۔"

"کیوں؟"

"پروفیسر نے مصر میں نوادرات کی کھدائی کے لئے قباشی سے قرض لیا تھا۔"

"پھر؟"

"مہم ناکام ہو گئی۔ قباشی نے رقم کی واپسی کا تذکرہ کیا۔ پروفیسر اتنی بڑی رقم کہاں سے دیتا۔ وہ اور اس کی بیوی ارسلا قاہرہ سے بھاگے مگر......"

"ارسلا......؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔"

"کیا یہ اس کی بیوی کا نام ہے؟"

"ہاں۔ پروفیسر نے جو تصویر دکھائی تھی وہ ارسلا کی ہی تھی۔"

"کمال ہے۔ پھر؟"

"وہ دونوں قاہرہ سے بھاگنے میں تو کامیاب ہو گئے مگر قباشی نے انہیں لیبیا میں جا پکڑا اور ارسلا کو یرغمال کے طور پر وہاں سے قاہرہ منتقل کر دیا گیا اور وہ ہم لوگوں کو ہندوستان لے گیا۔"

"کیوں؟"

"وہ ہندوستان سے جواہرات لانا چاہتا تھا۔ پروفیسر کو اس لئے ساتھ لے کر گیا تھا کہ اس کے گرگوں نے تبت میں بدھ مت کی کوئی قدیم تختی چرائی تھی اور قباشی اس کا سودا کر رہا تھا۔ پروفیسر کا کام یہ تھا کہ وہ اس تختی پر لکھی تحریر پڑھ کر سنائے۔"

"اس کے بعد قباشی نے وہ تختی بیچ دی؟"

"نہیں، سودا نہیں ہوا۔"

"تختی اب کہاں ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اسی کے پاس ہے۔ امریکی یونیورسٹی کے ایک ہندو پروفیسر سے اس سلسلے میں بات چیت ہو رہی ہے۔ پتہ نہیں کیا ہوا، بے چارہ پروفیسر احتشام اب اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے اسے مار دیا۔ آپ یقین کریں خاقان وہ ایک پتھر سے کئی شکار کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو پروفیسر سے اسے نجات مل جاتی ہے اور دوسرا پروفیسر کی لاش کے پاس تمہاری موجودگی سے تم پولیس کے شکنجے میں پھنس جاتے۔ یہی اس کا منصوبہ تھا۔"

میں حیرت کی تصویر بنا اسمتھ کے انکشافات سن رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ پروفیسر احتشام بے بھی اس شخص کی سفا کی کا شکار ہوا تھا۔ چند لمحوں کے اندر اندر ہیگ کا سارا کھیل

میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ مجھے اب پتہ چلا تھا کہ اس نے مجھے جہاز پر دیکھ کر فوراً پہچان لیا تھا اور پھر مجھے راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بھی تیار کر لیا تھا۔ اس نے بے چارے پروفیسر کو مجبور کیا کہ وہ مصر کے خزانے کا فرضی قصہ سنا کر صحرا میں لے جانے پر تیار کرے اور پھر وہاں آسانی سے مجھے ٹھکانے لگا دے۔ ادھر میں پروفیسر کے جھانسے میں آ گیا۔ لیکن پروفیسر نیک نفس آدمی تھا۔ اس نے یہ غلطی نہیں کی کہ اس انگریز جوڑے کے سامنے ہی مصری خزانے کی فرضی تختی کا قصہ مجھے سنایا اور اپنے کیبن میں آنے کی دعوت دی۔ میں ادھر کینٹین کی طرف اور پروفیسر اپنے کیبن کی طرف گیا۔ ادھر اسمتھ کی بیوی نے ہیگ کو بتا دیا کہ پروفیسر، خاقان کو خبردار کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہیگ نے فوراً ہی دوسرا منصوبہ تیار کر لیا۔ اس نے پروفیسر کو اسی کے کیبن میں ہلاک کر دیا اور میری گھات میں بیٹھ گیا کہ جونہی میں پروفیسر کے کیبن میں داخل ہو جاؤں، وہ باہر سے دروازے بند کر دے یا کوئی اور ترکیب کرے۔ مگر میری خوش قسمتی یا اس بھوج پتر کا کارنامہ تھا کہ میں نے پروفیسر کی پشت پر اٹھے ہوئے ہاتھ کا منظر دیکھ لیا۔ دوڑتا ہوا جب پروفیسر کے کیبن کی طرف جا رہا تھا تو بیرے سے ٹکرا گیا۔ اور بیرا ٹوٹے ہوئے برتن اکٹھا کرنے کے لئے بہت دیر تک راہداری میں رہا۔ اگر راہداری سنسان ہوتی تو پروفیسر کی لاش کے ساتھ مجھے بند کرنے کے بعد ہیگ جہاز کے کپتان کو اطلاع دیتا اور اس کے بعد میں بغیر کسی کوشش کے پھنس جاتا اور ہیگ اپنے دو مخالفوں سے نجات پانے کے بعد آرام سے اتر جاتا۔ آہ...... کیا ہی خوفناک انسان ہے یہ۔ ذہنی طور پر کس قدر طاقت ور۔

بہرحال ہنری اسمتھ کو جو کچھ بھی معلوم تھا اس نے مجھے اور یزدانی کو بتا دیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہیگ اسے اس لئے سزا دے رہا ہے کہ جہاز پر اس نے اپنی بیوی سے جھگڑا کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اسکندریہ پہنچ کر طلاق کی کارروائی کرے گا۔

بہرحال یہ پوری داستان تھی اور اس کے علاوہ ہنری سے اور کچھ معلوم کرنا ذرا مشکل ہی تھا۔ چنانچہ رحمان یزدانی نے اسے اس کی خوراک دے دی۔ اس کے چہرے کے رنگ بدلنے لگے تھے۔ اس نے سرور میں بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے مجھے اور یزدانی کو دیکھا۔

"تم بہت اچھے دوست نکلے۔ بہت ہی اچھے۔ یہ بتاؤ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں کیا کروں؟"

"کھانا کھاؤ۔ اور کیا کرو گے۔" رحمان یزدانی کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر وہ بولا۔ "ہنری! تم

دو تین دن اسی کمرے میں رہو، بالکل باہر نہ نکلو۔ وہی بیرا جو تمہیں باتھ روم سے یہاں تک لایا ہے تمہیں یہاں ضرورت کی تمام چیزیں پہنچاتا رہے گا۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں قباشی سے حساب چکانا چاہتا ہے۔ اسے اگر ذرا بھی شبہ ہو گیا کہ تم نے اس کے جرائم کی داستان کسی کو سنا دی ہے تو وہ تمہیں بلا تکلف مار دے گا۔ اسے یہی سمجھنے دو کہ مارفین کی تلاش میں تم کسی جرائم پیشہ گروہ کے ہتھے چڑھ گئے ہو۔"

ہنری نے بے بسی سے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے تھے۔ بہرحال رحمان یزدانی نے اسے اچھی خاصی رقم دی اور اس کے بعد اسے آخری ہدایت دے کر وہاں سے باہر نکل آیا۔ پھر ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک عجیب سا تاثر ہم دونوں کے ذہنوں پر تھا۔ ہیگ یا جو بھی اس کا نام ہو ذاکر قباشی یا سلام نوری، اب ہماری زد پر تھا۔ رحمان یزدانی کے گروہ کے بارے میں مجھے صحیح طرح نہیں معلوم تھا کہ اس کا گروہ کتنا طاقتور ہے۔ پھر بھی ہوٹل میں اسے جو اہمیت دی گئی تھی اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس قدر با اثر آدمی ہے۔ اچانک ہی رحمان یزدانی نے گاڑی سڑک کے کنارے روکی اور انجن بند کر دیا۔ میں چونک کر اسے دیکھنے لگا تو اس نے کہا۔

"خاقان! آج کی رات واقعی اتفاقیہ طور پر بڑی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ ذاکر قباشی اور اس کے دست راست ذکری کو یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ جہاز سے فرار ہونے کے بعد تم پر کیا بیتی۔ لیکن وہ لوگ اسکندریہ کو اپنی سلطنت سمجھتے ہیں۔ خاص طور سے ذاکر قباشی۔ تم دیکھو وہ کتنی آزادی سے اپنی داشتہ کو لئے گھوم رہا ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ خاقان جمشیدی کو میں نے جہاز سے فرار ہونے میں مدد دی ہے۔ ذرا کچھ دیر انتظار کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

"کہاں......؟"

"یہاں میرا ایک اسٹیشن ہے۔ میں اپنے کچھ ساتھیوں کو ان حالات کے بارے میں اطلاع دے کر آ رہا ہوں۔"

"او کے۔" میں نے کہا اور وہ گاڑی سے اتر کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ پانچ منٹ...... دس منٹ...... پندرہ منٹ...... میں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تو گاڑی سے اتر کر سڑک پر آ گیا اور سڑک کے کنارے لگی گھاس پر ٹہلنے لگا۔ اندھیرے میں دور دور تک کسی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ میری الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔

ابھی میں سوچوں میں ہی گم تھا کہ یکایک مجھے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی اور میں چونک کر پلٹا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں ایک زبردست چھناکا ہوا...... میرے سامنے سیوک سندھورتی کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیشانی پر رکھے اور جھک گیا۔

”بودھی ستو...... پرکھوں نے جیسا بتایا ویسا ہی ہوگا۔ آپ نے اپنا آپ پہچان لیا۔ سچائی اور بھلائی کا راستہ آپ نے دیکھ لیا۔ ایک بات ذہن میں رکھئے، اشبھ بھاؤنائیں آپ کو کہیں سے کہیں لے جاسکتی ہیں اور گیان کے راستے سے ہٹا سکتی ہیں۔ مگر مہتر بدھ کوئی بدکردار شخص نہیں ہوسکتا۔ اب آپ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔ ایک بات یاد رکھئے، آج رات آپ کو اس کے گھر جانا ہے جو یہاں اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھتا ہے، میرا مطلب ہے ہشمان ذکری۔ کہیں اور نہیں جائیں گے آپ۔ وہاں آپ کو پتھر کی وہ تختی ملے گی جو بڑوں نے تبت کے مہان دھار میں سنبھال رکھی تھی، پھر چور اسے اڑا لائے۔ اس کی کہانی کچھ اور ہے جو آپ تک نجانے کیسے کیسے ذریعے سے پہنچائی گئی ہے۔ یاد رکھئے بودھی ستو! آپ کو ہشمان ذکری کے گھر جانا ہے۔“

میں عجیب سے انداز میں اس کی یہ باتیں سن رہا تھا۔ اچانک اس نے گردن اٹھا کر دور دیکھا اور اسے بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ اس نے پھر سینے پر ہاتھ رکھا، گردن خم کی اور بولا۔ ”میں چلتا ہوا بودھی ستو...... اتھا پرموتھا۔“ یہ کہہ کر وہ مڑا اور اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

آنے والے کوئی پندرہ بیس آدمی تھے جو آہستہ آہستہ چل کر میرے نزدیک پہنچ گئے۔ ان کے لباس صاف اور ڈھیلے ڈھالے تھے۔ میں نے حیرانی سے دیکھا، رحمان یزدانی ان میں نہیں تھا اور ان کے چہرے کے تاثرات عجیب سے تھے۔ ایک لمحے کے اندر مجھ پر وحشت سوار ہوگئی۔ میں نے وحشت کے عالم میں یہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سوچا مگر دوسرے لمحے آنے والوں نے میرے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ایک بار پھر میں نے مور کی طرح گردن اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا، ان آدمیوں کے سوا سڑک پر دور دور تک کوئی نہیں تھا۔

***

میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ وہ لوگ کسی اچھے ارادے سے میرے گرد نہیں پھیلے ہیں۔ میں بالکل نہتا تھا۔ اگر مسلح بھی ہوتا تب بھی اتنے سارے افراد سے تنہا نمٹنا آسان کام نہیں تھا۔ سڑک کے لیمپوں کی روشنیاں آنے والوں کے چہروں پر اپنا عکس ڈال رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں اور پیشانی کا کچھ حصہ کھلا ہوا تھا باقی چہرہ رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک لمحے میں مجھے یہ بھی اندازہ ہوگیا کہ ان میں سے ہر شخص مسلح ہے۔ پھر ان میں سے ایک آدمی جو خاصا لمبے قد و قامت کا مالک تھا، ریوالور تانے آہستہ آہستہ میری جانب بڑھنے لگا۔ باقی دوسرے حلقہ بنائے ساکت کھڑے تھے۔ آنے والا میرے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس نے انتہائی نرم و ملائم لہجے میں مجھ سے کہا۔

”سیّدی خاقان! ہمیں ہدایت دی گئی ہے کہ آپ کو عزت و احترام کے ساتھ لے آئیں۔ ہماری خواہش ہے کہ کوئی ناخوشگوار بات نہ ہونے پائے۔ اگر آپ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلنا منظور کرلیں تو ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے اور اس میں آپ کا فائدہ بھی ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں بڑی مجبوری کے عالم میں ہم یہ بات کہہ رہے ہیں کہ ہمیں دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔“

اس نے اپنے ریوالور کو جنبش دی اور میں نے وحشت سے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ ایک لمحے کے لئے بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ لیکن یہ اندازہ ضرور ہورہا تھا کہ یہ عام لٹیرے یا راہزن نہیں ہوسکتے کیونکہ انہوں نے مجھے میرے نام سے مخاطب کیا تھا۔ لازمی امر ہے کہ یہ میری نقل و حرکت کی نگرانی کرتے رہے ہوں گے۔ صرف ایک ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ یہ ہیگ کے ساتھی ہوں گے۔ اس وقت اگر میں ان سے بھڑ جانے کی دلیرانہ حماقت کروں تو سچ مچ کی حماقت ہوگی اور اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ایک لمحے میں فیصلہ کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کرکے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ رحمان یزدانی اس وقت دھوکا کھا گیا۔ وہ یہاں اپنے

ساتھیوں کی موجودگی کی خبر دے کر گیا ہوا تھا، یقیناً یہیں آس پاس اس کے گروہ کے افراد بھی موجود ہوں گے۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ رحمان یزدانی کے اپنے علاقے میں دشمنوں نے مجھے گھیر لیا۔

میں نے ہاتھ اٹھائے ہوئے آخری بار اندھیرے میں اس طرف دیکھا جدھر رحمان یزدانی گیا تھا۔ دور دور تک سڑک پر کوئی موجود نہیں تھا۔ ریوالور والے لمبے تڑنگے مصری نے میرے پیچھے آ کر جھٹکے سے میرے دونوں ہاتھ پکڑے اور انہیں پشت کی طرف موڑ دیا۔ اس کے انداز میں شدید جارحیت تھی۔ پھر وہ مضبوطی سے میرے ہاتھوں کو ڈوری سے باندھنے لگا۔ اس کے ایک اور ساتھی نے آگے بڑھ کر میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور اس کے بعد منہ پر رومال باندھ کر کس دیا۔ غصے اور بے بسی نے میرے سارے وجود کو لرزا دیا۔ مگر میں جانتا تھا کہ اس وقت کچھ بھی کرنا موت کو آواز دینے کے مترادف ہوگا۔

آخر کار وہ لوگ مجھے دھکیلتے ہوئے ایک طرف لے چلے۔ میں اپنے قدموں ہی سے چل رہا تھا لیکن بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ سڑک پار کرنے کے بعد ایک ڈھلان آیا اور وہ مجھے ڈھلان سے نیچے اتارنے لگے۔ ڈھلان کا اختتام کچی زمین پر ہوا تھا اور اس کچی زمین پر اتنے بہت سے لوگوں کے چلنے کی آواز بالکل نہیں ہو رہی تھی۔ تھوڑا سا فاصلہ اسی طرح طے کیا گیا اور اس کے بعد سڑک آ گئی۔ سڑک پر ایک چھوٹا سا پُل بنا ہوا تھا۔ وہ لوگ مجھے لے کر اس پل کے نیچے پہنچے۔ اغوا کرنے والوں میں سے کسی نے میری پسلی میں اپنا پستول چبھو کر کہا۔

''بیٹھ جاؤ...... بیٹھ جاؤ...... نیچے بیٹھ جاؤ۔''

میں ان کی ہدایت پر عمل کرنے لگا تو وہ سب سکون سے میرے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کوئی خشک نالا تھا۔ نالے کا ریتلا فرش توقع کے خلاف صاف شفاف تھا۔ اوپر اینٹوں کی محراب تھی اور پھر پختہ سڑک۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ ہم اس جگہ سے جہاں رحمان یزدانی کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی کوئی دو فرلانگ نکل آئے تھے اور یہ فاصلہ تقریباً پندرہ بیس منٹ میں طے کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رحمان یزدانی کو گئے ہوئے کافی دیر گزر گئی۔ پتہ نہیں یہ لوگ یہاں بیٹھے کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں؟

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اوپر سڑک پر ایک کار کی آواز سنائی دی اور وہ اس قدر برق رفتاری سے گزری کہ اپنی آواز ایک لکیر کی شکل میں چھوڑتی ہوئی چلی گئی۔ ایک لمحے تک کچھ

سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن دوسرے لمحے میری سمجھ میں آیا۔ کسی نے اندھیرے میں سرگوشی کی۔

''ہاں...... وہی تھا۔ اُسی کی گاڑی تھی یہ۔''

''بکواس بند کرو۔ تم سے خاموش نہیں رہا جا سکتا؟'' اسی لمبے تڑنگے آدمی کی غرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''مگر وہ تو چلا گیا'' دوسری آواز نے کہا۔

''وہ ابھی واپس آئے گا بیوقوف۔ انتظار کرو۔''

کچھ دیر اور گزری اور اس کے بعد دوبارہ گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی اور یہ آواز مخالف سمت سے آئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس لمبے آدمی کا کہنا بالکل درست ثابت ہوا۔ بات میری سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔ ہوسکتا ہے یہ رحمان یزدانی ہی ہو جو مجھے تلاش کرتا پھر رہا ہو۔ گاڑی ایک بار پھر پلیا سے گزر گئی تھی۔ اس کے بعد پانچ دس منٹ تک سناٹا طاری رہا۔ اسکندریہ کا یہ رہائشی علاقہ ضرورت سے زیادہ ہی ویران تھا۔ میں اندھیرے میں نظریں گاڑھے آہٹوں پر کان لگائے ان لوگوں میں گھرا بیٹھا تھا اور کسی ایسے واقعے کا منتظر تھا جو مجھے ان لوگوں کے قبضے سے رہائی دلا دے۔ کوئی ایسا راہ گیر جو ادھر سے گزر رہا ہو۔ بہرحال یہ ایک احمقانہ خواہش تھی۔ نجانے کیوں میرے دل میں یہ احساس تھا کہ کچھ ہونا چاہئے اور میں کسی عمل کا منتظر تھا۔ میرے دشمن بھی دم سادھے بیٹھے تھے۔ ایک بار پھر ہم نے گاڑی کے انجن کی آواز سنی۔ لیکن اس بار کئی گاڑیاں تھیں۔ غالباً دو یا تین گاڑیاں تیزی سے گزر گئیں اور پھر کچھ ہی لمحوں کے بعد ایک شخص کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ اوپر سے نیچے آ رہا تھا۔ قریب آ کر اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہلی...... وہ تین گاڑیوں میں بھر کر اس طرف گئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ میدان صاف ہے۔ چلو چلیں۔'' وہ سب کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور میری پشت میں ریوالور لگائے ہوئے مجھے پلیا سے نکال کر سڑک پر لے آئے۔ ان میں سے ایک نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز کے ساتھ ہی ایک تاریک گلی میں موٹر کار کا انجن اسٹارٹ ہوا۔ میں نے گھوم کر دیکھنے کی کوشش کی تو ریوالور والے نے اپنے ریوالور کی نال سختی سے میری پشت میں چبھو دی۔

''دیکھو، تعاون کرو ہم سے۔ ورنہ تمہاری موت بھی ہمارے لئے مشکل نہیں ہوگی۔ آرام سے وہ ہر عمل کرتے رہو جس کی ہم تمہیں ہدایت کرتے رہیں۔ ورنہ گولی چلانے میں

اب کوئی تکلف نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ تمہارے حمایتی جا چکے ہیں۔"

اس کا مطلب ہے کہ وہ تین گاڑیاں جو ابھی سڑک پر سے گزری تھی، رحمان یزدانی کے ساتھیوں کی تھیں اور وہ لوگ میری تلاش میں نکلے ہیں۔ ممکن ہے وہ ہوٹل پہنچ کر ہیگ کو گھیر لیں اور یزدانی میرا پتہ چلانے کے لئے اس پر تشدد کرے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہیگ وہاں ملے گا ہی کیوں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب تک یہ شبہ دل میں تھا کہ ان لوگوں کو یہ نہیں پتہ چل سکا ہے کہ میں رحمان یزدانی کی تحویل میں ہوں لیکن اب یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ رحمان یزدانی بھی روشنی میں آ گیا ہے۔ میں اس وقت جن لوگوں کے قبضے میں تھا وہ یقیناً ہیگ کے بھیجے ہوئے تھے اور انہیں یہاں بھیج کر وہ ہوٹل میں لمحے بھر کو نہیں رکا ہو گا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کو میرے بارے میں کس طرح معلوم ہوا؟ آہ...... کیا حیران کن اور پراسرار واقعات تھے۔ میرا ذہن سوچ سوچ کر ماؤف ہوا جا رہا تھا۔

پھر کچھ دیر کے بعد اندھیرے میں سے ایک گاڑی نمودار ہوئی اور ہمارے برابر آ کر کھڑی ہو گئی۔ گاڑی کا دروازہ کھلا، پہلے ایک شخص گاڑی میں بیٹھا پھر مجھے دھکا دیا گیا اور اس کے بعد تیزی سے وہ سب کے سب گاڑی میں بھر گئے۔ کافی بڑی گاڑی تھی پھر بھی دس بارہ آدمیوں کے لئے جگہ نکالنا آسان کام نہیں تھا۔ وہ لوگ اوپر تلے بیٹھ گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے گاڑی کے دروازے بند کئے اور شیشے چڑھا دیئے اور پھر ایک شدید جھٹکے کے ساتھ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ کچھ دیر تک یہ اسی شاہراہ پر چلتی رہی۔ پھر ایک چوراہے سے گزری اور ایک چھوٹی سی سڑک پر مڑ گئی۔ شاید وہ راستوں کی بھول بھلیوں کو خاص طور سے استعمال کر رہے تھے تاکہ سمتوں کا پتہ نہ چل سکے۔ یہاں تک کہ گاڑی آبادی سے کافی دور نکل گئی۔ سڑک ختم ہو گئی اور اب ریتلا چٹیل میدان تھا جس سے گاڑی گزر رہی تھی۔ یہاں رفتار خود بخود سست ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس ریتلے میدان کو عبور کر کے آخر کار گاڑی ایک پختہ سڑک پر آ گئی اور کچھ دور چلنے کے بعد آخر کار اس سفر کا اختتام ہوا اور وہ ایک کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی تھی۔ میں اس وقت کئی آدمیوں کے بیچ میں پھنسا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے گردن گھما کر میں نے دیکھا کہ یہ ایک بہت بڑا احاطہ ہے۔ اس احاطے کی دیواریں کافی بلند تھیں۔ ادھر کمپاؤنڈ میں نخلستان کا سا سماں تھا۔ بلند و بالا کھجوروں کے جھنڈ کے جھنڈ بکھرے پڑے تھے۔ روش کے برابر گھاس کے قطعے تھے مگر نیم تاریکی میں یہ قطعے پورے طور پر نظر نہیں آ رہے تھے۔

گاڑی رکی تو میں نے دیکھا کہ بڑا پُر فضا باغ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ گاڑی پتھر کی ایک اونچی دیوار کے پاس رکی تھی۔ آخر کار وہ خود بھی گاڑی سے اترے اور مجھے بھی اتارا گیا۔ پھر وہ لوگ مجھے اسی بے دردی سے دھکیلتے ہوئے ایک چھوٹے سے دروازے کے پاس لے گئے۔ یہاں ایک مسلح آدمی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے چابیوں کا گچھا نکالا اور تالہ کھول دیا۔ دروازے سے گزر کر ہمیں ایک تنگ گلی نظر آئی۔ یہاں دیواروں میں لوہے کی جالیوں کے پیچھے کم طاقت کے بلب لگے ہوئے تھے جن کی ہلکی روشنی میں یہ راستہ بڑا ڈراؤنا اور پراسرار لگ رہا تھا۔ کچھ دور جا کر ہمیں دائیں طرف مڑنا پڑا اور پھر ایک بڑے دروازے سے اس جیل نما عمارت میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک راہداری تھی جو دور تک چلی گئی تھی اور بالکل ویران پڑی تھی۔ عمارت کی چھت اتنی اونچی تھی کہ چھت سے لٹکے ہوئے بلب راہداری کو پوری طرح روشن کرنے سے قاصر تھے۔ اتنے بہت سے لوگوں کی چاپ سے راہداری میں گونج پیدا ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے کسی زیر زمین مقبرے میں لے آیا گیا ہو۔ نجانے میرے اندر ایک احساس سا کیوں ابھر رہا تھا۔ یہ احساس تھا کہ یہ لوگ مجھے آخر کار یہاں قید کر کے چلے جائیں گے اور میں بھوک، پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں گا۔

راہداری کے سرے پر ایک لوہے کا جنگلا نظر آیا تھا جس کے بعد نیچے ایک زینہ چلا گیا تھا۔ یہ کسی تہہ خانے کا راستہ تھا۔ کوئی دس سیڑھیوں کے بعد سیلا ہوا فرش آ گیا۔ ایک بار پھر یہاں سے راستوں کی بھول بھلیاں شروع ہو گئی تھیں۔ پُر پیچ راستوں میں خبر نہیں یہ مجھے کتنی دیر تک چلاتے رہے۔ دائیں بائیں مڑتے ہوئے میں سمتوں کو بھول چکا تھا۔ آخر کار یہ زمین دوز بھول بھلیاں ختم ہوئیں اور پھر ایک صحن جیسی جگہ نظر آئی۔ اس پورے صحن میں پتھر کا فرش تھا اور چاروں طرف محراب دار دروازے بنے ہوئے تھے۔ یہاں پہنچ کر یہ لوگ منتشر ہو گئے۔ مجھے لانے والے تمام ہی افراد کسی نہ کسی دروازے سے چلے گئے تھے۔ بس وہ لمبا تڑنگا سرغنہ جسے ہلی کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ رک گیا تھا۔

"آؤ......" اس نے بدستور اپنی پاٹ دار آواز میں کہا اور اس کے بعد ویسے ہی ایک محراب میں داخل ہو گئے۔ اندر پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی پرانا اصطبل ہے۔ دیوار میں لوہے کے بڑے بڑے کنڈے لگے ہوئے تھے جیسے جانوروں کو باندھنے کے لئے لگائے جاتے ہیں۔ اس محراب میں ایک اندرونی برآمدے کے بعد چار کوٹھڑیاں تھیں جن کے چوبی دروازوں میں لکڑی کی چھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہلی بدستور مستعد تھا اور اب وہ پستول تانے

میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ دوسرے آدمی نے زور سے دروازہ کھولا اور اس کے بعد ہلی نے کہا۔

''تمہارے ہاتھ کھول رہا ہوں۔ ہوش وحواس قائم رکھنا۔ زندگی کھونے کے لئے نہیں ہوتی۔ جبکہ ہمیں زندگی لینے کی کافی مشق ہے۔ بہتر یہ ہے کہ موت کا فاصلہ کم نہ کرو۔''

اس کی یہ چھوٹی سی تقریر میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بہرحال میں نے کوئی عمل نہ کیا۔ پہلے انہوں نے میرے ہاتھ کھولے پھر منہ پر کسا ہوا رومال بھی کھول دیا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں تھکے تھکے قدموں سے اندر چلا گیا تو ان لوگوں نے دروازہ بند کر دیا۔

یہاں آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ جس کوٹھڑی میں مجھے لایا گیا ہے اس کے دروازے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی بنی ہوئی تھی جس میں آہنی سلاخیں لگی تھیں۔ برآمدے کی زرد روشنی یہیں سے اندر آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ کوٹھڑی میں مکمل تاریکی تھی۔ کوٹھڑی کے فرش پر ایک ترپال بچھی ہوئی تھی۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ کوئی روایتی قسم کا قید خانہ ہے۔ بہت سے افسانوں اور داستانوں میں، میں نے قید خانوں کی منظرکشی پڑھی تھی۔ لکھنے والوں یا سنانے والوں نے شاید اسی کوٹھڑی کا حال بیان کیا ہوگا۔

میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ڈھیر تک پہنچا اور اس کے اوپر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ چند گھنٹوں پہلے میں رحمان یزدانی کے ساتھ ہیگ اور ہشمان ذکری پر حملے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ مگر اب صورتحال بدل گئی۔ لیکن اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اسکندریہ میں ان لوگوں کے ہاتھ کس قدر وسیع ہیں۔ یقینی طور پر ان کا گروہ رحمان یزدانی کے گروہ سے زیادہ طاقتور ہے۔ رحمان یزدانی اپنی دانست میں بڑی چالاکی سے کام لے رہا تھا اور ہم نے ہنری اسمتھ کو اسی ہوٹل میں چھپا کر اپنی طرف سے بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ مگر شاید ہیگ ہماری نقل وحرکت کی برابر نگرانی کر رہا تھا۔ ہم اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہے تھے اور یہی ہماری غلطی تھی۔ اگر ہم اس قدر مطمئن نہ ہو جاتے تو اتنی آسانی سے ان لوگوں کے شکنجے میں نہیں پھنس سکتے تھے۔

میں نے بیٹھے بیٹھے ریڈیم کے ڈائل والی گھڑی میں وقت دیکھا، ڈھائی بجنے والے تھے اور صبح ہونے میں ابھی دیر تھی۔ کچھ دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کوٹھڑی کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازے پر کان لگا کر باہر کی آوازیں سنیں، ہر طرف مکمل خاموشی تھی۔ پہلے تو یہ لگا جیسے باہر کوئی بھی نہیں ہے۔ مگر پھر کچھ دیر کے بعد دور سے

آہٹیں سنائی دیں اور پھر باتیں کرنے کی مدھم مدھم آوازیں۔ غالباً دو آدمی آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ پتہ نہیں ان کا رخ اس طرف ہے یا نہیں۔ اگر وہ ادھر ہی آ رہے ہیں تو میرا دروازے کے پاس کھڑا ہونا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ میں دوبارہ لیٹ گیا۔ اگر وہ اس طرف آ رہے ہیں تو مجھے یہ تاثر دینا چاہئے کہ میں نے اپنی اس قید کو قبول کر لیا ہے۔ میں نے آنکھیں بھی بند کر لیں اور قدموں کی چاپ اور آنے والوں کی آوازوں پر کان لگا دیئے۔ میرا اندازہ درست تھا، وہ سیدھے میری ہی کوٹھڑی کی طرف آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے سلاخ دار کھڑکی سے ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی اور اس روشنی نے میرے چہرے کا احاطہ کر لیا۔

''یہی ہے۔ لیکن کیا یہ بے ہوش ہے؟'' ایک لمحے کے اندر یہ آواز میرے کانوں کے ذریعے ذہن تک پہنچی اور ذہن نے زبان کو اس کا نام دے دیا۔ یہ ہشمان ذکری تھا۔

''بے ہوش تو نہیں ہو سکتا جناب! یا تو سو رہا ہے یا سوتا بن گیا ہے۔'' دوسری آواز ہلی کی تھی۔ اس شخص کی جو مجھے اغوا کر کے یہاں تک لایا تھا اور غالباً اس گروہ کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا۔

ذکری نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، یہاں پہرے لگا دو۔ سیّدی ذاکر قباشی صبح اس سے بات کریں گے۔''

پھر میں نے ان دونوں کی واپسی کی چاپ سنی۔ زمین دوز صحن میں انہوں نے زور سے کسی کو پکارا، کچھ کہا اور خاموش ہو گئے۔ پھر ایک اور آدمی میری کوٹھڑی کی طرف چل پڑا۔ آنے والے نے اندر روشنی ڈالی اور بدمزاجی کے ساتھ منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا دروازے سے ہٹ گیا۔ پھر نپے تلے قدموں سے اس نے کوٹھڑیوں کے سامنے مختصر برآمدے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ غالباً کوئی ضرورت سے زیادہ جلا سڑا آدمی تھا۔ میں کوئی آدھے گھنٹے تک اپنی جگہ پر پڑے پڑے اپنی حالت پر غور کرتا رہا۔ اس بار ان عیار قاتلوں کے شکنجے میں بری طرح جکڑا گیا ہوں اور اب اسکندریہ کے نواح میں کئی ایکڑ پر بنے ہوئے اس محل کے تہہ خانے میں قید ہوں۔ یہاں سب ہی میری جان کے دشمن ہیں۔ ایک بھی دوست نہیں ہے۔ اور پھر صبح قباشی، ہیگ جو کچھ بھی اس کتے کا نام ہے مجھے اس طرف دیکھنے آئے گا جیسے کوئی قصائی چھری چلانے سے پہلے بکرے کو دیکھتا ہے اور اس کے بعد شاید مجھے قتل ہی کر دیا جائے اور اسی تہہ خانے کی بھول بھلیوں میں گاڑھ دیا جائے۔ یہ تو کچھ نہ ہوا۔ کیا موت کی

یہی شکل ہوتی ہے؟ ایک بے نام سے کیڑے کو پیروں تلے روند دیا جاتا ہے اور پھر اسے کوئی مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ انسان اور کیڑے کی موت میں اتنا فرق تو ہونا چاہئے۔

صبح کے تین بجے تھے۔ میں نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور اپنے آپ کو حوصلہ دینے لگا کہ چاہے کچھ بھی ہو، اتنی آسانی سے ان لوگوں کے ہاتھوں نہیں مارا جاؤں گا۔ اگر انہی اسمگلروں اور قزاقوں کے ہاتھوں میری موت لکھی ہے تو ان میں سے کم از کم دو تین کو مرنے سے پہلے ٹھکانے لگاؤں گا۔ کاش! ہیگ سے بدلہ لیا جا سکتا اور کاش میں ہشمان ذکری کا گلا گھونٹ کر اسے ختم کر سکتا۔ یہ تمام خیالات صرف کاش سے پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ کاش تو ایک حسرت بھرا لفظ ہے۔ صورتحال کا جائزہ لے کر کچھ کرنا چاہئے۔

ویسے ابھی تک ان لوگوں نے میری تلاشی نہیں لی۔ جواہرات اور کرنسی میرے بیلٹ میں محفوظ تھے۔ بدن پر مانگے کا وہی سوٹ تھا جو جہاز پر مائی لیڈی نے اپنے امریکی دوست کے سامان سے چرا کر مجھے دیا تھا۔ کلائی کی گھڑی، رومال، لائٹر، سگریٹ کا پیکٹ، قمیض کی آستینوں میں لگائے جانے والے بٹن جو خالص سونے کے تھے، جرابیں، جوتا اور ٹائی۔ سوٹ کے علاوہ میرے بدن پر کل یہ سامان تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ان چیزوں کا جائزہ لیا اور یہ سوچنے لگا کہ ان میں سے کس کس چیز کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میری نگاہ جوتے پر پڑی اور مجھے ہنسی آ گئی۔ جوتا بے شک ذلیل کرنے کا ایک مؤثر ہتھیار ہے مگر اس سے ایک مسلح آدمی کو زیر نہیں کیا جا سکتا۔ جرابیں، منی بیلٹ، رومال، لائٹر۔ ہاں لائٹر سے کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ خودکشی کے برابر ہو گا۔ اگر میں کوٹھڑی میں پڑے ہوئے اس گھاس پھونس کو آگ لگا دیتا ہوں تو لازمی طور پر کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا جائے گا لیکن اس کے ساتھ ہی پہرے دار شور مچا دے گا اور پھر کتنے مسلح بدمعاش دروازہ کھول کر اندر داخل ہوں گے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ نہیں، بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے ہاں وقت سے پہلے ہلاک ہونے کے مواقع ضرور ہیں۔ ممکن ہے کہ اس آگ میں مجھے خود ہی جلنا پڑے یا دھوئیں سے ہی میرا دم گھٹ جائے۔ نہیں، یہ سوچ بالکل بے کار ہے۔ لائٹر میرے کام کا نہیں ہے۔ اب رہ جاتی ہے دوسری کوئی چیز۔ ٹائی...... ہاں ٹائی۔ اگر مناسب ترکیب کر لی گئی تو ٹائی سے کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔ ریشمی ٹائی پھندے کا کام دے سکتی ہے۔

میں نے ٹائی کی گرہ کھولی اور اس کے دونوں سروں کو بل دے کر نیچے سے کھینچا۔ خالص ریشمی کپڑے سے بنی ہوئی ٹائی جلاد کے پھندے کی طرح مضبوط تھی۔ میں سوچنے

ا۔ اور اب میں نے یہ سوچا کہ جس طرح بھی بن پڑے پہریدار کو کوٹھڑی میں بلایا جائے ر موقع پا کر ٹائی کا پھندا اس کے گلے میں کس دیا جائے۔ اسے ٹھکانے لگانے کے بعد ں کوٹھڑی سے باہر نکل آؤں۔ بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ پہرے دار بے شک مسلح ہو ا اگر وہ میرے قابو میں آ جائے تو میں اسے ہلاک یا بے ہوش کر کے ہتھیار حاصل کر لوں ا۔ پھر ان بھیڑیوں کے بھٹ سے نکلنے کے امکان بڑھ جائیں گے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہرے دار کو کس طرح اتنے قریب لایا جائے کہ اس پر وار کرنے کا موقع مل جائے۔

میں ایک بار پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس مختصر سی کوٹھڑی میں ٹہلنے لگا۔ کوٹھڑی کے باہر ہرے دار کے قدموں کی چاپ بڑی یکسانیت سے آ رہی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر ھانکا، اس کے اندر کاہلی تھی اور وہ چلتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پھیلی ہوئی کیفیت کو دیکھا اور پھر اس کے بدن کو۔ اس کے جسم پر گہرے رنگ کا وہی ڈھیلا ھالا لباس تھا جو دوسروں کے جسموں پر میں نے دیکھا تھا۔ یقیناً یہ اسی گروہ کا کوئی فرد ہے مجھے پکڑ کر لایا ہے۔ اس وقت اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ پہلی ہی نگاہ میں مجھے یہ اندازہ ہو گیا ہ یہ شخص دیہاتی ہے اور یقیناً شہر والوں سے مختلف مزاج رکھتا ہو گا۔ یہ بات نوٹ کر کے ں کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا۔ یہ دیہاتی میرے لئے ذرا غور و خوض کا باعث تھا۔ میرا ن اپنی سرزمین کی جانب لوٹ گیا۔ سیتا گڑھی کا کسان اور مصر کا ملاح قدرتی آفات اور طرے کے وقت ایک ہی جیسا ردِعمل دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے فوری طور پر فیصلہ کر لیا ر اس کے بعد میں زمین پر لوٹنے لگا اور پھنسی ہوئی آواز میں پکارنے لگا۔

''سانپ...... سانپ...... آہ سانپ نے کاٹ لیا مجھے...... سانپ نے کاٹ لیا۔ ارے ر گیا میں...... سانپ، سانپ......'' میں نے غور کیا، باہر قدموں کی چاپ رُک گئی تھی۔ پھر ہرے دار دوڑتا ہوا کوٹھڑی تک آیا۔ میں لوٹیں لگا رہا تھا۔ اس نے تیز روشنی اندر ڈالی۔ میں ستور تڑپ رہا تھا۔

''مر گیا میں...... سانپ...... سانپ نے کاٹ لیا ہے مجھے بھائی...... سانپ نے مجھے ٹ لیا ہے۔'' میں نے اب باقاعدہ پچھاڑیں کھانا شروع کر دیں اور ایک ہاتھ سے رے ہاتھ کا پنجہ بھینچ لیا۔ پہرے دار نے تشویش کے ساتھ پوچھا۔

''کہاں ہے سانپ؟''

میں نے مرتے ہوئے جانور کی طرح آنکھیں پھرا کر وہیں پڑے پڑے اس کی طرف

دیکھا اور پھر اشارہ کر کے کہا۔''وہ.....وہاں.....'' اور گردن کے اشارے سے گھاس کی طرف اشارہ کیا۔''وہاں.....وہاں ہے.....اس نے مجھے کاٹ لیا ہے بھائی! میں مر رہا ہوں۔''

''ٹھہرو......میں دیکھتا ہوں۔''

توقع کے مطابق اس کے اندر کا کسان بیدار ہو گیا۔ میں نے تالہ کھلنے کی آواز سنی اور پھر چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا۔ پہریدار ایک ہاتھ میں رائفل تھامے، دوسرے میں ٹارچ پکڑے کوٹھڑی کے اندر آ گیا۔ میں کہنیوں کے بل گھسٹتا ہوا وہاں سے دور چلا گیا۔ میں یہ تاثر دے رہا تھا کہ گویا پہرے دار کو سانپ مارنے کے لئے جگہ دے رہا ہوں۔ مگر میں اصل میں چاہتا تھا کہ اس کے پیچھے پہنچ جاؤں۔ کھلی ہوئی ٹائی میری مٹھی میں دبی ہوئی تھی۔ پہرے دار نے میری جانب دیکھا۔ میں نے اب باقاعدہ سانپ کی طرح لہریں لینا شروع کر دی تھیں اور میرے ہونٹوں پر کف جمع ہوتا جا رہا تھا۔

پہرے دار نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ پہلے وہ سانپ کو مارے گا پھر مجھے دیکھے گا۔ ویسے بھی میری زندگی اس کے لئے کوئی بہت بڑی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ چھپا ہوا سانپ اس کے لئے بھی خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے میری طرف پشت کر لی اور جھک کر رائفل کی نال سے گھاس پھونس کو کریدنا شروع کر دیا۔ میں ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ میں نے پھرتی سے اپنے بدن کو جھٹکا دیا اور فرش سے اٹھ کر پنجوں کے بل بے آواز چلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ قبل اس کے کہ وہ کسی قسم کی آواز نکالتا یا کسی کو پکارتا، میں نے مضبوطی سے تھامے ہوئے ٹائی کے دونوں سروں کو تھام کر بجلی کی سی تیزی سے اس کی گردن میں ڈال کر پوری طاقت سے بل دے دیا۔ وہ بلا کا طاقتور نکلا۔ پہلے جھٹکے میں رائفل اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گری اور اس کے گھٹنے مڑ گئے۔ وہ اوندھے منہ فرش پر گرنے لگا۔ لیکن اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا چھڑانے کی کوشش جاری رکھی تھی۔ اس کے فولادی پنجے شانوں پر سے ہوتے ہوئے میری کلائی میں پیوست ہو گئے۔ میں جانتا تھا اور اسے بھی احساس تھا کہ اس حالت میں جبکہ نرخرے پر ریشمی ٹائی کے پیچ تنگ ہوتے جا رہے تھے وہ زیادہ عرصے تک مدافعت جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کی انتہائی کوشش تھی کہ جس طرح بھی بن پڑے وہ اپنا گلا چھڑا لے۔ جبکہ میرا منصوبہ یہ تھا کہ آہستہ آہستہ اپنی گرفت بڑھاتا جاؤں۔

اچانک ہی اس نے میری کلائیاں چھوڑ دیں اور دونوں کہنیوں کی پوری قوت سے پیچھے

کی طرف پھینکا۔ یہ وار اتنا بھرپور تھا کہ اگر میں پہلے سے سمجھ نہ گیا ہوتا تو لازمی طور پر دونوں کہنیاں دولتی کی طرح میرے چہرے پر آ کر لگتیں، میری گرفت کمزور ہوتی اور پھر جھٹکے سے وہ میرے شکنجے سے آزاد ہو جاتا۔ بہرحال کہنیوں کے اس وار کو میں نے برداشت کیا اور جواب میں اس کی پشت پر گھٹنے کی بھرپور ضرب لگائی۔ وہ دوہرا ہو گیا اور میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑنے لگے۔ زرد روشنی میں اندازہ ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی ہیں اور منہ سے خون بہنا شروع ہو گیا ہے۔ میں نے ایک بار پھر کچکچا کر کچھ اور جھٹکے دیئے اور دوسرے لمحے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو گیا ہے۔ میں نے احتیاطاً کچھ دیر اور اپنی گرفت قائم رکھی، پھر آہستہ سے اسے فرش پر لڑھکا دیا۔ اس کے بعد میں نے گھاس پر سے ٹارچ اٹھائی اور اسے جلا کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی کمر کی پیٹی میں خنجر اڑسا ہوا تھا۔ رائفل تو میرے لئے بیکار تھی لیکن پھر بھی میں نے رائفل کا میگزین خالی کیا اور خنجر اپنے قبضے میں کر لیا۔

کوٹھڑی سے باہر آ کر میں نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا اور چابی اپنی جیب میں ڈال کر دائیں بائیں دیکھتا ہوا صحن میں آ گیا۔ اس زمین دوز صحن میں ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ صحن میں کھلنے والی بے شمار محرابوں میں کم روشنی کے بلب جل رہے تھے اور جھینگروں اور صحرائی کیڑے مکوڑوں کی آواز کے سوا مکمل سکوت تھا۔ مجھے جن بھول بھلیوں سے گزار کر لایا گیا تھا، واپس ان سے ہو کر اوپر تک پہنچنا تو ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ صحن میں کھلنے والی اتنی بہت سی محرابوں میں سے بلا سوچے سمجھے کسی بھی محراب میں داخل ہونا خطرے میں مبتلا ہونے کے مترادف تھا۔ اس لئے کہ میں نے دیکھا تھا کہ مجھے اغوا کرنے والے انہی محرابوں میں داخل ہو کر گم ہو گئے تھے۔ مگر میں اس زمین دوز صحن میں بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ خدا معلوم کب کون نکل آئے۔

میں نے جوتے اتار کر ہاتھ میں لے لئے اور صرف موزے پہنے تیزی کے ساتھ بے آواز چلتا ہوا اس منحوس جگہ سے نکلنے کے لئے راستے تلاش کرنے لگا۔ زیادہ تر محرابوں میں ایسی ہی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں جیسا کہ میرا قید خانہ تھا۔ میں نے کئی محرابوں کو دیکھا اور پاگلوں کی طرح ان میں جھانکتا پھرا۔

نجانے کتنی ہی دیر میں اس کیفیت کا شکار رہا۔ ایک محراب میں داخل ہوا تو اچانک مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ بس چھٹی حس ہی تھی جس نے مجھے فوراً ہوشیار کر دیا تھا۔ میں ستون

کی آڑ میں ہو گیا۔ اگر ایک لمحے کی دیر ہو جاتی تو میں دھر لیا جاتا کیونکہ جونہی میں محراب میں داخل ہوا، ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھلا۔ کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر تین تنومند سیاہ فام ڈھیلے ڈھالے لباس میں نکلے اور برابر کی دوسری کوٹھڑی کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے دروازے پر دستک دی، کسی نے فوراً ہی دروازہ کھولا اور تینوں دروازے سے داخل ہو گئے۔ ان میں سے آخری آدمی نے احتیاط سے دروازہ بند کر لیا۔ مجھے ان کے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اوپر کی جانب سیڑھیاں طے کر رہے ہوں۔ چونکہ اس وقت گہرا سناٹا تھا اس لئے ہلکی سے ہلکی آواز بھی سنائی دے سکتی تھی۔ پھر قدموں کی چاپ ختم ہو گئی اور اس طرح اس زمین دوز دنیا میں سناٹا چھا گیا۔ ان لوگوں کا یکا یک برآمد ہونا اور چلا جانا میرے اعصاب کو جھنجھوڑنے کے لئے کافی تھا۔ میں بال بال بچا تھا۔ لیکن اس تجربے نے مجھے روشنی دکھائی تھی۔ اتنی دیر سے میں جس راستے کو تلاش کر رہا تھا، وہ مجھے مل گیا تھا۔ یہ دروازہ اوپر جانے والی سیڑھیوں پر بنا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ خدا کرے یہ حبشی لوگ اندر سے کنڈی نہ چڑھا گئے ہوں۔

بہرحال دو تین منٹ انتظار کے بعد پھر میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ دروازے کو دھکا دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے چپکے سے پہلی سیڑھی پر چڑھ کر کنڈی چڑھا دی۔ سیڑھیوں پر اسی طرح کمزور سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بیس پچیس سیڑھیوں کے بعد ایک مختصر سی لینڈنگ تھی۔ یہاں مختلف سمتوں والے دروازے بنے ہوئے تھے۔ پھر کچھ سیڑھیاں اوپر کو چلی گئی تھیں۔ میں پھر تیزی سے سیڑھیاں اوپر چڑھتا چلا گیا۔ ایک بار پھر بیس پچیس سیڑھیوں کے بعد لینڈنگ ملی۔ یہاں بھی دروازے بنے ہوئے تھے۔ میں نے آہستگی سے ان دروازوں کے پٹوں کو دھکیلا، دروازے اندر سے بند تھے۔ اس لینڈنگ کے بعد چند سیڑھیاں اور تھیں۔ اور پھر چھت نظر آنے لگی تھی۔ شاید زمین کی سطح تھی۔ بہرحال میں تیزی سے چڑھتا ہوا یہ سیڑھیاں بھی طے کر گیا۔ سیڑھیاں ختم ہو گئیں۔ لیکن یہاں کوئی دروازہ نہیں تھا بلکہ ایک جنگلا سا بنا ہوا تھا۔ اس جنگلے کے پار میں نے دیکھا کہ طویل راہداری دور تک چلی گئی ہے۔ دونوں طرف دروازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں بڑے بڑے ہال بھی بنے ہوئے ہیں۔ میں نے یہ راہداری طے کی اور کھلے آسمان تلے آ گیا۔

یہ ان راتوں میں سے ایک رات تھی جب چاند نہیں نکلتا۔ اوپر تارے چمک رہے تھے اور صحرا کی سرد ہوا چل رہی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں اس خوفناک زمین دوز

ل کی بھول بھلیوں سے نکل آیا تھا اور اب اپنے سفاک دشمنوں سے بچ نکلنے کی ایک کرن مودار ہو گئی تھی۔ کھلے آسمان کے نیچے پہنچ کر میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ یہ کوئی اندرونی حن تھا اور چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ دور ایک مختصر سا دروازہ ظر آیا جس پر معمول کے مطابق مدھم بلب جل رہا تھا۔ میں نے اس بات کو خاص طور سے وٹ کیا تھا کہ اس عمارت میں بہت ہی کم روشنی والے بلب جل رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہاں عمارت میں بجلی پیدا کرنے کے لئے کوئی چھوٹا سا جنریٹر لگا ہوا ہو۔ اس کے سوا دھندلی ور گدلی روشنیوں کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

ابھی میں ماحول کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ دور سے اس دروازے پر کوئی سایہ نظر آیا۔ ہی ڈھیلے ڈھالے سیاہ کپڑے۔ لمحے بھر کے لئے رائفل کی نال چمکی اور میں دبک گیا۔ یہ بھی کوئی پہرے دار تھا۔ میرے لئے یہ نئی آزمائش کی سب سے بڑی کڑی تھی۔ طویل صحن کے دوسرے سرے پر باہر نکلنے کا دروازہ تھا اور دروازے پر مسلح سنتری پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ دروازہ مقفل ہو گا۔ پتہ نہیں اس کی چابیاں کہاں ہوں۔ صحن پار کر کے اس سنتری پر قابو پانا اور پھر دروازے کا تالا کھولنا بہت ہی مشکل اور سنسنی خیز کام تھا۔ مگر ایسا کرنا میری مجبوری تھی۔ کیا کروں۔ رائفل کے مقابلے میں خنجر کی بساط کیا ہوتی ہے۔ پھر بھی میں نے دل کو یہ کہہ کر سمجھایا کہ بہرحال رائفل بھی میرے لئے بے مقصد ہی تھی۔

چند لمحات انتظار کرنے کے بعد وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ پہرے دار پچھلے دروازے کے سامنے رکا، پھر اس نے کندھے سے رائفل اتاری اور منہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید وقت کا اندازہ لگا رہا ہو۔ وہ جتنی دیر صحن کی طرف رخ کر کے کھڑا رہا، میں دیوار کے ساتھ چپکا ہوا، سانس روکے دل ہی دل میں دعائیں مانگتا رہا۔ پھر وہ مڑا اور دروازے کو باہر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ باہر نکل گیا اور دروازہ بھیڑ گیا۔

میرے لئے اب کچھ کر گزرنے کا وقت تھا۔ میں تیزی سے جھپٹ کر دروازے پر پہنچا اور دروازے کو تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا اور دروازے کے باہر میں نے جو کچھ دیکھا، مجھے حواس باختہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ مجھ پر یہ ہولناک حقیقت منکشف ہوئی کہ دروازہ باہر کو نہیں کھلتا، اس کے آگے ایک ڈیوڑھی تھی اور پھر ایک وسیع احاطہ نظر آ رہا تھا۔ میں ابھی تک اپنے دشمنوں کے علاقے میں تھا جبکہ میں غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ میں باہر نکل گیا ہوں۔

مجھ سے چند ہی گز کے فاصلے پر وہی پہرے دار میری طرف پشت کیئے جھک کر فرش سے کچھ اٹھا رہا تھا۔ میں نے چونکہ اپنے جوتے بغل میں دبائے ہوئے تھے اور اس وقت میری تمام تر توجہ اس پہرے دار کی طرف تھی اور میں یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ وہ کیا اٹھا رہا ہے کہ اچانک ہی میری بغل سے ایک جوتا نکل کر فرش پر جا گرا۔ آواز سنتے ہی پہرے دار تیزی سے گھوما۔ اور اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اعصاب سوچ سے زیادہ قوت رکھتے ہیں اور انہیں فیصلہ کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں نے بجلی کی سی چمک کے ساتھ جھپٹ کر اس کے سینے میں بائیں طرف اپنا خنجر پیوست کر دیا۔ میرا یہ حملہ اس قدر اچانک اور وار اس قدر بھرپور تھا کہ پہرے دار کوئی آواز نکالے بغیر تیورا کر فرش پر گرا اور ڈھیر ہو گیا۔ میں نے جھک کر دیکھا، یہ بھی سیاہ فام تھا۔ رات کے سناٹے میں اپنے دو دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد بھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ آزادی ابھی کتنی دور ہے۔ میں واپس نہیں لوٹ سکتا تھا۔ واپس لوٹنے کا مطلب یہ تھا کہ میں پھر سے ان نامعلوم خطرات میں لوٹ جاؤں جن سے میں بچ نکلا تھا۔ نامعلوم خطرے تو آگے بھی میرے منتظر تھے۔ مگر ایک خاموش آواز مجھ سے برابر کہہ رہی تھی کہ میں ایک بڑے خطرے سے آزاد ہو گیا ہوں۔ آگے جو کچھ آنے والا ہے میرے لئے اس سے نمٹنا مشکل نہیں ہو گا۔

بہرحال میں نے احتیاطاً اس شخص کی بھی تلاشی لی۔ رائفل کے علاوہ اس کے پاس ایک پستول بھی برآمد ہوا جس کا میگزین لگا ہوا تھا۔ اس کی پیٹی میں بہت سے فالتو راؤنڈ بھی تھے۔ میں نے پہلے ہی کی طرح اس رائفل کا میگزین بھی خالی کیا اور ایک طرف سے قالین کا کونا اٹھا کر قالین کے نیچے رائفل چھپا دی۔ اب میرے پاس ایک خنجر، ایک بھرا ہوا پستول اور بہت سے کارتوس تھے۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا، سامنے ایک کوٹھڑی سی تھی جو شاید پہرے دار کے لئے مخصوص ہو گی۔ آگے بڑھ کر میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور پہرے دار کی لاش اندر ڈال دی اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر میں نے وہ جگہ عبور کی اور ایک پختہ دالان میں پہنچ گیا۔ یہ مربع عمارت تھی جس میں چاروں طرف دالان نکالا گیا تھا۔ کافی روشنی تھی یہاں۔ میں نے دیکھا کہ دالان میں گہرے رنگوں کے قالین بچھے ہوئے ہیں۔ دالان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے سادہ فانوس بھی لٹک رہے تھے جو نیچے کی نسبت زیادہ روشن تھے۔ دالان میں سنہری لکڑی والے دروازے تھے جن میں رنگین شیشوں سے مربع، مثلث اور مستطیل بنا کر پہاڑیوں، وادیوں اور پھول پتیوں کے نقش ابھارے گئے تھے۔ ان

رنگین شیشوں سے باہر کی روشنی چھن چھن کر اندر پہنچتی ہو گی تو ہر دروازے سے سحر کی طرح رنگین اور روشن مناظر دکھائی دیتے ہوں گے۔ دروازے بے شمار تھے۔ یہ حجروں کے دروازے تھے۔ میں نے اس قدر خوبصورت دروازے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ دو دروازوں کے درمیان دیوار کا جو مختصر حصہ ہوتا ہے اسے بھی ایسے ہی نہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ چھ چھ فٹ کے شفاف آئینے خاصی بلندی پر بڑی ترتیب سے دیوار پر جڑے ہوئے تھے۔

ابھی میں دالان کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ میں نے اپنے عقب میں کسی وحشی جانور کے غرانے کی سی آواز سنی۔ میرا پستول میرے پاس موجود تھا۔ اس پر میری گرفت سخت ہو گئی اور میں خاموشی سے ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور کان لگا کر آواز کا جائزہ لینے لگا۔ یہ یقیناً چیتوں کے غرانے کی آواز تھی اور میرے عقب سے آئی تھی۔ چیتے ایک بار پھر غرائے۔ میں نے جنگلوں میں بہت عمر گزاری تھی۔ درندوں وغیرہ کی آوازیں میری مکمل شناسا تھیں۔ اندھیرے اور اجالے میں کتنے ہی فاصلے سے مختلف درندوں کی آوازیں پہچان لینا میرے لئے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ چنانچہ ایک لمحے میں مجھے پتہ چل گیا کہ یہ چیتے تھے اور ان میں ایک مادہ تھی۔ مگر ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ آواز کس طرف سے آ رہی ہے۔ میں نے ستون کے پیچھے کھڑے کھڑے سامنے والے ستونوں کی رنگین قطار پر نگاہیں دوڑائیں، سارے دروازے بند تھے۔ اندر مکمل تاریکی تھی چیتوں کی غراہٹ کے سوا جو وقفے وقفے سے سنائی دے رہی تھی اب ہر طرف مکمل سناٹا تھا۔ میں نے ہشمان ذکری جیسے دولت مند مجرموں کے بارے میں عجیب عجیب باتیں سنی تھیں مگر یہ بہت عجیب مسئلہ تھا۔ اگر یہ ہشمان ذکری کا محل ہے تو اس سفاک مجرم نے یہاں پر خونخوار جانور کیوں اکٹھے کئے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ بھی اس کا کوئی کاروباری مسئلہ ہی ہو۔ اکثر اس طرح کے لوگ افریقہ کے مختلف جنگلوں سے اس طرح کے جانور حاصل کر کے یورپ اور امریکہ کے ملکوں کو بیچتے ہیں۔

بہرحال میں ستون کی آڑ میں کھڑا ہو کر سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ آہستہ سے دروازہ کھلا اور دو عورتیں ایک بڑا سا دھات کا برتن اٹھائے باہر آئیں۔ یہ دونوں بھی سیاہ فام عورتیں تھیں۔ دونوں افریقہ کی کسی نامعلوم زبان میں باتیں کرتی جا رہی تھیں۔ میں دالان کے ستون کے پیچھے دبک گیا۔ یہ تنومند اور کرخت خدوخال والی حبشی عورتیں تھیں۔ برتن ہاتھ میں اٹھائے وہ سیدھی نکل گئیں۔

آسمان پر تارے کھلے ہوئے تھے لیکن صحن میں خاصی تاریکی تھی۔ صحن کے بیچ و بیچ

درختوں کا ایک جھنڈ نظر آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ جدھر یہ حبشنیں گئی ہیں ادھر سے یقیناً کوئی باہر جانے کا راستہ نکلتا ہوگا۔ کیوں نہ میں ان کا پیچھا کروں۔ لیکن اگر میں ان کے پیچھے جاتا ہوں تو چھت کے بے شمار فانوسوں کی روشنی میں دور سے ہی میری موجودگی کا پتہ چل جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ صحن پار کر کے میں ان کے پیچھے پیچھے جاؤں۔ چنانچہ میں درختوں کے اس جھنڈ کی جانب چلنے لگا۔ لیکن ابھی تھوڑا سا ہی آگے بڑھا تھا کہ میں نے کوئی بیس فٹ اونچی فولادی جالی کا جنگلا دیکھا۔ پہلی نظر میں یہ فولادی جالی نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن اب میں نے دالانوں سے آتی روشنی میں دیکھا کہ صحن میں ہر طرف جنگلا بنا ہوا ہے۔ گویا صحن پار کر کے ان حبشی عورتوں کے پیچھے جانے کی صورت نہیں تھی۔ مجھے ہر حال میں دالانوں سے گزرنا ہوگا۔ مگر دالانوں کی یہ تیز روشنی میرے لئے انتہائی خوفناک تھی۔ مجھے جلدی کچھ کرنا تھا۔ اس لئے کہ دالانوں سے گزرتے ہوئے وہ عورتیں اب بائیں ہاتھ پر پہنچ گئی تھیں۔ اب اگر میں حجروں کے سامنے سے گزرتا ہوا جاتا ہوں تو شاید انہیں جا پکڑوں ورنہ وہ تو میرے ہاتھ سے نکل جائیں گی۔ ہوسکتا ہے کہ کسی ایسی جگہ روپوش ہو جائیں جس کا مجھے اندازہ نہ ہو سکے۔ میں یہ سوچ رہا تھا اور ہاتھوں سے اس فولادی جنگلے کو ٹٹولتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ مجھے اچانک اس فولادی جنگلے کے حصار میں ایک پھاٹک سا بنا نظر آیا۔ لوہے کے فریم میں ایک زنجیر جڑی ہوئی تھی۔ میں نے زنجیر کھول کر فریم کو اندر کی طرف دھکیلا، پھاٹک کھل گیا تو میں نے پیروں سے ٹٹول کر دیکھا۔ دو سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جن سے اتر کر میں صحن کے حصار میں پہنچ سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اس فولادی جنگلے میں داخل ہو جاتا ہوں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ دوسرا کوئی اس حصار سے باہر جانے کا پھاٹک بھی ہوگا۔ اور اگر اس اندھیرے میں وہ مجھے مل بھی جائے گا تو میں......

ابھی میں نے اتنا ہی سوچا تھا کہ ایک بار پھر قدموں کی چاپ سنائی دی اور مجھے ایک لمحے میں اندازہ ہوگیا کہ یہ وہی چوکیدار ہے۔ میں نے خوف کی جھرجھری لی۔ ایک چوکیدار کو تو میں موت کے گھاٹ اتار آیا ہوں، اب یہ کون آ رہا ہے؟ قدموں کی چاپ برابر قریب آتی جا رہی تھی۔ میں نے صحن کے اندھیرے میں درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھا۔ بچنے کی بس ایک یہی صورت رہ گئی تھی۔ چنانچہ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر سیڑھیاں اتر کر فولادی جنگلے کا راستہ تلاش کیا اور آہستگی سے لوہے کا یہ پھاٹک بھیڑ دیا۔ صحن میں روشیں بنی ہوئی تھیں اور چھوٹی چھوٹی مصنوعی جھیلوں میں پانی چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پام، کھجور اور

دوسرے درختوں کے پودوں کے قطعے تھے۔ میں خاموشی سے درختوں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ میں جا کھڑا ہوا اور روشن دالانوں اور قدرے تاریک ڈیوڑھی کی طرف آنکھیں گاڑھ دیں۔ آنے والا ڈیوڑھی سے گزر کر دالان میں آ کھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ڈھیلے ڈھالے سیاہ لباس میں ملبوس ایک سیاہ فام حبشی کندھے سے رائفل لٹکائے تجسس کے عالم میں صحن کی طرف دیکھ رہا ہے۔

وہ بہت دیر تک خاموش کھڑا شاید کسی قسم کی آہٹ سننے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر جیسے اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے کمر پر سے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے چہرے پر پھیرے، جماہی لی اور اسی طرح نپے تلے قدموں سے واپس جانے کے لئے مڑا۔ لیکن جیسے ہی وہ مڑا اچانک ہی مجھے اپنے عقب سے چیتوں کے غرانے کی آواز سنائی دی...... اور میں نے گھوم کر دیکھا۔ مجھ سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر افریقی چیتوں کا ایک جوڑا ان مصنوعی جھاڑیوں سے سر نکالے میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور ان کے حلق سے غراہٹیں نکل رہی تھیں......!

انتہائی خوف نے کچھ لمحے کے لئے میرے دل و دماغ سے سارے رابطے منقطع کر دیئے۔ میں بدحواسی کے عالم میں سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا ہوگیا۔ خوف کی وجہ بالکل درست تھی۔ میرے ایک جانب مسلح شخص کھڑا ہوا تھا اور دوسری جانب خونخوار چیتے جن کا انداز یہ بتا رہا تھا میرے تجربے کی بنیاد پر کہ یہ مجھ پر جست لگانے ہی والے ہیں۔ اس شخص نے غالباً مجھے نہیں دیکھا تھا اور چیتوں کی اس غراہٹ کی جانب متوجہ ہوگیا تھا۔ اس نے کہا۔

''سو جاؤ...... ابھی صبح ہونے میں دیر ہے۔ تمہاری بھوک نے تو میری زندگی عذاب کر رکھی ہے۔ آخر دوسرے بھی تو سو رہے ہیں۔ صرف تمہی ہو جنہیں بھوک لگ رہی ہے۔''

یہ لفظ ''دوسرے'' اس سے زیادہ خوفناک تھے۔ یعنی اس کے علاوہ یہاں اور بھی چیتے ہیں۔ اس فولادی حصار میں ہر طرف میرے لئے موت ہی موت ہے۔ سر چکرایا جا رہا تھا۔ ادھر دونوں چیتے شعلہ بار آنکھوں سے مجھے گھورے جا رہے تھے۔ میں پتھر بنا، سانس روکے تقریباً ان سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ دوسری طرف کھڑے ہوئے پہریدار نے ان چیتوں کی اس کیفیت پر بالکل غور نہیں کیا۔ پھر وہ ان سے واقف ہی نہیں تھا کہ چیتوں کی یہ کیفیت کسے دیکھ کر ہوتی ہے۔ پہرے دار نے زور سے جماہی لی اور منہ

سے ہو ہو کی آوازیں نکالنے لگا۔ میرے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ ایک ایک سیکنڈ پہاڑ کی طرح گزر رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ چیتوں پر پستول سے گولیاں چلاتا ہوا جنگلے کا پھاٹک کھول کر باہر نکل بھاگوں چاہے اس کے لئے مجھے اس چوکیدار کی زندگی بھی کیوں نہ لینی پڑے۔ اس عذاب ناک وحشت سے تو چھٹکارا ملے گا۔ اس کے بعد چاہے سارا اسکندریہ ہی جاگ پڑے اور مجھ پر گولیوں کی بارش شروع ہو جائے۔

سرد خوف کے اس عذاب سے اگر مجھے فوراً ہی نجات نہ ملی تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میرا دماغ اچانک خربوزے کی طرح پھٹ جائے گا۔ دوسری طرف سپاہی ایسا لگتا تھا جیسے وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے گا۔ آخر کار میں نے پستول پر اپنی گرفت سخت کر لی۔ میں نے سوچا کہ چیتوں کے جوڑے کے چھلانگ لگانے سے پہلے اگر یہ شخص یہاں سے نہ ہٹا تو میں گولی مار کر اسے ہلاک کر دوں گا اور اس کے بعد چیتوں پر گولی چلا کر یہاں سے بھاگوں گا۔ اس کے لئے صرف دس تک گنتی گننا کافی ہے۔

ایک...... دو...... تین...... چار...... پانچ...... چھ...... سات...... آٹھ...... پستول کے ٹریگر پر میری گرفت سخت ہو گئی۔ میں چیتوں کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر پہرے دار کے بدن میں جنبش ہوئی اور وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ پتہ نہیں یہ کس طرح کے چیتے تھے۔ یا تو وہ خود بھی صورتحال کا جائزہ لے رہے تھے اور فوراً ہی مجھ پر حملہ نہیں کرنا چاہتے تھے یا پھر میری تقدیر انہیں روکے ہوئے تھی۔ میں نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ یہ یقیناً پہریداروں کی دوسری کوٹھڑی کا دروازہ ہو گا۔

چیتے میرے بے حس و حرکت جسم پر نگاہیں گاڑھے تھک گئے تھے۔ یہاں تک کہ پہلے نر نے جماہی لی اور اس کے بعد مادہ نے۔ پھر نر نے جھاڑیوں میں اپنا سر چھپا لیا البتہ مادہ میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی غراہٹ دھیمی ہو گئی، پھر بند ہو گئی۔ اور اس کے بعد میں نے ہلکی سی جنبش سے یہ محسوس کیا کہ وہ واپس چلے گئے ہیں۔ میں تیزی سے فولادی جھاڑیوں کے اس حصار سے باہر نکل آیا اور پھاٹک بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔ دالانوں سے گزر کر راستہ تلاش کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ فانوسوں کی روشنی میں دالانوں میں بچھے قالین پر دبے پاؤں چلتا ہوا آخر میں اس طرف روانہ ہو گیا جدھر میں نے ان دونوں عورتوں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ویسے یہاں تمام حجرے ایک طرح کے تھے۔ دالان کی

چھت پر ایک طرح کے ہی فانوس لٹک رہے تھے اور دالان سے اتر کر نیچے جالی کا چوطرفہ حصار تھا۔ میں نے وسیع و عریض صحن میں نگاہ ڈالی۔ چیتوں نے میری بو سونگھ لی تھی یا شاید ان کے شور مچانے کا وقت تھا۔ کیونکہ ایک بار پھر وہ جوڑا فولادی جالی کے اس پار غراتا ہوا جالی کے قریب بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ یہ بڑی پریشانی کی بات تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا ہوا تھا۔ میں اس کے سوا کیا کر سکتا تھا کہ اپنی رفتار ہلکی کر دوں۔ اگر میں دوڑتا تو پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔ ہو سکتا ہے چیتے غرا غرا کر لوگوں کو وہاں جمع کر لیتے۔

جیسے ہی میری رفتار ہلکی ہوئی ان کا جوش و خروش بھی کم ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ چیتوں کا ایک اور جوڑا ان کے ساتھ ساتھ آ گیا ہے۔ میں اس طرح کتنی دور تک چلتا رہا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔

دالان میں ایک اور موڑ آیا۔ میں نے دھیان ہٹا کر حجروں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ سب حجروں میں اندھیرا تھا اور سناٹا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس عمارت کا یہ حصہ بالکل خالی ہے۔ مگر میں نے تو خود اپنی آنکھوں سے ان عورتوں کو وزنی برتن اٹھائے ایک حجرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ ان چوکیداروں کو بھی۔ خیر ایسا ممکن نہیں ہے۔ یہ حصہ بھی آباد ہو گا۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ رات کے اس پہر کی نیند خاصی گہری ہوتی ہے اور اسی نیند نے ابھی تک مجھے محفوظ رکھا ہوا ہے۔

اچانک ہی میں نے دالان کے دوسرے سرے پر رنگین روشنیوں کی چمک دیکھی اور اپنی رفتار ہلکی کر دی۔ نرم قالین پر بے آواز چلتا ہوا میں اس روشن حجرے کی طرف بڑھا۔ پستول پر انگلیوں کی گرفت آپ ہی آپ سخت ہو گئی۔ تمام حجروں کی طرح اس حجرے کے کیواڑ بھی رنگین شیشوں سے مزین تھے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا حجرے کے دروازے کے برابر جا کھڑا ہوا۔ پالش کی ہوئی کھڑکی میں کوئی بالشت بھر کا مثلث تراشا گیا تھا اور اس میں سرخ شیشہ جڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سرخ مثلث سے آنکھیں لگا دیں۔ سرخ شیشے کے اس مثلث سے اندر ہر چیز سرخ دکھائی دے رہی تھی۔ حجرے میں گہرے سرخ رنگ کے قالین بچھے تھے۔ سرخ رنگ کے ایک چھپر کھٹ پر ریشمی جالی تنی ہوئی تھی اور سرخ دیوار پر قابل اعتراض تصویریں آویزاں تھیں۔ چھت پر سرخ فانوس لٹک رہا تھا اور کمرے میں سرخ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سب کچھ سرخ نظر آ رہا تھا۔ سرخ گلدان، سرخ پھول۔ میرا سر چکرانے لگا۔ آہ...... آہ، یہ طلسم کب ٹوٹے گا؟ کس مشکل میں پڑ گیا ہوں میں؟ کس مشکل میں پڑ گیا

ہوں؟ میں نے ہر طرف گردن گھما پھرا کر دیکھا، کمرہ خالی تھا۔ مگر نہیں، یہ غلطی تھی میری۔ کمرہ خالی نہیں تھا۔ سرخ آئینے کے سامنے سرخ ملبوس والا سرخ رنگ کا ایک مجسمہ ایستادہ تھا۔ قد آدم مجسمہ۔ میری طرف مجسمے کی پشت تھی۔

دفعتہً ہی مجسمے میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے ایک بازو اٹھا کر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اس کے بعد دونوں ہاتھ اٹھا کر بھرپور انگڑائی لی۔ ڈھیلے ریشمی گاؤن کی آستینیں سمٹ کر کہنی سے اوپر آ گئیں میں نے دیکھا کہ وہ مجسمہ نہیں بلکہ گداز بانہوں والی ایک خوبصورت عورت ہے۔ جیتی جاگتی عورت جس نے ایک جھٹکے کے ساتھ دونوں ہاتھ گرا دیئے اور سرخ ریشمی گاؤن کی آستینوں نے لٹک کر سرخ گداز بانہوں کو ڈھک لیا۔

عورت کی آواز ابھری۔ غالباً اس نے لمبی جماہی لے کر منہ سے یہ آواز نکالی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور شیشے کے پاس سے ایک چوڑا سا کنگھا اٹھا لیا اور اس کے بعد اپنے گہرے سرخ بالوں کو سلجھانے لگی۔ اس کے ہاتھ کنگھا چلا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھوں میں حسین مالائیں پڑی ہیں۔ سرخ موتیوں کی مالائیں اس کی سرخ بانہوں پر پھیلتی رہیں۔ پھر یکایک اس نے جھنجلا کر کنگھا پھینک دیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی اور جھک کر شیشے میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔ وہ ابھی تک میری طرف پشت کئے کھڑی ہوئی تھی۔ کچھ لمحے وہ اسی طرح کھڑی رہی اور اس کے بعد سیدھی تن کر کھڑی ہو گئی اور اپنے ریشمی گاؤن کی ڈوریوں سے کھیلنے لگی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ سیدھی کھڑی کھڑی ناک، بھرے بھرے سرخ ہونٹوں والی اس عورت کا یہ آدھا رخ اتنا دلکش تھا کہ میرے پاؤں وزنی ہو گئے۔ میں جو باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا اب خاموشی سے اس ڈرامے کا ڈراپ سین دیکھنا چاہتا تھا۔

چند لمحوں تک وہ اپنے لبادے کی ڈوریوں سے کھیلتی رہی۔ اور پھر جیسے ایک زوردار آواز کے ساتھ محل کی چھت میرے سر پر آ گری۔ اس نے جھٹکے سے اپنے لبادے کی ڈوریاں کھول دی تھیں۔ ریشمی لبادہ اس کے بھرے بھرے شانوں پر پھسلتا ہوا اس کے پیروں میں ڈھیر ہو گیا۔ اس کا لال بھبھوکا بدن سرخ شیشے کے مثلث میں کوندنے لگا۔ اب وہ میرے بالکل مقابل کھڑی تھی جلتے ہوئے دیئے کی لو کی طرح۔ وہ ایک بار کانپی، اس نے شیشے کے سرخ مثلث کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ بلا کی حسین عورت تھی۔ اس کے بائیں رخسار پر ایک تل تھا اور اس کی آنکھوں میں صحرائے عظیم کی تمام راتیں رچی ہوئی تھیں۔ میں پتھرا گیا

تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک بار پھر مجھے وردان سادھانی نے سنبھلنے کا موقع دیا تھا۔ لیکن کیا انسان یہ سب کچھ دیکھ کر سنبھل سکتا ہے؟

وہ ایک ایک قدم آگے بڑھ رہی تھی اور اس کے ہر قدم کی آواز آگ میں تپائی ہوئی ہتھوڑوں کی طرح میری کنپٹیوں پر پڑ رہی تھی۔ ادھر میرے عقب میں چیتوں کے جوڑے رات کے سناٹے کو بھنبھوڑ کر کھائے جا رہے تھے۔

شعلے نے پھر ایک آہ بھری اور مجھ آدم کے بیٹے کو زندہ درگور کر دیا...... میں دیوانگی کے عالم میں آگے بڑھا اور یہ سب میرا عمل نہیں تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ لیکن بس انسانی فطرت جو شاید خود انسان کی سمجھ میں بھی آج تک نہیں آئی۔ وہ اگر اپنے حواس میں ہوتی تو میرے اس طرح اچانک گھس آنے پر چیخ مار دیتی اور میں دھر لیا جاتا۔ مگر اس کی آنکھیں نشے میں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے مجھے دروازے سے برآمد ہوتے ہوئے دیکھا اور نشہ آور انداز میں مسکرا دی۔ میں نے ایڑی کی چوٹ سے دروازہ بند کیا اور آہستہ سے اندر داخل ہو گیا۔ باہر شاید صحن میں موجود چیتے لڑ پڑے تھے۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور پھر کچھ لمحات گزر گئے...... وہ لمحات جن کے لئے مجھ سے کہا گیا تھا کہ اگر میں ان سے بچوں تو تب ہی مہتر بدھا بن سکتا ہوں۔ اشبھ بھاونائیں میرے وجود کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ جن برے راستوں پر نکل گیا تھا ان سے واپسی شاید اب میرے لئے ممکن نہیں رہی تھی۔ ایلس فیوری سے آغاز ہوا تھا اور انجام کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کہاں ہو۔ بہرحال سنگ سرخ کا یہ مجسمہ آہستہ آہستہ سکون پاتا چلا گیا۔ اور پھر اچانک ہی اس کے اندر جیسے حواس بیدار ہو گئے۔ وہ بری طرح تڑپی اور حسین آواز میں کہا۔

''کون ہو تم......؟''

میں نے قالین پر ایک کہنی ٹکائی، جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اس کا نشہ تو اتر گیا تھا لیکن میرا سارا وجود نشے میں سرشار تھا۔ میرے منہ سے آواز نکلی۔

''میں چیتا ہوں...... خاموش رہو۔''

''کک...... کیا بکواس کر رہے ہو...... تم یہاں کیسے آئے؟''

''میں نے کہا نا خاموش رہو۔''

''بتاتے کیوں نہیں۔ کہاں سے آئے ہو تم؟''

"اس آئینے سے نمودار ہوا ہوں۔ کیا تم نے میرا خواب نہیں دیکھا تھا؟" میں نے نشے سے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

"میں تمہیں اپنا وہم سمجھی تھی۔"

"اور اب کیا سمجھی ہو تم؟"

"چیتا۔" وہ مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ٹھیک ہے...... اب تم صحیح سمجھی ہو۔"

"جانتے ہو میں تمہیں گولی بھی مار سکتی ہوں۔"

"اس سے پہلے میں تمہیں چبا جاؤں گا۔"

"ہشمان ذکری کو جانتے ہو؟" اس نے پھر کہا۔ انداز میں طنز تھا۔ میرے دماغ کو پہلا جھٹکا لگا اور تھوڑی دیر پہلے جو نشہ میرے سارے حواس پر طاری تھا اس میں کچھ کمی واقع ہونے لگی۔

"تو یہ ہشمان ذکری کا محل ہے؟"

"ہاں...... اور کچھ ہی لمحے جاتے ہیں کہ وہ آنے والا ہے۔"

یہ الفاظ میرا پورا نشہ اتارنے کے لئے کافی تھے۔ میں نے کمرے کو گردش کرتے ہوئے محسوس کیا۔ اگر ایسا ہے تو یہ صورتحال تو انتہائی خطرناک ہے۔ اتنے خطرناک حالات سے گزر کر آزادی کی ایک امید پیدا ہوئی تھی۔ لیکن ہشمان ذکری کا نام سن کر میرا دماغ چکرا گیا اور پھر لڑکی کے یہ الفاظ کہ وہ کسی بھی لمحے یہاں پہنچ سکتا ہے۔ اگر وہ اس ماحول میں آ گیا اور اس نے صورتحال کا صحیح اندازہ لگا لیا تو جو نتیجہ ہو سکتا ہے مجھے اس کا پورا اندازہ تھا۔ لڑکی کو یقینی طور پر یہ احساس ہو گیا تھا کہ میری تھوڑی دیر پہلے کی ساری خوش فعلیاں ختم ہو گئی ہیں اور ہشمان ذکری کے نام نے میرے ہوش و حواس درست کر دیئے ہیں۔ وہ مسکرا کر بولی۔

"نام نہیں بتایا تم نے اپنا ڈیئر؟"

میں نے لرزتی آواز میں کہا۔ "چیتا...... کیا تمہیں یہ نام پسند نہیں؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پھر آہستہ سے بولی۔ "وہ تو پرانی بات ہے...... میں تمہارا نیا نام پوچھ رہی ہوں۔ کیا سمجھے؟"

میں اس کے الفاظ کے طنز کو محسوس کر کے واقعی شرمندہ ہو گیا تھا۔ بہر حال میں نے کہا۔

"میرا نام خاقان جمشیدی ہے۔"

"نام تو بڑا اچھا ہے۔ ویسے تم بھی کم اچھے نہیں ہو خاقان! سچ جانو، میں برے کردار کی عورت نہیں ہوں، لیکن تم نے مجھے خرید لیا ہے۔"

"تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"امینہ۔" اس نے جواب دیا۔

"ویسے امینہ! بس کیا کہوں میں تم سے۔ بعض اوقات اپنا وجود بھی بے مقصد اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ تم پر کتنا اختیار رکھ سکتا ہوں۔"

وہ بھی جذباتی ہو گئی اور اس نے کہا۔ "خاقان! ہم سب مجبور ہیں۔ ہم سب بہت مجبور ہیں۔ ہشمان ذکری میرا مالک ہے۔ اس نے مجھے خرید لیا ہے۔ وہ بے پناہ دولت مند ہے۔ لیکن دولت سب کچھ نہیں ہوتی۔ تم...... تم میرے وجود کی گہرائیوں میں اتر گئے ہو اور جو شخص روح کو خریدے اس پر کائنات قربان ہے۔ سونے چاندی کے چھپر کھٹ، مخمل کے لحاف اور زردار پردوں میں قید ہو کر صرف ایک سونے کے پنجرے کا قیدی تو سمجھا جا سکتا ہے اپنے آپ کو۔ لیکن اپنی روح کے خریدار سے صحیح معنوں میں محبت ہوتی ہے۔ نجانے تم کیا سمجھ رہے ہو گے میرے ان الفاظ سے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں تمہاری ہو چکی ہوں۔"

میں نے ایک گہری سانس لی تو وہ آہستہ سے بولی۔ "بتاؤ تو، تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں میں؟ مجھ سے کچھ مانگو، کچھ بھی مانگ لو مجھ سے۔ بس آزادی مت مانگنا۔"

"کیا کہہ سکتا ہوں...... میں بھی کیا کہہ سکتا ہوں امینہ! حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی تم سے دور نہیں جانا چاہتا۔"

"آؤ...... میں تمہیں اپنے دل میں چھپا کر رکھوں گی۔ تم میری خواہشات کی تکمیل ہو۔ تم میری بے کیف زندگی کا کیف ہو۔ آؤ پلیز......" اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے وہاں سے نکال کر لے چلی۔ ذرا سی الجھن ضرور تھی ذہن میں لیکن امینہ کے انداز سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ درحقیقت مجھ پر مرمٹی ہے۔ ایک نئی کہانی شروع ہو گئی تھی۔ بے چارہ وردان سادھانی جو ہر بار مجھ پر اعتبار کرتا تھا اور ہر بار میرے لئے نیکیوں کے تھال لے کر آ جاتا تھا اچانک ہی میں ان تھالوں میں سوراخ کر دیا کرتا تھا۔

بہر حال اس کے ساتھ میں دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے ایک آبنوسی

صوفے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "بیٹھو...... میں آتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور میں چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا۔ سرخ قالین کے چاروں کونوں پر چار آبنوسی صوفے بچھے ہوئے تھے جن میں سے ایک پر میں بیٹھا ہوا تھا۔ درمیانی حصہ خالی تھا۔ آتش دان کے کارنس میں ڈائمنڈ کٹ شیشے کے کنٹر میں شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں جن کے اردگرد چھوٹے گلاس اور پیالے سجے ہوئے تھے۔ ایک طرف میزوں پر طاؤس، رباب، دف اور دیگر ساز رکھے ہوئے تھے۔ چھت میں جھاڑ فانوس لٹکے ہوئے تھے جن میں ہلکے بلب روشن تھے۔ ایک طرف خوشبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے اور ہلکے ہلکے دھوئیں سے کمرہ مہک رہا تھا۔

اب سے کچھ دیر پہلے خوفناک درندوں اور سفاک پہرے داروں کے نرغے میں پھنسا ہوا تھا، ایک بدنصیب قیدی تھا، میں جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ کربناک صدیوں پر محیط تھا۔ دو خونخوار پہرے داروں کو جہنم رسید کر کے اب میں ایک الف لیلوی اور بغداد کی رنگین شام کے حسین مناظر سے گزر رہا تھا۔ اس وقت ہیگ، اسمتھ، ہشمان ذکری، رحمان یزدانی سب کے سب پس منظر میں چلے گئے تھے جہاں میں کیف ونشاط کی بلند پروازیں کر رہا تھا اور اسکندریہ کی حسین سرزمین، مصر کی قلوپطرہ کے سوا اور کوئی میرا شریک سفر نہیں تھا۔

امینہ کو دوسرے حجرے میں گئے ہوئے کئی منٹ گزر گئے۔ میں انتظار کرتے کرتے اکتا کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ برآمدے سے ملحق کمرے کی طرف والا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ میں اس کو مخدوش تصور کرتے ہوئے کنڈا چڑھانے کے لئے آگے بڑھا، اسی وقت کسی نے برآمدے سے امینہ کا نام لے کر آواز دی اور میں نے اس آواز کو پہچان لیا......

یہ ہشمان ذکری کی آواز تھی۔

ایک لمحے کے لئے میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھاتا، امینہ بجلی کی طرح دوسرے کمرے سے نکلی اور مجھے ایک طرف دھکیل کر باہر جھانکنے لگی۔ لیکن پتہ نہیں کیا ہوا، امینہ نے عربی میں کچھ کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ابھی تک دروازے کے درمیان ہی کھڑی ہوئی تھی۔ پھر کچھ دیر کے بعد اس نے دروازہ بند کیا اور میری طرف مڑ کر بولی۔

"شکر ہے مشکل ٹل گئی۔ اب تم آرام کرو۔"

"کون تھا؟"

"نہیں، اگر تم اسے ہشمان ذکری سمجھ رہے ہو تو وہ نہیں تھا۔ بہرحال خطرہ تو ہے۔ کیا سمجھے؟" اس نے عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھا پھر بولی۔ "چلو...... اب تم آرام کر لو۔ میرا مطلب ہے کہ اب مجھے بتاؤ کہ زندگی کیا ہے۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ بہرحال میں اسے بتاتا رہا کہ زندگی کیا ہے۔ اور اس کے بعد وہ میرے سینے پر سر رکھ کر سو گئی۔ جس وقت ہماری آنکھ کھلی، روشن دانوں سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی تو گیارہ بج چکے تھے۔ امینہ بھی جاگ گئی اور پھر اچانک جیسے وہ سہم سی گئی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی اور وہ بولی۔

"میں باہر جا رہی ہوں۔ تم اس وقت تک باہر نہ نکلنا جب تک میں واپس نہ آ جاؤں۔"

اس کے بعد وہ باہر چلی گئی۔ میں نے اٹھ کر پھر دروازہ بند کر دیا اور سوچنے لگا۔ صورتحال اس وقت اتنی غیر سنگین تو نہیں ہو گی۔ یقیناً ہشمان ذکری کو پہرے داروں کی لاشوں کا پتہ تو مل گیا ہو گا اور پتہ نہیں باہر کیا ہو رہا ہو۔ کون جانتا ہے کہ ان پہرے داروں کا قاتل ابھی تک اسی قلعے نما عمارت میں ہے۔

بہرحال یہ جگہ کوئی مستحکم حفاظت گاہ نہیں تھی۔ کسی بھی لمحے راز کھل سکتا تھا۔ درحقیقت میں بھڑوں کے چھتے میں پھنس گیا تھا۔ اور امینہ جو اس وقت میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی، پتہ نہیں آگے چل کر کیا بن جائے۔ نہیں خاقان! میرے دوست، اگر زندگی چاہتے ہو تو نکل بھاگو یہاں سے۔ نجانے کہاں سے میرے ذہن میں تیر کی طرح ایک ہی خیال آ گھسا۔ وہ تختی جسے میں بھول ہی گیا تھا، وہ تختی جس کے لئے میں نے یہ تمام خطرات مول لئے تھے یہیں تو ہے۔ آہ...... کیا یہ ممکن ہے کہ امینہ اس کی تلاش میں کوئی مدد کر سکے۔ ابھی میں نے اتنا ہی سوچا تھا کہ باہر سے مجھے آمینہ کی آواز آئی۔

"دروازہ کھولو!"

میں نے تیزی سے دروازہ کھولا تو وہ اندر آ گئی۔ کہنے لگی۔ "سب ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ میں ہوں نا، تمہارے چہرے پر خوف کی ایک شکن نظر نہیں آنی چاہئے۔ تم میری جاگیر ہو، میری مملکت ہو، میرے محبوب ہو۔ آؤ چلو، منہ ہاتھ دھوؤ، ناشتہ تیار ہے۔"

"ہشمان ذکری کے بارے میں کچھ نہیں پتہ چل سکا؟"

"وہ شام تک نہیں آئے گا۔ اس وقت وہ سب کے سب ان لاشوں کو ٹھکانے لگا رہے ہیں جو انہیں محل میں ملی ہیں۔" اس نے کہا پھر مسکرا کر بولی۔ "اور ایک لاش یہاں موجود

ہے۔ امینہ کی لاش۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو امینہ؟"

"واقعی تم نے مجھے قتل کر دیا ہے۔ ختم کر دیا ہے تم نے مجھے۔ اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ ذرا منہ دھو لو۔ باقی ساری باتیں بعد میں کریں گے۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا بھی ہے۔"

میں اس کے پیچھے چلنے لگا۔ دو کمروں سے گزرنے کے بعد اس نے انگلی سے اشارہ کیا اور بولی۔ "وہ غسل خانہ ہے۔"

جب میں منہ ہاتھ دھو کر واپس ہوا تو وہ میز پر بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے چائے تیار کرنا شروع کر دی۔ بہترین ناشتہ سامنے موجود تھا۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔

"تم نے کہا تھا کہ تم مجھ سے کچھ پوچھو گی؟"

"ہاں...... پہلا سوال، کیا تم ہندوستان سے آئے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"ایسی کون سی بات ہے کہ ہشمان ذکری اور اس کا گروہ تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ کیا تمہارے پاس کوئی خزانہ موجود ہے یا تم کوکین، سونا یا کرنسی کے اسمگلر ہو؟ آخر وہ کیا بات ہے کہ وہ تمہیں اغوا کر کے لائے ہیں اور...... اور......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے امینہ! میں تو صرف ایک سرکاری افسر ہوں۔"

"کیا کسٹم آفیسر؟" اس نے سوال کیا۔

"نہیں۔"

"تو پھر کیا وجہ ہے؟ ہشمان کسی معمولی آدمی پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ وہ لاکھوں اور کروڑوں مالیت سے کم کاروبار نہیں کرتا۔ ایک بات بتاؤ، کیا تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟"

"نہیں ڈیئر! میں تم سے کچھ نہیں چھپا سکتا۔ اور اس بات کی امید بھی رکھتا ہوں کہ تم بھی مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ گی۔"

وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ پھر بولی۔ "مگر میں محسوس کرتی ہوں کہ تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتے۔ حالانکہ میں ان چند لمحوں میں تمہارے قدموں کی خاک بن چکی ہوں۔ سنو...... عورت ایسی ہی بیکار اور بے تکی سی چیز ہوتی ہے۔ کسی کو زندگی کا مالک بنا لے تو اپنے

آپ کو مٹا ڈالے۔ اب تم مجھے یہاں مت چھوڑنا۔ میں زندگی کا ہر لمحہ تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ اگر تم چاہو تو مجھے اپنے ساتھ ہندوستان لے چلو۔ میں اب کسی کے کام کی نہیں رہی ہوں۔"

میں اسے دیکھتا رہا، پھر میں نے کہا۔ "یہ تمہاری محبت ہے۔ اور میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔ سنو...... مجھے لوہے کی ایک ایسی تختی کی تلاش ہے جس پر ناقابل فہم زبان میں کچھ عبارت کندہ ہے۔ اور میرے اور ہشمان ذکری کے درمیان یہی محاذ آرائی ہے۔"

"لیکن وہ تختی کہاں ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"ذکری کے قبضے میں ہے۔ لیکن کس جگہ ہے یہ نہیں معلوم۔ ایک بات بتاؤ امینہ! کیا تم میرے لئے اس کا پتہ لگا سکتی ہو؟"

"یہ بتاؤ اس میں کیا ہے؟ کوئی بڑا خزانہ، کوئی قدیم دفینہ؟"

"اس سے بھی بڑھ کر کوئی چیز۔ اگر وہ دستیاب ہو جائے تو ہم کئی سلطنتیں حاصل کر سکتے ہیں۔" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا اور امینہ سوچ میں ڈوب گئی۔ میں خاموشی سے ناشتہ کرتا رہا۔ وہ بھی بہت دیر تک کچھ نہیں بولی تھی۔ آخر اس نے کہا۔

"بہت بڑا مسئلہ پیدا کر دیا ہے تم نے میرے لئے۔"

"نہیں...... اصل میں تم نے اس طرح مجھ سے اپنی محبت اور پیار کا اظہار کیا تو دل کی بات زبان تک آ گئی۔ ورنہ یہ تمہارا فرض نہیں ہے۔ میں صرف تم میں دلچسپی رکھتا ہوں، تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہارے لئے سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہوں۔"

"نہیں میری زندگی، میرے اور تمہارے معاملات اب الگ الگ نہیں رہے۔"

"ہاں واقعی، میرے اور تمہارے معاملات اب الگ الگ نہیں رہے۔"

بڑی خوفناک عورت تھی۔ میں اس سے تھوڑا سا مخلص بھی ہوا تھا جو فطرت بن گئی تھی۔ ایلس فیوری کی قربت کے بعد وہ کم بخت بار بار ابھر آتی تھی۔ ایک حسین عورت، ایک ایسی دلکش عورت جسے خوابوں کا تصور سمجھا جا سکے اگر اس قدر قریب ہو اور اس کا حصول اتنا آسان ہو تو خیر میں یہ نہیں کہتا کہ عمر کے ہر حصہ میں انسان اسی انداز میں سوچتا ہے۔ لیکن جس عمر میں اس وقت میں تھا اس میں اس عورت سے زیادہ قیمتی کوئی چیز میرے لئے نہیں تھی۔ جب بگڑ چکا ہوں تو بگڑ ہی چکا ہوں۔ بہرحال دوپہر تک ہم لوگ ساتھ رہے اور

نجانے کون کون سے جہانوں کی سیر کرتے رہے۔ میں نے اسے چکنا چور کر دیا تھا اور اس نے مجھے۔

لیکن وقت سدا ایک سا نہیں رہ سکتا۔ تیسرے پہر کی چائے کے بعد اچانک قیامت ٹوٹ پڑی اور یہ صور اسرافیل پھونکنے میں ایک کالی مصری حسینہ کا ہاتھ تھا جو چائے کی ٹرے میں زیادہ سامان دیکھ کر امینہ کے طرزِ عمل پر کھٹک گئی تھی اور واپس جانے کی بجائے دوسرے کمرے میں چھپ گئی۔ پھر جب ہم چائے پینے لگے تو کیواڑ کی اوٹ سے جھانک رہی تھی۔

چائے پیتے پیتے سامنے والے دروازے کی طرف میری نگاہ اتفاقیہ طور پر اٹھ گئی تھی اور یہ وہ لمحہ تھا جب وہ سب کچھ دیکھنے کے بعد آہستہ آہستہ کواڑ بند کر رہی تھی۔ صرف ایک لمحہ......

صرف ایک لمحہ میری نظریں اس سے ملیں اور کواڑوں کی درز ہموار ہوگئی۔ میں امینہ سے کچھ کہے بغیر تیزی سے اٹھا اور لباس سے خنجر نکالتا ہوا دروازے کی طرف جھپٹا۔ امینہ میرے طرزِ عمل سے حیران ہو کر میرے پیچھے لپکی تھی۔ میں نے بائیں ہاتھ سے دروازہ کھولا تو وہ بغیر جدوجہد کے کھل گیا۔ میں اندر داخل ہوا تو کنیز کواڑ کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر وہ باہر کی طرف بھاگی۔ میں نے پلٹ کر اس کی گردن پر ہاتھ ڈالا لیکن اس سے پہلے کہ میری گرفت مضبوط ہوتی، امینہ کو سامنے دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کو اندر گھسیٹا، خنجر دانتوں میں دبایا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن پکڑ لی۔ میرے ہاتھوں کی گرفت غیر اختیاری طور پر انتہائی سخت تھی۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔

امینہ حیران حیران اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ ہی لمحوں میں یہ اندازہ ہو گیا کہ کنیز ختم ہو گئی ہے۔ میں نے اسے آہستہ سے فرش پر لٹا دیا۔ امینہ نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا، پھر وہ بولی۔ ''خاقان! آؤ...... یہاں چھپ جاؤ اور میرا انتظار کرو۔''

وہ مجھے ساتھ لئے ہوئے سازوں والے کمرے میں جا پہنچی۔ یہاں صوفوں کے علاوہ اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے پیچھے چھپا جا سکے۔ جس طرف سے میں اندر داخل ہوا تھا اس کے علاوہ باہر نکلنے کا کوئی دروازہ بھی نہیں تھا۔ روشندان اتنے اونچے تھے کہ سیڑھی کے بغیر ان تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ بہر حال میں یہاں چھپ گیا تھا۔ لیکن مجھے یہ اندازہ تھا کہ اس کمرے میں چھپنا چوہے دان میں بند ہونے کی مثال تھا۔ بہر حال اور کوئی جگہ تو نظر نہیں آئی، میں کواڑ کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ باہر نکل گئی تھی۔ خنجر ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔

مجھے یہاں کھڑے ہوئے چند لمحے گزرے ہوں گے کہ تیسرے کمرے سے امینہ کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ تیز لہجے میں کسی سے بات کر رہی تھی۔ میں نے کواڑ کی اوٹ سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن کچھ نظر نہیں آیا۔ درمیان والا کمرہ عبور کئے بغیر کچھ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا تھا۔ ابھی کچھ بھی نہ کر پایا تھا کہ ایک مردانہ آواز آئی۔

''وہ باہر نہیں نکلی خانم!''

اب میری سمجھ میں کچھ آنے لگا تھا۔ یقیناً کوئی کنیز کی چیخ سن کر اندر آیا تھا اور اسی کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ یہ صورتحال کافی خطرناک تھی۔ اگر وہ مطمئن نہ ہوا تو کمروں کی تلاشی لئے بغیر نہ رہے گا۔ یہ سوچ کر میں دروازے سے نکل کر دبے پاؤں درمیانی کمرے میں آیا اور دروازے کی آڑ سے جھانک کر دیکھا، کمرے کے درمیان میں ایک خدمت گار قسم کا آدمی اس کمرے کی طرف منہ کر کے کھڑا تھا جس میں اس کنیز کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ دروازہ بند تھا اور خدمت گار کہہ رہا تھا۔

''نہیں خانم! آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ وہ انتہائی خطرناک آدمی ہے اور ابھی تک پکڑا نہیں جا سکا۔ جبکہ آقا کا خیال ہے کہ وہ ابھی تک محل ہی میں ہے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو تم۔ وہ پہرے دار کو قتل کر کے نکل گیا ہوگا۔ کیا محل اتنی بڑی جگہ ہے کہ ایک آدمی کو تلاش نہ کیا جا سکے؟''

''بس آقا ہی کا یہ خیال ہے۔ آقا آج رات کو اس کے ہوٹل میں بھی جا کر دیکھیں گے۔ بس میں اس لئے الجھا ہوا ہوں کہ کہیں وہ اس طرف نہ آ گیا ہو۔''

''پاگل ہو تم...... مجال ہے کسی کی کہ کوئی یہاں آ سکے؟ اور دیکھو، وہ کہاں گئی؟''

میری نگاہیں اس شخص کا جائزہ لے رہی تھیں۔ امینہ بظاہر تو صحیح انداز میں بول رہی تھی لیکن اس کے لہجے کا پھسپھسا پن صاف محسوس ہو رہا تھا اور یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ پہرے دار اس طرح نہیں جائے گا۔ اب اس وقت میرے لئے ہی کچھ کرنا ضروری تھا۔ امینہ بہر حال عورت ہے، کہیں اس کا عورت پن مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ پہرے دار شک و شبے میں مبتلا ہو کر یہاں سے جائے گا اور دوسرے لوگوں کو اطلاع دے گا۔ ہو سکتا ہے اس کے بعد اور لوگ بھی باہر نکل آئیں۔ چنانچہ کچھ کرنا بہت ضروری تھا...... بہت ہی ضروری۔

امینہ اپنے طور پر میرا دفاع کر رہی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کر نہ پائے گی۔ چنانچہ میں آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور اس کے بعد برق کی طرح کوند کر

پہریدار پر جا پڑا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کیا اور دوسرے ہاتھ سے خنجر اس کے حلقوم پر رکھ دیا۔ اینہ اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ پہریدار نے اپنے منہ پر سے میرا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی لیکن خنجر کا دباؤ پڑتے ہی اس نے اپنا ہاتھ نیچے گرا لیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسے سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے خنجر پر دباؤ ڈال دیا اور پھر جیسے ہی میں نے ہاتھ گھسیٹا، خنجر نرخرے کو کاٹ کر شہ رگ سے گزر گیا۔ خون کا فوارہ ابل پڑا۔ میں نے اس کے منہ سے ہاتھ اٹھا کر اسے پیچھے سے دھکیلا اور وہ منہ کے بل فرش پر گر کر پاؤں رگڑنے لگا۔

میں نے اس کے کپڑوں سے خنجر صاف کیا اور اینہ کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ اس خونی منظر کو دیکھ کر اینہ کا چہرہ خوف سے زرد پڑ جائے گا لیکن وہ بھی معمولی شخصیت نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس کا شائبہ تک نہیں تھا۔ نظریں ملتے ہی وہ اس طرح مسکرائی جیسے کسی انسان کی بجائے کوئی بکرا ذبح کر دیا گیا ہو۔ پہریدار کے جسم کی جنبش آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ پھر ایک لمحے کے لئے اس کا بدن پھڑپھڑایا اور آخر کار ہاتھ پیروں کا ہلنا بند ہو گیا۔

’’چھٹی ہوئی۔‘‘ اینہ کی آواز ابھری۔

’’ہاں...... اس کی چھٹی ہونا ضروری تھی۔‘‘ میں نے کہا۔

’’چلو اسے بھی اسی کمرے میں ڈال دو۔ میں فرش صاف کرتی ہوں۔‘‘ اینہ پُر اطمینان لہجے میں بولی اور میں نے جھک کر لاش کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ پھر اسے گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے گیا۔ اس کا پٹکا کھول کر اس کا لباس اتارا اور اسے اسی کنیز کی لاش پر پھینک دیا۔ پھر میں اس کا لباس لے کر باہر آیا اور خون پر ڈال دیا۔ ادھر اینہ نے چند پرانے پردے نکال لئے تھے۔ اس نے کہا۔

’’نہیں، تم اندر جاؤ۔ میں یہ صورتحال سنبھال لوں گی۔ تمہارا اس کمرے میں رہنا خطرناک ہے۔‘‘

میں کمرے کی طرف چل پڑا اور اندر داخل ہو گیا۔ اب میرے اعصاب کا تناؤ کچھ کم ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر تک میں اسی طرح بیٹھا رہا۔ روشن دانوں سے آنے والی روشنی مدھم ہونے لگی تھی۔ تقریباً ساڑھے چھ بج چکے تھے اور شام ہونے لگی تھی۔ میں ان لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے متعلق سوچنے لگا۔ اینہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اسے دیر ہوئی تو میں نے

دروازہ کھول کر باہر دیکھا، وہ گیلا پردہ ہاتھ میں لئے فرش کو صاف کر رہی تھی۔ غالباً یہ اس کا آخری کام تھا کیونکہ اس کے بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر مسکراتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔

’’تمہاری ہر کوشش مجھے بچانے کے لئے ہے اینہ! آخر یہ کھیل کب تک جاری رہے گا؟‘‘

’’تمہارا کیا خیال ہے؟‘‘

’’میں سمجھتا ہوں کہ یہ کھیل میری موت پر ہی ختم ہوگا۔‘‘

’’نہیں...... میں تمہیں زندہ رکھوں گی۔ کیا سمجھے؟ چاہے اس کے لئے مجھے تمہیں یہاں سے نکالنا ہی کیوں نہ پڑے۔‘‘ اس نے پلٹ کر تمام روشنیاں جلا دیں۔

’’ان لاشوں کا کیا ہوگا؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’ان کی پرواہ مت کرو۔ میرا ایک غلام انہیں ٹھکانے لگا دے گا۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’تمہارا کیا خیال ہے، کیا میں اتنی ہی بے بس ہوں؟‘‘

میں خاموش ہو گیا۔ لمحات تو تبدیل ہو ہی رہے تھے۔ اچانک کسی نے باہر والے کمرے کا دروازہ بجایا تو میں نے چونک کر اینہ کو دیکھا۔ وہ فوراً باہر نکل گئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور پستول نکال کر کواڑوں کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئی تو کہنے لگی۔

’’زندال کو بلایا ہے میں نے۔ اسے اس کام کے لئے تیار کرنا ہے۔‘‘

’’وہ کیسے تیار ہوگا؟‘‘

’’بس سنہری چمک سارے کام کر دیتی ہے۔ اچھا سنو، کھانا آ رہا ہے۔ لیکن میں تمہارے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہو سکوں گی کیونکہ مجھے ہشمان ذکری کے آنے کی اطلاع ملی ہے۔ اس کے یہاں آنے سے پہلے مجھے اس کے پاس پہنچ جانا ہوگا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے کہا اور وہ واپس چلی گئی۔ ایک بار پھر میں اس تمام صورتحال کے بارے میں سوچنے لگا۔ بری طرح پھنس گیا تھا۔ ان کمروں سے نکلنے کا ایک کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اگر یہاں کوئی خفیہ تہہ خانہ ہوتا تو آنے والوں کی نگاہوں سے محفوظ رہا جا سکتا تھا لیکن یہاں تو قدم قدم پر میری نشاندہی ہو جاتی ہے۔ کتنے افراد کو قتل کروں گا۔ اور کیا ضروری ہے کہ میں ہی سب پر قابو پاتا رہوں؟

میں انہی خیالات میں گم تھا کہ اچانک پھر بیرونی کمرے میں کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ میں چونک کر اس طرف متوجہ ہوا اور دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔ اینہ کسی مرد کے ساتھ بات کر رہی تھی۔ میں نے فوراً ذہن دوڑایا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ آواز زندال کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی کیونکہ اینہ اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن بولنے والے کا لہجہ خادمانہ نہیں تھا، وہ تحکمانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس وقت نجانے کیوں میں اس آواز کو پہچان نہیں پا رہا تھا لیکن میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ ہشمان ذکری کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ دروازہ اندر سے بند کر دوں۔ لیکن یہ زیادہ خطرناک بات تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ صرف اینہ کی کوششوں پر بھروسہ کرنا حماقت کی بات تھی۔

اچانک ہی میری نگاہیں آتش دان کی جانب اٹھ گئیں۔ پہلی نگاہ میں وہ مجھے بے حد آرائشی نظر آیا تھا۔ اس میں آگ روشن کی جانے کی کوئی علامت نہیں تھی۔ کارنس پر گلدان اور دوسرے ڈیکوریشن پیس رکھے ہوئے تھے۔ میں آگے بڑھا اور میں نے اس کی چمنی میں جھانکا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ آتش دان کی چمنی بلندی تک گئی ہوئی تھی اور اتنی کشادہ تھی کہ ایک آدمی چوڑا ترچھا ہو کر اینٹوں سے باہر نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ چمنی کے اندر نکلی ہوئی اینٹوں پر اگر ہاتھ جما کر اوپر پہنچنے کی کوشش کی جائے تو کامیابی ہو سکتی تھی۔ چمنی کے اختتام پر برجی بنی ہوئی تھی جس کے چاروں طرف روشن دان نما چوڑے سوراخ تھے۔ مشرقی سمت والے سوراخوں میں سے خاصی روشنی اندر آ رہی تھی۔

میں نے کسی آہٹ یا خطرے کا اظہار کئے بغیر پستول کوٹ کی جیب میں ڈالا اور اس کے بعد چمنی کے وسط میں پہنچ کر سیدھا ہوا، دونوں ہاتھ بلند کئے اور اینٹوں کے سرے پکڑ کر پورا زور لگا کر اپنے جسم کو اوپر کھینچا۔ میرے دونوں پاؤں نچلی اینٹوں پر ٹک گئے اور میں آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ ابھی میں آدھے راستے پر پہنچا تھا کہ دھماکے سے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور پھر کسی کی غراتی ہوئی آواز۔

''میں نہیں جانتا تم میرے دروازہ کھول کر دیکھنے میں اتنی شدت سے اعتراض کیوں کر رہی ہو۔'' ایک لمحے تک کوئی آواز سنائی نہ دی۔ پھر اینہ کی آواز ابھری۔

''ہاں دیکھ لو، کیا ہے یہاں۔ بتاؤ، کیا ہے؟ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اتنا ہی اعتماد کرتے ہو مجھ پر؟''

''دیکھو میری بات سنو، میں جس صورتحال سے دوچار ہوں اس کا تمہیں صحیح طور پر اندازہ نہیں ہے۔ بس نجانے کیوں تمہارے انداز سے مجھے شک ہونے لگا تھا۔''

''ٹھیک، ٹھیک، ٹھیک۔ اب مجھ پر شک بھی کرنے لگے ہو تم۔ ایسا ہی ہوتا ہے ہشمان ذکری، ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''تم پاگل ہو...... پاگل ہو تم۔'' ہشمان ذکری کا لہجہ اب معذرت آمیز ہو گیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میری اس گمشدگی سے اینہ پر کیا گزر رہی تھی۔ لیکن شاید وہ پُراعتماد ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک غلام مجھ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ٹھیک ہے جیسا تم پسند کرو۔''

''پاگل ہو تم...... پاگل ہو اینہ! حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔ وہ بدبخت ہم لوگوں کو الّو بناتا پھر رہا ہے۔ ایک آدمی ہے اور اس کے مقابلے پر ایک عظیم الشان گروہ۔ پتہ نہیں کہاں مر گیا ہے جا کر۔ میں سخت پریشان ہوں۔ خیر چھوڑو۔''

''تم اسے اس کے ہوٹل میں تلاش کرو۔ وہ تمہیں وہیں ملے گا۔ جب تم خود کہہ رہے ہو کہ وہ اس قدر چالاک اور تیز آدمی ہے تو تمہارا کیا خیال ہے وہ یہاں جھک مار رہا ہوگا؟''

آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔ تھوڑی دیر تک کمرے میں مکمل سکوت رہا۔ اور پھر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ بند ہوا اور اینہ کی آواز ابھری۔

''کہاں ہو تم خاقان! کہاں ہو بھئی...... کہاں ہو تم؟ کہاں غائب ہو گئے؟ باہر تو آؤ۔ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔''

میں آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ اور جب میں آتش دان سے جھک کر باہر نکلا تو وہ حیران حیران سی کمرے کے وسط میں کھڑی چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے حیرت زدہ انداز میں گردن ہلائی اور بولی۔ ''خدا کی پناہ، تم یقین کرو خود میرا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا۔ ویسے اس وقت میں جن حالات سے گزری ہوں، تم یہ سمجھ لو کہ میرا خون بے پناہ کم ہو گیا ہو گا۔ میں بس سمجھ رہی تھی کہ اب یہ میرے آخری لمحات ہیں۔ تمہیں دیکھتے ہی ہشمان ذکری پہلے مجھ پر گولی چلائے گا پھر تم پر۔''

''اب ایسی بات بھی نہیں ہے اینہ۔ میں قتل عام کا عادی ہو گیا ہوں۔ اگر ہشمان ایسی کوئی کوشش کرتا تو شاید یہ اس کی زندگی کے آخری لمحات ہوتے۔ مگر ابھی اس کی زندگی باقی

ہے کہ اس نے مجھے اور تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ کرنا کیا ہے اب؟"

"بس کچھ نہیں، یہ لاشیں ٹھکانے لگ جائیں تو سارا خطرہ ٹل جائے گا۔"

"اگر ان لاشوں کے لئے کوئی بندوبست نہ ہو سکا تو پھر میں انہیں رات کی تاریکی میں اٹھا کر چیتوں کے پنجرے میں پھینک آؤں گا۔"

"نہیں، بے فکر رہو۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" اس نے کہا اور پھر رات کو تقریباً گیارہ بجے وہ مجھ سے اجازت لے کر باہر گئی اور خود اس نے اپنے اس غلام کو جس کا نام زندال تھا بلایا اور اس سے باتیں کرتی رہی۔ رات کو تقریباً ساڑھے بارہ بجے اس نے کمرہ خالی ہونے کا اعلان کیا اور کچھ دیر کے بعد وہ ہمیں کھانے کی ٹیبل پہنچا گیا۔ اسی سے اینہ کو اطلاع ملی تھی کہ ہشمان ذکری چلا گیا ہے۔

"وہ کہاں گیا ہو گا اینہ؟" میں نے سوال کیا تو اینہ کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"عیاش طبع انسان ہے، بہت سی حسینائیں اس کی منتظر ہوں گی۔ وہ کس رات کہاں جائے گا، کوئی بھی نہیں جانتا۔ اچھا ایک بات بتاؤ، کیا تم اس جگہ پہنچنا چاہتے ہو جہاں وہ اپنے قیمتی جواہرات اور دولت رکھتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو افسوس وہ کمرہ مقفل ہوتا ہے اور دروازے پر مسلح پہریدار ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہاں تک جانے والی سیڑھیوں میں بجلی کی گھنٹیوں کا سلسلہ ہے۔"

"تم میرے وہاں جانے کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہو؟"

"ظاہر ہے تم اس تختی کی تلاش وہیں کرو گے۔ حالانکہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تختی وہیں موجود ہو۔"

"اوہ..... تم بہت ذہین ہو اینہ! بہت دور تک سوچتی ہو۔ ویسے وہ کمرہ کہاں ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اوپر کی منزل کے مغربی کونے میں آخری کمرے سے پہلا۔ دروازے کے سامنے پہریدار سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ اب بولو کس طرح وہاں پہنچو گے؟"

"ہاں..... اوہو، ایک بات بتاؤ اینہ! یہاں دوسرے کمروں میں بھی آتش دان ہیں اس طرح کے؟"

"آتش دان؟"

"ہاں۔"

"وہ تو ہر کمرے میں ہیں۔"

"تو پھر کامیابی کا پورا پورا امکان ہے۔ میں اسی طریقے سے کوشش کروں گا۔"

"واہ..... لگتا ہے باقاعدہ نقب زنی کرتے رہے ہو۔"

"نہیں باقاعدہ نہیں اینہ! یقین کرو بس ضرورت ہے، مجبوری ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔ لیکن خطرہ تم سے دور نہیں ہو گا خاقان! سوچ لو، ویسے بھی تم چہرے سے چور یا ڈاکو نہیں لگتے۔"

"تمہارا شکریہ....."

"کیا کرتے رہے ہو باقی زندگی میں۔ میرا مطلب ہے ابتدائی زندگی میں؟"

"بہت کچھ۔" میں نے جواب دیا اور میرے ذہن میں چھناکے ہونے لگے۔ میں کیا کرتا رہوں گا، یہ مجھے یاد آنے لگا۔ اور میں سوچنے لگا کہ اب جو کچھ میں کر رہا ہوں کیا وہ بھی ایسا ہے کہ وقت مجھے اس کے لئے معاف کر دے؟

اینہ نے کہا۔ "اور اب ایک بات تم بھی سن لو۔ تمہاری زندگی اب تمہاری نہیں ہے، میری بھی ہے۔ میں تمہیں اپنی آنکھوں کی بینائی کی طرح محفوظ رکھنا چاہتی ہوں، اپنی لگن میں میری طلب کو نہ بھول جانا۔ میں نے بھی زندگی کی بازی لگا کر تمہارا ساتھ دیا ہے۔ تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ ویسے تو یہ دیوانوں کی طرح نثار ہوں گے، ہمارے بدن کا طواف کریں گے لیکن کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف ہو جائے تو تم یہ سمجھ لو کہ یہ انسان کو جانور سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔"

"میں جانتا ہوں اینہ!"

"زندہ رہنا اب اپنے لئے نہیں، میرے لئے۔" اس نے کہا۔

بہرحال آتش دان کا پہلا تجربہ میرے لئے خاصا حوصلہ بخش تھا۔ چنانچہ اس بار اس آتش دان کی اینٹوں پر پاؤں رکھ کر اوپر پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور زیادہ وقت بھی نہیں لگا۔ میں برجی تک پہنچ گیا۔ دو تین منٹ کے بعد میں برجی کی محراب دار ہوا داروں سے باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ میری نظروں سے چار فٹ نیچے اس کمرے کی چھت تھی جو نیچے چھوڑ آیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے کمروں کی چھتیں بھی تھیں جو قطار در قطار شمال سے جنوب کی جانب چلی گئی تھیں۔ میں ان محدود سوراخوں سے باہر نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ

ایک زاویے پر آ کر نگاہ رک جاتی تھی۔ اب مجھے یہاں سے باہر نکلنا تھا اس لئے میں نے خنجر نکال کر اینٹوں کے درمیان سے چونا کھرچنا شروع کر دیا اور پھر تھوڑی سی کوشش سے ایک اینٹ نکل آئی۔ میں نے اسے آہستہ سے بیرونی سمت ہاتھ بڑھا کر چھت پر چھوڑ دیا اور اس کے بعد مسلسل یہ کام کرتا رہا۔ حالانکہ پہلے سے صحیح طور پر یہ اندازہ نہیں تھا کہ اب اتنی آسانی سے یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ لیکن اب میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد میں نے اپنا بدن سکوڑا اور باہر اتر کر چھت پر چڑھ گیا۔ میری نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔

صحن والے سرے پر آ کر میں نے شمالی سمت والے کمروں کی طرف نظر ڈالی۔ کمروں کے سامنے برآمدہ ہونے کے باعث صحیح کمرے کا دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن ایک کمرے کے سامنے مجھے روشنی نظر آئی اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ پہریدار یہیں ہونا چاہئے۔ بہرحال میں دبے پاؤں چلتا ہوا متعدد کمروں کی چھتیں عبور کر کے اس طرف پہنچا اور چمنیاں گن گن کر ہشمان ذکری کے کمرے کا تعین کیا اور پھر شمال مغربی کونے کے آخری کمرے کی چمنی کی اینٹوں کو جوڑ کر کریدنا شروع کر دیا۔ آدھے گھنٹے کی مسلسل اور انتھک محنت سے جس میں آواز نہ ہونے کی کوششیں بھی شامل تھیں۔ میں نے چار اینٹیں نکال لیں اور پھر میں چمنی پر چڑھ کر نیچے اترنے لگا۔ ابھی آدھا فاصلہ طے کیا تھا کہ کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی کا احساس ہونے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد میرے پاؤں اس فرش پر ٹک گئے۔

میں نے رک کر آہٹ پر پاؤں لگائے۔ اندر مکمل سکوت طاری تھا۔ میں نے جھک کر آتش دان سے باہر سر نکال کر کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کارنس سے کچھ بلندی پر صرف ایک بلب روشن تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر بیش قیمت قیمتی پردے پڑے ہوئے تھے۔ مسہری پر ریشمی بستر اور لحاف تھے۔ کمرہ اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ الماریوں کے درمیان خوبصورت میزوں پر طرح طرح کا آرائشی سامان سجا ہوا تھا۔ میری آنکھیں ان چیزوں کی جگمگاہٹ سے چکا چوند ہو گئی تھیں اور کچھ لمحوں کے لئے میں اپنا اصل مقصد بھول گیا تھا۔ اس کمرے کی شاندار آرائش پر غور کرنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس الماری کی دراز سے سلسلہ شروع کیا جائے۔ لوہے کی ایک بدوضع سی تختی اس خوبصورت کمرے میں رکھی بھی گئی ہوگی یا نہیں؟

کافی دیر تک کسی سحر زدہ انسان کی طرح کمرے کا جائزہ لینے کے بعد مجھے اپنا مشن یاد

آیا اور وقت ضائع ہونے کا احساس ہوا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ پھر میں نے مسہری کے قریب پڑی ہوئی پہلی الماری کا ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھل گیا۔ سب سے اوپر والے خانے میں ایک ٹیلی فون رکھا ہوا تھا، دوسرے میں سگریٹ کے چند پیکٹ، وہسکی کی بوتلیں اور گلاس وغیرہ، تیسرے میں کچھ انگریزی رسالے۔ اس کے سوا اس میں کچھ نہیں تھا۔ میں نے الماری بند کر کے دوسری، تیسری اور پھر اسی طرح یکے بعد دیگرے کئی الماریاں دیکھیں، تختی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ مسہری کا کشن اور تکیے الٹ پلٹ کر ڈالے، یہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ پھر میں نے تمام کمرے کا پھر سے جائزہ لینا شروع کیا۔ دیواروں پر آویزاں تصاویر پر نظر ڈالی، مسہری کی پائنتی کی طرف ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر فریم میں جڑی ہوئی ایک ایسے زاویے پر آویزاں تھی جہاں سے مسہری پر سونے والا لیٹے لیٹے اسے دیکھ سکتا تھا۔ میں ہشمان ذکری کی اس کیفیت پر ہنس پڑا۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ تصویر شاہکار تھی لیکن اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر وقت اسے نگاہوں کے سامنے رکھنا کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

میں کچھ سوچ کر آگے بڑھا، تصویر کو دیوار سے ہٹانے لگا۔ اوپر کا ایک سرا ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ دوسرا حصہ دیواروں پر لگی کیلوں پر ٹکا ہوا تھا۔ تصویر آسانی سے علیحدہ ہو کر میرے ہاتھوں میں آ گئی۔ مگر اس کا وزن دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ معلوم ہوتا تھا تمام فریم ٹھوس فولاد کا بنا ہوا ہے۔ میں نے تصویر کو پلٹ کر دیکھا، پچھلی طرف رنگین کاغذ چپکا ہوا تھا۔ میں نے ناخن سے کرید کر تھوڑا سا کاغذ کو پھاڑ کر دیکھا، کاغذ کے نیچے ایک فولادی پلیٹ تھی جس پر کچھ حروف نظر آ رہے تھے۔ اور دفعتہً ہی میرے سارے وجود میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یہ وہی تختی تھی جسے میں تلاش کر رہا تھا۔

میں نے بمشکل تمام خود کو سنبھالا اور کاغذ کو اتارنے کی کوشش ترک کر کے خنجر کی نوک سے ایک طرف کی کیلیں اوپر کی طرف موڑ کر تختی کھینچ لی۔ تختی مسہری پر رکھ کر میں نے تمام کیلیں پھر دبا کر اس فریم میں تصویر کو مضبوطی سے جمایا اور اسی زاویے پر لٹکا دیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ عریاں تصویر محض ایک پردہ تھا۔ یہ قیمتی اشیاء کو رکھنے کا مقام تھا۔

میں نے کمرے میں ایک بار پھر نگاہ دوڑائی۔ کوئی بے ترتیبی یا الٹ پلٹ نہیں ہونے پائی تھی۔ میں نے اپنی تمام تلاش کے دوران کسی چیز کو اس طرح تتر بتر نہیں کیا تھا کہ اس کے بارے میں اندازہ ہو جائے۔ صرف آتش دان کے فرش پر چونا اور کوڑا کرکٹ پڑا نظر آیا

لیکن اسے بھی صاف کرنا ضروری تھا۔ آہ...... مجھے اس طرح کامیابی حاصل ہو جائے گی میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

بہرحال میں نے اس کوڑے کو اٹھا کر قالین کے نیچے پھیلا دیا۔ اب اگر ہشمان ذکری اس کمرے میں آنے کے بعد اس تصویر پر سرسری نگاہ ڈالے گا تو اسے کوئی شبہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ صبح کہ اسے اس بارے میں پتہ چل جائے گا۔

بہرحال میں نے تختی اٹھائی اور آتش دان کے راستے اوپر چڑھنے لگا۔ اپنی اس کامیابی پر میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اب بعد میں جو کچھ ہوگا وہ تو بعد کی بات ہے۔ فی الحال میری یہ کوشش کارگر ثابت ہوئی تھی۔ پہرے دار تک کو یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اندر کچھ ہو رہا ہے۔

اب میرے سامنے سب سے اہم مسئلہ تھا یہاں سے نکلنے کا۔ میں چھت پر پہنچ گیا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد بیرونی دیوار کی طرف جا کر نیچے نظر ڈالی۔ چھت کی بلندی کم از کم پچاس فٹ تھی اور سیڑھی یا رسّی کی مدد کے بغیر زمین پر نہیں اترا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر کسی کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو مصیبت بن جائے گی۔ مجھے اس وقت تک حاصل کی ہوئی تمام کامیابی آخری مرحلے پر کھونے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ یہ اندازہ ہوتا جا رہا تھا کہ یہاں سے نکلنا مشکل نہیں، ناممکن ہے۔

آخر کار میرے قدم آہستہ آہستہ اسی روشن دان کی طرف اٹھنے لگے جو امینہ کے کمرے میں اترتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے لئے ہشمان کی واپسی تک یا زیادہ سے زیادہ صبح تک بچ نکلنے کی کوشش کا وقت تھا۔ اگر اس مختصر وقفے میں امینہ میرے لئے کوئی راستہ نکال سکتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ صبح ہونے کے ساتھ نہ میں بچوں گا اور نہ وہ۔ کیونکہ ہشمان ذکری پہلے ہی اس کی طرف سے مشکوک ہو گیا ہے۔ اور اب ٹوٹے ہوئے آتش دان کو دیکھنے کے بعد تو وہ امینہ کو خاک وخون میں ہی نہلا دے گا۔ اور اگر میں کسی طرح نکل بھی جاؤں تو امینہ کم از کم نہیں بچ سکے گی۔

میرے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ میں ٹوٹے ہوئے روشن دان سے اندر داخل ہوا اور پھر آہستہ آہستہ نیچے اتر کر کمرے میں پہنچ گیا۔ امینہ اپنی خوابگاہ میں جا چکی تھی۔ میں نے کیواڑوں پر ہاتھ رکھ کر دھکیلا، اس نے دروازہ اندر سے بند نہیں کیا تھا۔ دروازہ کھلا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ مسہری پر لیٹی ہوئی تھی۔ آہٹ پاتے ہی چونک کر اٹھ گئی اور میری طرف

دیکھ کر بولی۔

”آہ...... تم آ گئے۔ تم خیریت سے تو ہو خاقان؟“

”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ یہ دیکھو۔“ میں نے تختی اس کے سامنے کر دی۔

”واہ...... واہ...... تم واقعی ایک دلیر مرد ہو۔ لیکن اب کیا ہوگا؟“

”اب یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو امینہ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”لیکن کیسے؟ کس طرف سے؟“

”یہ مجھے تم ہی بتا سکو گی میری زندگی! صبح ہونے سے پہلے اگر ہم یہاں سے نہ نکلے تو ہم دونوں کو ختم کر دیا جائے گا۔ یہ بات اب تم بھی جانتی ہو کہ تم یہاں رہ کر زندہ نہیں بچ سکتیں۔“

”ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے اچھا مجھے دو منٹ دو، میں ابھی آتی ہوں۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔“ وہ مجھے درمیانی کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے اپنے کپڑوں سے گرد وغبار جھاڑ کر سگریٹ سلگایا۔ جب وہ واپس لوٹی تو دوسرے لباس میں تھی۔ اس نے کندھے پر ایک لبادہ سا ڈالا ہوا تھا اور ہاتھ میں سیاہ برقع تھا۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

”لو، تم یہ لبادہ پہن لو اور چہرہ مفلر میں لپیٹ لو۔ تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ کوئی تمہاری طرف متوجہ نہ ہو۔“

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس نے برقع پہنا اور چلنے لگی۔ میں نے گلے اور چہرے پر مفلر لپیٹ لیا تھا اور اس کے ساتھ باہر نکل آیا تھا۔ اس نے برآمدے والا دروازہ کھول کر اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ وہ نپے تلے قدم رکھتی ہوئی چلتی رہی۔ پھر ہماری نگاہ ڈیوڑھی میں ایک پہریدار پر پڑی جو مسلح تھا اور اسٹول پر مستعد بیٹھا ہوا تھا۔ امینہ کو دیکھ کر وہ چونکا تو امینہ نے اس سے کہا۔

”زنداں کہاں ہے؟ یہاں موجود ہے یا آقا کے ساتھ گیا ہے؟“

”خانم! وہ آقا کے ساتھ تو نہیں گیا۔ مگر آپ اس وقت کہاں جا رہی ہیں؟“

”کیا تمہیں اس کا علم نہیں ہے؟“

”نہیں، مجھے کچھ نہیں معلوم۔“

”میں ایک اہم جلسے میں شرکت کرنے کے لئے جا رہی ہوں۔ مجھے اس کی ہدایت کی گئی تھی۔ اے، تم کیا بیوقوفوں کی طرح کھڑے منہ دیکھ رہے ہو۔ جاؤ باہر جا کر کوئی ٹیکسی

تلاش کرو۔'' اس نے میری طرف رخ کر کے کرخت لہجے میں کہا اور میں تیزی سے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا جو ذرا فاصلے پر تھا۔ مجھے رات کو اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابینہ نے برقع سے ہاتھ نکال کر پہریدار کو کچھ رقم دی اور بولی۔

''سنو...... میں صبح دس بجے لوٹوں گی۔ بہتر ہوگا کہ تم میرے جانے اور آنے کا ذکر آقا سے نہ کرو۔ ٹھیک ہے؟'' پہریدار کو غالباً خاصی رقم مل گئی تھی۔ اس نے گردن خم کی۔

بہر حال ابینہ میرے پیچھے پیچھے آنے لگی۔ میں نے صدر دروازہ کھولا اور ہم دونوں ساتھ ساتھ باہر نکل آئے۔ روشوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے پھاٹک کے قریب پہنچے تو ابینہ نے مجھے رک جانے کا اشارہ کیا اور پہرے دار سے کرخت لہجے میں بولی۔

''تم میری صورت کیا دیکھ رہے ہو۔ دروازہ کھولو، میں ابینہ ہوں۔'' اس نے برقع کا نقاب ایک طرف کیا تو پہرے دار نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں خانم! ہم مجبور ہیں۔ آقا کا حکم ہے کہ اس وقت کسی کو بھی باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ ہم حکم کے غلام ہیں۔ اصل میں خانم، کسی شخص کی تلاش ہے جس کے لئے......''

''چلو...... تم احمق ہو گیا۔ آقا نے تم سے یہ بھی کہا ہے کہ ابینہ کو بھی باہر نہ نکلنے دیا جائے؟ اے، تم کیا کھڑے دیکھ رہے ہو۔ عجیب احمق آدمی ہو تم، چلو باہر نکلو۔ سمجھے تم۔ پہرے دار، میں کہیں بھی جا سکتی ہوں۔ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اجازت ہے۔'' میں نے محسوس کر لیا کہ ابینہ، پہریدار کو الجھا رہی ہے۔

بہر حال میں باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ پہریدار کسی بھی قیمت پر ابینہ کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں دے گا۔ چنانچہ میں نے پچھلا راستہ استعمال کیا۔ جنگلے کی بلندی کا اندازہ کر کے میں جنگلے پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چنانچہ کچھ لمحوں کے بعد میں جنگلے کے اوپر پہنچ گیا اور اپنا توازن قائم رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا آدھا جسم جنگلے سے گزر گیا لیکن دوسری ٹانگ لبادے کی وجہ سے پھنس گئی اور میں لٹک گیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے لبادے کا کنارہ پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کی تو پورا بدن لبادے پر آ گیا اور نوک دار جنگلا لبادے میں پوری طرح پیوست ہو گیا۔ میں دونوں ہاتھ چھوڑ کر کود پڑا۔ ایک جھٹکا لگا اور لبادے کا کچھ حصہ پھٹ کر اوپر رہ گیا۔ میں دھڑام سے نیچے گرا تھا۔ میرے گرنے کی آواز سن کر پہریدار نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ اسی وقت ابینہ نے چیخ کر کہا۔

''اے بیوقوف! یہ کیا ہوا؟'' اس نے یہ الفاظ کہے تھے کہ میں تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ تختی میرے لبادے سے نکل کر نیچے گر پڑی تھی۔ اچانک ہی ابینہ نے کہا۔

''یہ کون ہے...... پکڑو اسے۔ یہ میرے ساتھ تو نہیں آیا۔''

''کیا......؟'' پہرے دار چیخا۔ اس نے چابی نکال کر ابینہ کی طرف پھینکی اور بولا۔ ''تالا کھولئے۔ ورنہ یہ بھاگ جائے گا۔''

ابینہ دروازہ کھولنے لگی۔ میں بھاگنے کی بجائے ایک دم رکا اور چوکیدار برق رفتاری سے آگے بڑھا۔ لیکن اس کی بدنصیبی تھی کیونکہ دوسرے لمحے میں نے اس کی کنپٹی کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ اس کی چیخ پستول کے دھماکے میں گم ہو گئی اور وہ دیوار کی طرح زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے ابینہ کو اشارہ کیا اور ہم دونوں سامنے بنے ہوئے مکانوں کی طرف دوڑنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ایک گلی کے قریب پہنچ کر ہم رکے، پلٹ کر پیچھے دیکھا تو محل میں اسی طرح خاموشی تھی۔ راستہ بھی سنسان پڑا ہوا تھا۔ اس وقت صبح کے تقریباً پانچ بج چکے تھے لیکن ابھی قرب و جوار اور ماحول میں زندگی بیدار نہیں ہوئی تھی۔ اسکندریہ کے اس علاقے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ مکانوں کی آڑ میں پہنچ کر میں نے وہ تختی ابینہ کو دیتے ہوئے کہا۔

''ابینہ! اسے برقع میں چھپا لو۔ کیا خیال ہے، یہاں زندگی کس وقت بیدار ہوتی ہے؟''

''اصل میں یہ علاقہ ذرا مختلف قسم کا ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ آگے چل کر ہمیں کم از کم چائے خانے کھلے ہوئے مل جائیں گے۔'' ابینہ نے جواب دیا۔

''آگے بڑھ رہے ہیں۔ اگر اس دوران کوئی گڑبڑ ہو جائے اور ہم ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں تو خیال رکھنا تم الحمرا پہنچنے کی کوشش کرنا۔ میں وہیں تمہیں مل جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے تختی اس کے حوالے کی تو اس نے تختی چھپاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے...... لیکن تمہیں اپنا نام تبدیل کرنا ہوگا۔ کوئی ایسا نام جو تمہیں پسند ہو۔''

''جو بھی تم چاہو۔''

''مسٹر برک۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''کیا حرج ہے، اچھا نام ہے۔ اس نام سے کوئی صحیح اندازہ نہیں ہوتا کہ عیسائی ہے، یہودی ہے یا مسلمان۔''

وہ ہنسنے لگی۔ اب ہم آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ دو تین گلیوں سے گزرنے کے بعد ایک کشادہ بازار آ گیا۔ گلی سے باہر نکلے ہی تھے کہ ایک پولیس مین نظر آیا جو غور سے ہماری

طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے انگلی اٹھا کر ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔

"ہیلو سر! کیا آپ اٹیلین ہیں؟" اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"نہیں آفیسر برٹش کیپٹن آف اے مرچینٹشپ۔"

"سوری سر، سوری۔" پولیس مین نے ٹوپی چھو کر سلام کرتے ہوئے کہا۔

"اور کچھ؟"

"نو تھینکس۔" وہ بولا اور وہاں سے واپس مڑ گیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہمیں ایک چھوٹا سا ریستوران نظر آیا جس میں صرف ایک آدمی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا خیال ہے، اگر ہم اس ریستوران میں داخل ہوں تو کوئی ہمیں تعجب کی نگاہوں سے تو نہیں دیکھے گا؟"

"دیکھتا ہے تو دیکھتا رہے۔ ویسے یہاں فیملی کیبن بھی ہوا کرتے ہیں۔" وہ بولی۔

"آؤ پھر چلتے ہیں۔"

ہم دونوں ریستوران میں داخل ہو گئے۔ میز پر بیٹھا ہوا آدمی غور سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ امینہ آگے بڑھ کر زینے طے کرنے لگی۔ نیچے باورچی خانے کے دروازے سے ایک خانساماں نے اس کو عربی میں خوش آمدید کہا اور پھر بولا۔ "آپ کیا پسند کریں گی؟"

امینہ نے چائے، قہوہ اور ناشتے کی چند چیزوں کے نام لئے اور ہم پہلی منزل میں پہنچ کر ایک فیملی کیبن میں داخل ہو گئے۔ دروازے پر پہنچتے ہوئے امینہ نے کہا۔

"آؤ بیٹھو...... نام میں بھول گئی۔"

"برک...... برک۔" میں نے کہا۔

"کیا تمہارے پاس رقم ہے؟"

"ہاں۔ بلکہ ایسا کرو اس میں سے تم تھوڑی سی رقم رکھ لو۔ کام آئے گی۔" یہ کہہ کر میں نے جیب سے خاصے ڈالر نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے میرا ہاتھ پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس انگلش پاؤنڈ ہیں۔ انہیں رہنے دو۔"

اسی وقت بیرا ناشتے اور چائے کی ٹرے لئے ہوئے آتا دکھائی دیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "اس سے اخبار طلب کر لو۔ کیا اخبار آ گیا ہوگا؟"

"ہاں...... یہاں اخبار ساڑھے چار بجے تک مل جاتا ہے۔" امینہ نے جواب دیا۔ جب

ویٹر ٹرے رکھ کر جانے لگا تو اس نے عربی میں اسے ایک انگریزی اخبار لانے کو کہا اور وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ ہم نے چائے پینی شروع کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا انگریزی اخبار دے کر چلا گیا۔ میں نے سرخیوں پر ایک نظر ڈالی اور اس کے بعد امینہ سے وہ فولادی تختی طلب کی۔ فولادی تختی کو ہم نے اخبار میں لپیٹ لیا۔

آفتاب آہستہ آہستہ طلوع ہوتا جا رہا تھا اور ریستوران میں لوگوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ کچھ جوڑے بھی آئے تھے جو اوپر کی جانب رخ کر رہے تھے۔ میں نے امینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہماری طرح اور بھی لوگ صبح کو جاگ جاتے ہیں۔"

"یہ سب وہ لوگ ہیں جو مختلف جگہوں پر ملازمتیں کرتے ہیں اور اپنے کام پر جانے سے پہلے صبح کا ناشتہ اس طرح کے ریستورانوں میں کر لیا کرتے ہیں۔"

"کیا خیال ہے، چلا جائے یا کچھ اور پینا ہے؟"

"نہیں چلو۔" وہ اٹھ گئی۔ میں نے اس کی طرف رخ کر کے گردن ہلائی اور پھر امینہ نے نقاب اپنے چہرے پر ڈال لیا اور بولی۔ "تو پھر کیا خیال ہے۔ کیا، کیا جائے؟"

"میرا خیال ہے تم الحمرا پہنچو اور اس کی لابی میں میرا انتظار کرو۔ میں ایک گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔"

"کیا تمہارا قیام الحمرا میں ہے...... میرا مطلب ہے کہ کیا وہاں تمہارے پاس کوئی کمرہ ہے؟"

"نہیں، میں دوسرے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں لیکن وہاں جانا نہیں چاہتا۔ اصل میں الحمرا کے بارے میں، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ ہوٹل میرے ہوٹل سے کچھ فاصلے پر ہے۔"

"ٹھیک ہے......" اس نے کہا، پھر کاؤنٹر پر ادائیگی کرنے کے بعد ہم دونوں دروازے سے باہر نکل آئے۔ امینہ نے رخ تبدیل کر لیا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی دور نکل گئی۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا سگریٹ سلگانے لگا۔ جب امینہ اتنی دور نکل گئی کہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک بک اسٹال کھل گیا تھا اور اس پر سیل شروع ہو گئی تھی۔ میں اس کے سامنے رک کر رسالوں کے نام پڑھنے لگا اور پھر میں نے ایک انگلش میگزین ہاتھ میں اٹھا لیا اور بک اسٹال والے کو سکہ دے کر میگزین کی ورق گردانی کرنے لگا۔ میری نگاہیں دور دور تک امینہ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر کچھ

لمحوں کے بعد میں نے اسے ایک ٹیکسی میں اسی طرف آتے دیکھا۔ الحمرا جانے کے لئے اسے ادھر سے گزرنا تھا۔ وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر برقع میں لپٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ جب وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے ایک گہری سانس لی۔ اب تک کہ ہنگامہ آرائی بڑی سنسنی خیز تھی۔ آخر کار مجھے اس محل سے نکلنا نصیب ہو ہی گیا تھا۔

آہستہ آہستہ دھوپ چڑھتی جا رہی تھی اور قرب و جوار کی دکانیں بھی کھل گئی تھیں۔ سڑک پر لوگ چل پھر رہے تھے، ٹیکسیاں وغیرہ بھی آ جا رہی تھیں۔ لیکن میں پیدل ہی چلتا رہا۔ کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ فاصلہ طے کر لیا جائے اس کے بعد جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ چنانچہ میں چلتا رہا۔ اندازے کی بنا پر میں الحمرا ہی کی جانب جا رہا تھا۔ حالانکہ یہاں سے خاصا فاصلہ تھا الحمرا کا لیکن مجھے بھی جلدی نہیں تھی۔ ذرا اپنے آپ کو مطمئن بھی کرنا چاہتا تھا اور صورتحال سے واقفیت بھی چاہتا تھا۔

تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک انٹرسیکشن آ گیا تو میں بائیں جانب گھوم گیا۔ اس سڑک پر ٹریفک بہت کم تھا۔ اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ پیدل تو کوئی بھی نہیں نظر آ رہا تھا۔ عمارتوں میں بڑی شان پائی جاتی تھی اور یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہاں خوشحال اور بڑی حیثیت والے لوگ رہتے ہیں۔

بہرحال میں چلتا رہا۔ یہ حماقت نہیں تھی بلکہ میں اپنے طور پر سوچنا بھی چاہتا تھا اور اس وقت میری سوچیں بڑی مختلف نوعیت کی تھیں۔ نجانے کیوں مجھے بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ گزرے ہوئے لمحات میں اس عورت نے جس کا نام اینہ تھا مجھے کس طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اصل میں اس کی پہلی جھلک ہی میرے ہوش و حواس پر بجلی گرانے کا باعث بن گئی تھی۔ وہ اس قدر دلکش اور حسین تھی اور اس نے بالکل بے خیالی کے انداز میں جس طرح اپنے مرمریں وجود کو نمایاں کیا تھا اس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ میں ایک بار پھر وردان سادھانی کا وردان بھول گیا تھا اور پھر اسی کیفیت میں گرفتار ہو گیا تھا جس کیفیت نے مجھے دربدر کیا تھا۔

اس وقت اچانک ہی مجھے یہ ساری باتیں یاد آ گئی تھیں۔ میرے ذہن میں ایک بھٹکا بھٹکا سا خیال بھی تھا۔ ایک ایسے خیال کا وجود میری آنکھوں میں ترتیب پا رہا تھا جو میرے لئے بڑا اجنبی تھا۔ ایک اجنبی، سلگتا ہوا سا گداز چہرہ...... یہ کون ہے؟ میں حیران نگاہوں سے اپنے خیالوں میں اتر آنے والے اس چہرے کو دیکھنے لگا اور دفعتہً ہی میرے سارے

وجود میں ایک چھناکا سا ہوا۔ یہ چہرہ اس وقت مجھے کیوں یاد آیا ہے...... یہ چہرہ، یہ آنکھیں، یہ انداز جیسے وہ مجھے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہوں۔ آپ بھی اس کردار کو نہ بھولے ہوں گے۔ یہ کلاڈیا تھی، کرنل صغیر کی بیٹی۔ وہ عجیب و غریب کردار جو غیر ملکی ہونے کے باوجود ایک عجیب و غریب اور پراسرار کردار تھا۔ میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا اور میں نے رک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے میرے پورے بدن میں لرزش طاری ہو گئی تھی۔ کلاڈیا کا اس وقت میرے ذہن میں آنا یوں لگتا تھا جیسے کسی خاص مقصد کے تحت ہو۔ اصل میں بات وہی تھی، وردان سادھانی نے مجھے پاکیزگی کا درس دیا تھا اور اشبھ بھاوناؤں سے بچنے کے لئے کہا تھا۔ لیکن اینہ کا وجود ایک مکمل بھاونا بن گیا تھا اور یہ اشبھ بھاونا میرے سارے وجود کو لرزائے ہوئے تھی۔ بے شک وہ اس وقت میرے لئے انتہائی اہمیت اختیار کر گئی تھی کیونکہ وہ تختی اس کے پاس موجود تھی جو نجانے آگے چل کر مجھ پر کتنے رازوں کے دروازے کھولنے والی تھی۔ اور اب وہ میرے لئے اس لحاظ سے اور زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھی۔

میں یہی سوچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنے قریب سے ایک گاڑی گزرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور پھر اتنی زور کے بریک چرچرائے کہ میں اچھل پڑا۔ میرے اعصاب کچھ دیر کے لئے کشیدہ ہو گئے تھے اور میں حیرت سے اس گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ پھر گاڑی رُک گئی۔ بائیں طرف کا دروازہ کھلا اور دو آدمی اتر کر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر میں لرز گیا تھا...... میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا......!

※☆※

زندگی کب تک مجھ سے آنکھ مچولی کھیلتی رہے گی...... کب تک یہ حالات میرے وجود پر سواری کرتے رہیں گے۔ ایک انوکھا تصور، ایک انوکھا احساس ہوا تھا۔ گاڑی پر سے اترنے والے دو آدمیوں میں سے ایک ہشمان ذکری تھا اور وہ میری ہی جانب دیکھ رہا تھا۔ کیا عجیب بات ہے۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس وقت میں کھلی سڑک پر تھا، اس کے محل میں نہیں تھا جہاں میں اس کی پوری فوج کو، چیتوں کو اور نجانے کسے کسے چکمہ دے کر باہر نکل آیا تھا۔ میں نے پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پستول کا دستہ ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اب وقت اور حالات کا تقاضا یہی تھا کہ میں خوف کو دل سے نکال دوں۔ اور سچ بات یہ ہے کہ میرے اندر سے خوف نکل گیا تھا۔ میں حیرت کا اظہار کئے بغیر اسی طرح آگے بڑھتا رہا۔ ہمارے درمیان فاصلے کم ہوتے جا رہے تھے۔ اور پھر جب میں قریب پہنچا تو ہشمان ذکری نے داہنا ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔

”خاقان جمشیدی! رک جاؤ۔ بے فکر رہو، اس وقت میری ذات سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

میں رک کر اسے دیکھنے لگا۔ میرے چہرے پر اس وقت مکمل بے خوفی آ گئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تم کمال کی شخصیت ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے تم جیسے شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اور اب میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔ تم جیسے دلیر اور شاندار انسان بہت کم نظر آتے ہیں اور ایسے لوگوں سے دشمنی کی بجائے دوستی فائدہ مند رہتی ہے۔ جو کچھ ہوا ہے، جو کچھ تم کر کے آئے ہو میں بھی اسے بھول جاتا ہوں اور تم بھی اسے بھول جاؤ۔“

میرے ہونٹوں پر ایک بے خوف مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے ہشمان ذکری! میں بھی دوستیاں پسند کرتا ہوں۔“

”تمہاری ذہانت اور دلیری نے میرے دل میں تمہارے لئے ایک بہت بڑا گھر بنا لیا

ہے اور میں بغیر کسی تمہید کے تم سے ایک بات کہوں کہ جو کچھ تم میرے اس محل سے حاصل کر کے لائے ہو میرے تعاون کے بغیر تم اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس لئے اب تم میری دوستی قبول کرو۔ آؤ، ہم الحمرا میں چل کر معاملہ طے کر لیتے ہیں۔“

الحمرا کے نام پر میں نے ذرا سرسراتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ اصل میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ الحمرا کا نام اس نے ایسے ہی لے دیا ہے یا پھر اس کے پیچھے کوئی راز ہے؟ بہرحال سوچ کر اس شبے کا زیادہ موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے بے خوفی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے ہشمان ذکری! میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر بات کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن تمہاری پسندیدہ جگہ پر نہیں۔ وہ دیکھو تھوڑے فاصلے پر ایک اور ریستوران نظر آ رہا ہے۔ غالباً اس کا نام نخلستان ہے۔ دور ہی سے مجھے اس کے سائن نظر آ رہے ہیں۔ کیوں نہ ہم نخلستان میں چل کر بیٹھیں۔“

ہشمان ذکری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔ ”واقعی! بہت چالاک ہو تم۔ غالباً تم نے سوچا کہ میں نے تمہیں الحمرا کی پیشکش کیوں کی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہاں تمہارے لئے خطرات موجود ہوں۔ ایسی بات نہیں میرے دوست! لیکن پھر بھی تم نخلستان چلو، تمہاری مرضی ہے۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کار کو پیچھے لانے کے لئے کہا۔ لیکن یہاں بھی میں نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں میری جان! تم نخلستان پہنچو، میں وہیں آ رہا ہوں۔“

ہشمان ذکری کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے جھنجلاہٹ کے آثار نظر آئے۔ لیکن جھنجلایا تو اس پر جاتا ہے جس پر اختیار حاصل ہو۔ آخر کار اس کے چہرے پر بے بسی پھیل گئی اور اس نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ”ٹھیک ہے، تمہاری مرضی ہے۔ ویسے میں تمہیں ایک بات بتا دوں کہ تمہیں مجھ سے زیادہ کھلے دل والا دشمن دنیا میں نہیں ملے گا۔“

”میں نے تمہیں دشمن کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔ تم چلو، میں آ رہا ہوں۔“

وہ برا سا منہ بنا کر اپنی کار میں جا بیٹھا اور کار آگے بڑھ گئی۔ اس نے کئی بار پیچھے پلٹ پلٹ کر مجھے آتے ہوئے دیکھا تھا۔

نخلستان سڑک کے مخالف سمت میں تھوڑے فاصلے پر تھا۔ اس کے عقب میں کچھ فاصلے پر الحمرا بھی تھا۔ لیکن بہرحال میں نے الحمرا جانے سے گریز کیا تھا کیونکہ خود میرے

ذہن میں چور تھا۔ بہرحال میں الحمرا جا کر ایمنہ کے لئے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

کچھ دیر کے بعد میں نخلستان پہنچ گیا۔ ہشمان ذکری دروازے میں داخل ہونے سے پہلے گاڑی سے اتر کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ روشوں کے درمیان گھاس کے قطعات پر جگہ جگہ میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن میں سے اکثر پر مرد اور عورتیں ساتھ ساتھ بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ ذکری اس وقت اکیلا ہی تھا اور وہ مجھے ساتھ لئے ہوئے پورچ میں داخل ہوا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہی آگے بڑھ کر دو ویٹروں نے استقبال کیا۔ دروازے سے کیفے ہال پہنچے تو منیجر نے آقاء ذکری کہہ کر اس سے مصافحہ کیا۔ وہ دوستوں کی طرح میری کمر پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھتا چلا گیا اور ایک کشادہ بوتھ میں داخل ہو گیا۔ میں اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے بیٹھتے ہی ویٹر کو ناشتہ اور کافی لانے کا آرڈر دیا اور پردہ کھینچ کر میری طرف مخاطب ہوا۔

''ہاں ڈیئر خاقان! کمال کی شخصیت ہے تمہاری۔ لمحوں کے اندر اندر میرے پانچ آدمیوں کو ہلاک کر دیا تم نے۔ میری پستول، میری محبوبہ اور سب سے بڑی چیز یہ کہ وہ لوح تمہارے قبضے میں ہے۔ کمال ہے، ایک اجنبی اسکندریہ میں آ کر اگر ہشمان ذکری کے خلاف یہ سب کچھ کر سکتا ہے تو پھر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ تنہا نہیں بلکہ ایک پوری فوج ہے۔ میں تمہیں اس شاندار کارکردگی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔''

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''میرا خیال ہے تم جن چیزوں کی فہرست مجھے بتا رہے ہو ان میں کچھ زیادتی سے کام لے رہے ہو۔ تمہارا پستول اور وہ تختی میرے قبضے میں ہے، تمہارے آدمیوں کو بھی میں نے ہی مارا ہے لیکن تم جس محبوبہ کی بات کر رہے ہو وہ کون ہے اور کہاں ہے اس کے بارے میں اگر تم خود مجھے بتا دو تو تمہاری مہربانی ہو گی۔''

''کیا مطلب؟ کیا تم سچ بول رہے ہو؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''میں نے کہا نا جو حاصل کیا ہے میں نے، مجھے اس کے بارے میں علم ہے۔ باقی کے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔''

''ٹھیک ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔''

''ویسے میں تمہارے ساتھ کچھ ڈیل کرنا چاہتا ہوں۔''

''ڈیل؟''

''ہاں۔''

''تفصیل؟''

''جلدی کیا ہے۔ کھاؤ پیو۔ کیا خیال ہے۔'' اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر میز پر رکھ دیا پھر بولا۔ ''یہ بھی تمہارے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ویسے اگر میں جرائم کی دنیا میں قدم رکھ دوں مائی ڈیئر ہشمان ذکری! تو یقین کرو تمہارا سب کچھ میرا ہے۔''

وہ تحقیر آمیز انداز میں ہنس پڑا، پھر بولا۔ ''چلو ٹھیک ہے، میں تمہاری خوش فہمی دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس وقت تک جب تک تمہاری طرف سے مایوس نہ ہو جاؤں۔''

''تو پھر تم مایوس ہو جاؤ۔'' میں نے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، ویٹر ٹرے لئے ہوئے اندر آ گیا۔ اور پھر جب وہ چلا گیا تو بات ادھوری ہی رہ گئی۔ ہشمان ذکری نے کافی پیالیوں میں ڈالی اور ایک پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں......تم کچھ کہہ رہے تھے؟''

''میں صرف یہ کہہ رہا تھا کہ قانون مجھے اس راستے پر چلنے سے روکتا ہے جس پر تم مجھے چلانا چاہتے ہو۔''

''خوب، خوب......'' اس نے کہا اور کافی کے گھونٹ لینے لگا۔ پھر مسکرا کر بولا۔ ''کافی لو......ضرورت سے زیادہ احتیاط اچھی چیز نہیں ہوتی۔''

''جی......'' میں نے کافی کے چند گھونٹ لئے۔ وہ سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔

''میری پہلی پیشکش دو ملین ڈالر ہے، سمجھے۔ دو ملین ڈالر اس تختی کی قیمت۔ یہ رقم تم پہلے ایڈوانس لے سکتے ہو۔ تختی بعد میں دینا۔''

''اور اگر میں سوری کہوں تو؟''

''تو پھر یہ چار ملین ہو جاتے ہیں۔'' وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

''دس ملین بھی نہیں۔''

''ہوں......اس کا مطلب ہے گیارہ ملین۔ ٹھیک ہے یہ......؟''

''میں نے کہا نا اس پر سودا نہیں ہو سکتا۔''

"تو پھر آخری پیشکش۔ جو کچھ ہمیں حاصل ہوتا ہے اس کا آدھا۔ باقی سب کچھ میرے ذمے۔"

"اور کچھ......؟"

"دیکھو...... میں نے اپنی طرف سے ہر تعاون کی پیشکش کی ہے۔ اب باقی اگر تمہاری کوئی شرط ہو تو تم بتا دو۔"

"ہاں۔ یہ ذرا دلچسپ بات ہے۔ مگر اس کے لئے مجھے سوچنے کا موقع دو۔"

"کتنا وقت؟ بولو، چوبیں گھنٹے کافی ہوں گے؟"

"ہاں، تقریباً کل اسی قت اسی ہوٹل کے لان میں۔ صرف ہاں یا نہیں دو لفظوں میں۔"

"مجھے منظور ہے۔" اس نے کہا اور میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ بہر حال میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ پھر اس کے بعد کھانے پینے سے فراغت حاصل کر کے ہم اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ کاؤنٹر کے قریب پہنچے تو منیجر نے پھر اسی انداز میں سلام کیا۔ ہشمان ذکری نے اس سے کچھ کہا اور پھر وہ باہر نکل گیا۔

میں اسے باہر نکلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے بل ادا کرنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو منیجر نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا:

"نہیں جناب، پے منٹ ہو چکا ہے۔ شکریہ۔"

میں شانے ہلا کر باہر نکل آیا۔ باہر میں نے دیکھا کہ ہشمان ذکری اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا ہے۔ پھر جب اس کی گاڑی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں محتاط انداز میں سڑک عبور کرنے لگا۔ میرا ذہن بدستور الجھنوں میں الجھا ہوا تھا اور میں گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

☼☆☼

اس کے بعد کے واقعات پڑھنے
کے لئے جلد دوئم کا مطالعہ کریں